DUE DATE

Cl. No. ______ Acc. No. 124822

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

آجکل

مولانا آزاد نمبر

نومبر ۱۹۸۸





مولانا آزاد ماہ و سال کے آئینے میں

اردو کا مقبولِ عام
مصور ماہ نامہ

آج کل نئی دہلی

ایڈیٹر: راج نرائن راز
سب ایڈیٹر: خورشید اکرم
جلد: ۴۷ شمارہ: ۴
قیمت: چھ روپے
فون: ۳۸۷۰۶۹
کارتک۔ اگرہائن شک سمت ۱۹۱۰
سرورق: ضیا فیضی

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر: آج کل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اندرونِ ملک زرِ سالانہ: بیس روپے
دو سال کے لیے: چھتیس روپے
تین سال کے لیے: اڑتالیس روپے

ترتیب

چار دہوں کے دوران صنعتی ترقی

تحریکِ آزادی کے رہنماؤں نے شروع ہی سے ملک میں اقتصادی تبدیلی لانے کا تہیہ کر رکھا تھا جس کے لیے تیز رفتار صنعتی ترقی ایک اہم جزو تھی کیوں کہ بہت سی بنیادی اشیائے ضروری میں ملک کو خود کفیل بنانا تھا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی کے بعد جدید بھارت کے معماروں اور پھر بعد میں منصوبہ سازوں نے فولاد، کان کنی، مشینیں سازی اور انجینیئرنگ جیسی بنیادی صنعتوں کی ترقی و فروغ پر زیادہ زور دیا۔ منصوبہ بند اقتصادی ترقی کے ابتدائی برسوں میں صنعتوں کی ترقی پر زیادہ زور دیا گیا۔

صنعت کے مقابلے میں زراعت کو کم اہمیت دیے جانے کا الزام ان لوگوں نے لگایا تھا جو اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ پانچ لاکھ گاؤں کی ترقی صنعت کاری پر زیادہ زور دے کر ممکن نہیں۔ یہ الزام غیر ممالک میں رہنے والے ان لوگوں نے بھی لگایا جا سکتا جو اس کمزور خیال سے چھٹکارا نہیں پا سکے کہ اس ملک کو بنیادی طور پر زرعی ملک بنا رہنا چاہیے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زراعت اور صنعت کے درمیان صحیح توازن پر زور دیا گیا۔ خود زراعت کو صنعتی ترقی سے فائدہ پہنچا۔ مثال کے طور پر کیمیاوی کھاد کو ہی لیجیے۔ دیگر ایسی صنعتوں کا قیام بھی کیا، جن سے زراعت کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ کھیتی باڑی کے شعبے میں کی گئی ترقی اور "سبز انقلاب" کی آمد کی وجہ سے مشینوں اور ساز و سامان کی مانگ بڑھ گئی جس کی سپلائی صرف جدید صنعت ہی کر سکتی تھی۔ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں صنعتی پالیسی کی تاریخی قرارداد اپنائی گئی۔ صنعت کاری کی ترقی و فروغ کی خاطر اس پر تب ہی سے عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔

اس کی وجہ سے گزشتہ تین دہوں کے دوران بھارت ایک بڑی صنعتی طاقت بن گیا ہے اور اپنی مجموعی صنعتی پیداوار کے سبب دنیا کے پہلے دس ملکوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ صنعتوں کی توسیع کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جدید ٹکنالوجی سے واقف افرادی قوت کا ایک بڑا ذخیرہ تیار کیا گیا اور اس شعبے میں بھارت کا شمار اب دنیا کی دو عظیم طاقتوں کے بعد تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔

گزشتہ تین برسوں سے بھارت میں صنعتی پیداوار کی شرح اضافہ ۸ فی صد یا اس سے تھوڑا زیادہ ہی ہے۔ اس کی وجہ سے کم کم بارشوں کے باعث ہوئی زراعت کی شرح ترقی میں کمی کی تلافی ہوئی ہے اور اقتصادی ترقی کی مجموعی شرح یقینی طور سے پانچ فی صد سے تھوڑی زیادہ ہو گئی ہے۔ وسیع پیمانے پر مختلف قسم کی صنعتیں قائم کی جا چکی ہیں۔ نیز بنیادی اور بڑے ساز و سامان کی صنعتوں میں کافی حد تک خود کفالت حاصل کر لی گئی ہے۔

کوئی بھی ملک دوسرے ملک پر انحصار سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی خام تیل اور دیگر اجزا کا درآمد کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی مصنوعات کی مانگ ان کی صلاحیت اور پیداوار کے مقابلے میں کافی بڑھ رہی ہے۔ اور کچھ معاملات میں مانگوں میں زبردست اضافے کی وجہ سے خود کفالت حاصل کرنے کا نشانہ پیچھے رہ جاتا ہے جیسا کہ کیمیاوی کھاد کے معاملے میں ہوا ہے۔ تاہم کم و بیش ایک ایسا مرحلہ آ چکا ہے جہاں گھریلو صنعت لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے علاوہ مزید صنعتی ترقی کے لیے بنیادی ضرورتوں کو بھی پوری کر سکتی ہے۔

یہ بات کافی دلچسپ ہے کہ اس عمل میں کچھ دیگر فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ ہنرمند افرادی قوت کا ایک ذخیرہ تیار ہو گیا ہے اور اس میں ابھی مزید اضافہ جاری ہے۔ اس طرح صنعت کاری کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اور صنعت کی منصوبہ بند ترقی کے برسوں میں صنعت کے ماہرین اور ہونہار و لائق انجینیئروں کی ایک نئی نسل تیار ہوئی ہے۔ بھارت کے صنعت کاروں نے عمارتوں، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر نیز دیگر پراجیکٹوں کے لیے دنیا بھر سے ٹھیکے حاصل کیے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اہم ٹھیکے یورپ کی ترقی یافتہ ممالک یا ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان سے سخت مقابلے میں حاصل کیے گئے ہیں۔

منصوبہ سازوں نے شروع سے ہی صنعتی ترقی کو نہ صرف ملک کو آگے لے جانے، روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے اور اس کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک آلہ کار سمجھا گیا بلکہ اس کو کچھ سماجی اقتصادی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی سمجھا گیا۔

ان مقاصد میں یہ امور شامل ہیں: صنعتوں کو علاقائی سطح پر پھیلانا تا پسماندہ علاقوں کی اقتصادی ترقی میں مدد کرنا، میٹروپولیٹن شہروں اور بڑے قصبوں پر دباؤ کو کم کرنا، گاؤوں میں گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینا، بڑی صنعتوں میں اجارہ داری کے رجحان کو روکنا اور اقتصادی طاقت کو چند ہاتھوں میں سمٹ آنے سے روکنا۔

اس زمانے میں جب کہ منصوبہ بندی نہیں کی جاتی تھی، صنعتی ترقی عام طور سے صرف ساحلی اور میٹروپولیٹن شہروں تک ہی محدود تھی۔ اب پہلی بار فولاد کے کارخانے وسطی بھارت میں مدھیہ پردیش میں بھیلائی، مشرقی بھارت میں اڑیسہ (راؤرکیلا)، جنوبی بھارت میں کرناٹک کے اندر [illegible] نیز وسطی بھارت میں [illegible] جیسے مقامات پر قائم کیے گئے ہیں۔ حالانکہ بھیلائی اور راؤرکیلا کے قرب و جوار میں ہی کوئلہ اور خام لوہا موجود تھا لیکن سیکڑوں کلومیٹر کے رقبے میں صنعتی ترقی کی کوئی نشان تک موجود نہیں ہے۔ یہ پروجیکٹ سرکاری سیکٹر کے تحت قائم کیے گئے ہیں لیکن بہت سی دیگر صنعتیں نجی ملکیت میں قائم ہوئی ہیں۔ جس کے لیے صنعتوں کی ترقی و فروغ کی پالیسی لائق تحسین ہے۔ کیوں کہ اس پالیسی کے تحت نئے صنعت کاروں کو ایسے علاقوں میں صنعتیں لگانے کے لیے ترغیبات دی جا رہی ہیں — جہاں پہلے کوئی صنعت قائم نہیں ہے۔

بھارت چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں اپنی کامیابیوں پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ملک کی تقریباً آدھی صنعتی پیداوار اب چھوٹے اور غیر مرکزی شعبے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس شعبے کی ترقی، اقتصادی ترغیبات، [illegible] قرضے، ریاستوں کے ذریعے ان کی مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دینے نیز چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی سروس کے اداروں اور صنعتوں کے ضلعی مرکزوں کے ذریعے مختلف قسم کی سہولیات بہم پہنچانے کے ایک ملک گیر نظام کی پالیسی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے۔

ان چھوٹی صنعتوں کی تعداد اب تقریباً ۱۴ لاکھ ہے اور یہ تقریباً ایک کروڑ لوگوں کو روزگار مہیا کرتی ہیں۔ ان صنعتوں کی سالانہ پیداوار کی کل مالیت ۶۱،۱۰،۰۰۰ لاکھ روپے سے زائد ہے اور ان کی برآمدات ملک کی کل برآمدات کا تقریباً ۲۲٫۵ فی صد ہے (مذکورہ اعداد و شمار مارچ ۱۹۸۸ء تک کے ہیں)۔

تقریباً ۸۷۳ مصنوعات کی تیاری کا کام چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے مخصوص ہے — ان کارخانوں کو ایکسائز محصول میں رعایت دی جاتی ہے تاکہ وہ بھی مقابلے میں شریک ہو سکیں۔ ۱۵ لاکھ روپے تک کی مالیت کے کاروبار کی یہ صنعتیں اس ٹیکس سے مکمل طور سے مستثنیٰ ہیں اور ۷۵ لاکھ روپے کی مالیت تک کے کاروبار کے لیے انہیں رعایتیں دی جاتی ہیں۔ چھوٹے کاروبار کو بینکنگ کے ریاستی اداروں سے قرض کی فراہمی میں ترجیح دی جاتی ہے۔

منصوبہ بندی کے ابتدائی دور سے ہی اور خاص طور پر صنعتی پالیسی کی قرارداد کے تحت سرکاری دائرۂ کار کے شعبے کو صنعتی ترقی میں ایک اعلیٰ مقام دیا گیا ہے۔ اس لیے برطانوی حکومت سے ملک کو جو ریلوے نظام ملا تھا، اسے سرکاری شعبے کے تحت پہلے ہی سے شامل کر لیا گیا تھا کیوں کہ لندن کی کمپنیوں نے، جنہوں نے اس نظام کو دلی سرکار کی پوری پوری مدد سے قائم کیا تھا، اسے زیادہ منافع بخش نہیں پایا تھا اور نوآبادیاتی انتظامیہ کو اس ریلوے نظام کو قومیائے جانے پر مجبور کیا تھا۔ مگر اب بھارتیہ ریلوے کو جدید ترین بنایا جا چکا ہے۔ اور یہ ملک میں سرکاری دائرۂ کار کے شعبہ کا سب سے بڑا حصہ بن گیا ہے۔ اسی طرح بجلی، کوئلہ اور تیل بھی سرکاری کمپنیوں یا قانونی اداروں کی ملکیت میں ہیں جو بڑے نجی ملکیت والی صنعتوں کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ فولاد کی تیاری اور کان کنی کے اہم شعبوں کو سرکاری دائرۂ کار کے شعبے کے تحت ترقی و فروغ دیا گیا ہے۔

اگرچہ فولاد کا کارخانہ جمشید جی ٹاٹا نے قائم کیا تھا اور ان کے جانشینوں نے اسے وسعت دی اور جدید بنایا، ابھی تک نجی صنعت ہی ہے۔ یہ ضابطہ پرستی کے کچھ اشارے ہیں جو صنعت میں سرکاری دائرۂ کار کے شعبے کی تعمیر میں کارفرما ہیں۔ کیمیاوی کھاد، ادویہ اور کیمیاوی اشیاء، بڑی بڑی مشینوں کی تیاری، تیل کی صفائی اور اس کی فروخت، پیٹرو کیمیکلز کی صنعتیں، سرکاری دائرۂ کار کے شعبے کی کچھ صنعتیں ہیں۔ ساتھ ہی بڑھتا ہوا اور ترقی پذیر امداد باہمی کا شعبہ بھی ہے، جس میں چینی، کیمیاوی کھادیں، سوت کی کتائی اور وسیع پیمانے پر بڑھتا ہوا ڈیری کا کاروبار وغیرہ شامل ہیں۔

گزشتہ دو برسوں میں صنعتی ترقی کے سلسلے میں نئے اقدامات کیے گئے ہیں جو حکومت نے عام طور سے صنعتی شعبے کو درپیش کچھ سخت مشکلات کو دور کرنے کے لیے کیے ہیں۔ گزشتہ برسوں میں نظم و نسق کے ایک طریقہ اور قواعد و ضوابط کے ایک ڈھانچہ کار کو فروغ دیا گیا ہے۔ تاکہ بنیادی طور پر صحیح سمت میں ترقی کی جائے اور فنڈ کا استعمال ٹھیک ڈھنگ سے کیا جائے۔ لیکن یہ نظم و نسق اور قواعد و ضوابط ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگے۔ نئے اقدامات کا مقصد طریقوں کو آسان بنانا، پالیسی کو معقول بنانا اور اس کی از سر نو تشکیل کرنا، متعدد صنعتوں کو لائسنس سے مستثنیٰ کرنا، صلاحیت میں اضافہ کرنے اور ٹکنالوجی کی ترقی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔ ٹکنالوجی اور ساز و سامان کی درآمدات پر لگائی گئی پابندیوں میں نرمی کی گئی تاکہ جدید ترین ٹکنالوجی اور ساز و سامان سے ان مقاصد کے حصول میں مدد ملے۔ ان کارخانوں کو جو اپنی صلاحیت کا بہتر استعمال کر رہے تھے، اپنی پیداوار میں اضافہ کرنے کی اجازت دی گئی اور اگر یہ کارخانے نئے نشانے حاصل کر لیتے تھے تو ان کو اپنی پیداوار میں مزید اضافے کی بھی اجازت دی جاتی تھی۔ پیداوار میں اضافے نے اس بات کو یقینی بنا دیا تھا کہ کامیاب یونٹیں پیداوار کے لیے اپنی صلاحیت کو بہتر طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔

اور نئے وسعتوں کے لیے انہیں دی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ساتواں پنجسالہ منصوبہ (اپریل ۱۹۸۵ء سے مارچ ۱۹۹۰ء تک) میں بجا طور پر اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ بھارتی صنعتیں پہلے سے تیار شدہ صلاحیت کو استعمال کریں۔ لاگت کو کم کریں اور معیار کو بہتر بنائیں۔ ان شعبوں کو ترجیح دیے جانے کی غرض سے نشان دہی کی گئی ہے۔ کیوں کہ ان ہی شعبوں سے خامیوں اور ناکامیوں کا پتہ چلتا ہے۔ سماجی انصاف کے ساتھ ترقی اب بھی ہمارا اصل مقصد ہے مگر تیار شدہ صلاحیت کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ پالیسی کے نئے اقدامات جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، ان ہی مقاصد سے متعلق ہیں۔

شرح ترقی کا نشانہ سال بہ سال کے لحاظ سے ۸ فی صد مقرر کیا گیا ہے اور ساتویں منصوبہ کے ابتدائی برسوں میں یہ نشانہ حاصل کیا جا چکا ہے۔ اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ پورے منصوبہ میں یہ شرح ترقی حاصل نہ کی جا سکے۔ ٹکنالوجی کی ترقی اور جدید کاری کو اعلیٰ شرح ترقی اور مجموعی طور پر صنعتی ترقی کے حصول کی جدوجہد میں ایک آلۂ کار سمجھا جاتا ہے۔ نئی ٹکنالوجیوں کی مدد سے زیادہ سے زیادہ صلاحیت کے نشانے کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اعلیٰ ٹکنالوجی پر زور خصوصی طور سے الیکٹرانکس کے شعبے میں دیکھنے میں آیا ہے۔ اس شعبے میں گزشتہ دو برسوں میں شرح ترقی چالیس فی صد رہی ہے ۱۹۸۳-۸۴ء میں بھارت نے ۱۴۸۰۰ لاکھ روپے کی مالیت کا الیکٹرانکس ساز و سامان تیار کیا، جس کی مالیت ۸۶-۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۲۸۸۰۰ لاکھ روپے ہو گئی۔ نتیجتاً بہت سی چیزوں کی قیمتوں میں زبردست کمی آئی۔ کمپیوٹروں کی قیمت میں پچاس فی صد کی کمی آئی اور ٹیلی ویژن سیٹوں کی قیمت میں بھی کچھ کمی واقع ہوئی۔ متعدد اہم صنعتوں مثلاً کوئلہ، تیل، بجلی، کھاد وغیرہ کی صنعتوں میں نئی ٹکنالوجیوں کے استعمال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے الیکٹرانکس کی صنعت پر خصوصی توجہ دی گئی اور اس کے نتائج سب کے سامنے عیاں ہیں

مولانا آزاد نمبر کے باب میں

"آج کل" کا مولانا آزاد نمبر پیشِ خدمت ہے۔ مولانا آزاد صدی برس تقریبات کا آغاز اگست۔ ستمبر ۱۹۸۸ء سے ہوتا ہے کہ اگست۔ ستمبر ۱۸۸۸ء (ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ) میں مولانا کی ولادت ہوئی تھی۔ ساہتیہ اکادمی نے ستمبر ۱۹۸۸ء میں مولانا آزاد پر اعلیٰ پیمانے پر ایک کل ہند سیمینار منعقد کیا تھا۔

سرکاری طور پر مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات کا آغاز نومبر ۱۹۸۸ء میں ہوتا ہے کہ ہمایوں کبیر نے "انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء لکھ دی تھی جو مولانا کے تذکرہ میں خود دیکھے ہوئے ماہ و سالِ ولادت (ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ) کے پیشِ نظر غلط ہے۔

بہر حال "آج کل" کا مولانا آزاد نمبر پیشِ خدمت ہے۔ اس نمبر کا خاکہ مرتب کرتے وقت ہمارے ذہن میں یہ خیال مقدم رہا ہے کہ مولانا آزاد کی سیاسی، قومی، علمی، تعلیمی خدمات کا جائزہ نئے زاویوں سے لیا جائے تاکہ وہ حقائق سامنے آسکیں جو بڑی حد تک آج تک ہماری نظروں سے اوجھل رہے ہیں یا کم کم توجہ میں آئے ہیں۔ آٹھ حصص یا ابواب میں منقسم شمولات کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے پر آپ بخوبی اندازہ کر پائیں گے کہ برصغیر کے تقریباً تمام معروف اور معتبر آزاد شناسوں کی نگارشات اس نمبر کی زینت ہیں۔ یہ مولانا کی حیات و خدمات کے مختلف زاویوں سے احاطہ کرتی ہیں۔ یہ بڑی حد تک مختلف موضوعات ہیں ان کے مطالعے سے آپ اس نتیجے پر بھی پہنچیں گے کہ یہ مقالات مولانا آزاد کی حیات و خدمات "حالات و کوائف" نیز کارناموں کا زیادہ وسیع اور زیادہ جامع تجزیہ پیش کرتے ہیں ان اشخاص اور عوامل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جن سے مولانا نے کسبِ نور کیا۔ مولانا نے اپنی فراست اور ذہانت سے اس نور کو نئی تابش ایک نئی تابانی عطا کی.. اور ملک و قوم کی راہوں کو روشن کیا۔

پہلا حصہ سوانح: سیاسی بصیرت: آپ محسوس فرمائیں گے کہ مولانا کے سوانح اتنی تفصیل اور دیدہ ریزی کے ساتھ شاید اس سے پیشتر ایسے مرتب نہیں ہوئے۔ اس کے لیے جناب عبداللطیف اعظمی کی مساعی مشکور ہے۔ جناب مالک رام، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور جناب جگن ناتھ آزاد بھی وہ محترم ہستیاں ہیں، جنہیں مولانا کا قرب، علمی، افکاری، اخباری سطح پر حاصل تھا۔ مالک رام صاحب کے مختصر اور مدلل مضمون سے مولانا کی تاریخ ولادت کا متنازعہ فیہ مسئلہ حتمی طور پر حل ہو جاتا ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ شخصیت کے باب میں جناب احمد سعید ملیح آبادی اور جناب جگن ناتھ آزاد کے مضامین ذاتی تاثرات اور مشاہدات پر مبنی ہیں اور یہ فی الواقع انہیں کا حصہ ہیں۔

ہمارے کرم فرماؤں میں مفتی محمد رضا انصاری، پروفیسر خلیق احمد نظامی اور سید احتشام احمد ندوی کے مقالات ادبی حلقوں میں ایک دستاویز (لطیف الشرکے) باعث بہت دیر تک موضوعِ گفتگو بنے رہیں گے۔ مولانا کے باب میں سر سید اور جمال الدین افغانی جیسی عہد آفریں ہستیوں کا ذکر اس سے پیشتر آ چکا ہے۔ تاہم ان ہستیوں کے تعلق سے ایسی جامع مساعی اس سے پیشتر بروئے کار نہیں آئیں۔ جناب محمد رضا انصاری کا مقالہ تحریکِ خلافت میں مولانا آزاد کا حصہ بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ اور خاصے کی چیز ہے۔

مولانا کی تصانیف "ترجمان القرآن" اور تذکرہ، تعارف اور تجزیہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق اور کشمیر یونیورسٹی ہی کے پروفیسر ریاض الرحمن شروانی کے فکر و قلم کے مرہونِ منت ہیں۔

نئی قومی تعلیمی پالیسی کے تناظر میں مولانا کے تعلیمی نظریات کا تجزیہ و جائزہ نوعیت کے اعتبار سے اولین اور جامع کوشش ہے۔ پروفیسر عبداللہ ولی بخش قادری کا یہ مقالہ بھی زیادہ

مالک رام

مولانا آزاد کی تاریخِ ولادت

بظاہر مولانا آزاد کی تاریخ ملاقات سے متعلق کوئی اختلاف یا الجھن نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ یہ انھوں نے خود لکھ دی تھی۔ لیکن خدا بھلا کرے ہمایوں کبیر کا کہ انھوں نے اس کا موقع پیدا کر دیا۔

ہوا یہ کہ مولانا آزاد کی زندگی کے آخری دور میں ہمایوں کبیر نے ان سے اپنی سوانح عمری لکھنے کی بہت درخواست کی۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، مرحوم اپنے بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ ہمایوں کبیر کی درخواست پر بھی انھوں نے انکار کر دیا۔ لیکن انھوں نے مولانا آزاد کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ ملک کی آزادی (۱۹۴۷ء) سے پہلے کے دس بارہ برس کے واقعات کو قلم بند کرا دیں کیونکہ یہ ملک کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے انگریزی حکومت سے گفت و شنید میں کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے سرگرم حصہ لیا تھا۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ مستقبل کے مؤرخ کو معلوم ہو کہ ان ایام میں کیا ہوا اور تحریکِ آزادی کن مراحل سے گزر کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچی۔ اس پر مولانا نے رضامندی کا اظہار کیا اور ہمایوں کبیر نے ان سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کتاب "انڈیا ونس فریڈم" مرتب کی۔

بدقسمتی سے کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا کا انتقال ہو گیا۔ کتاب کہیں جنوری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس پر ہمایوں کبیر نے جو پیش لفظ لکھا، اس میں کہا[1]:

"مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر ۱۹۵۸ء میں، ان کے ۷۰ویں یومِ ولادت کے موقع پر شائع ہو۔ تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ اب کتاب شائع ہو گی تو وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہوں گے۔"

اس عبارت نے مولانا آزاد کی ولادت کو ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا دیا۔ ایک تو تحریر انگریزی میں اور اس پر لکھی ہوئی ہمایوں کبیر کی۔ ہمارے سرکاری حلقوں نے تحقیق کیے بغیر اس پر اعتماد کر لیا۔ خدا معلوم بعد کو کس نے اور کس شہ پر مہینہ نومبر پر تاریخ گیارہ کا اضافہ کر کے اسے ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء بنا دیا اور یوں ۱۱ نومبر ۱۸۸۸ء مولانا آزاد کی تاریخِ ولادت تسلیم کر لی گئی۔ یہ تاریخ غلط ہے۔

مولانا آزاد نے خود سب سے پہلے اپنے مختصر حالات "تذکرہ" میں لکھے تھے۔ اس میں اپنی پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ غریب الدیار عہد و نا آشنائے عصر و بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیِ عدم سے اس عدمِ ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمتِ حیات سے متہم ..... والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا اور مصرعِ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:

جواں بخت و جواں طالع، جواں باد"[2]

اس سے معلوم ہوا کہ ولادت،

۱۔ ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔

۲۔ ہجری تاریخ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ تھی۔

۳۔ تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا گیا تھا اور بطریقِ عمل پیدائش کی تاریخ تھی، جواں بخت و جواں طالع، جواں باد۔

۱۸۸۸ء کا اعادہ انھوں نے ہمایوں کبیر کی اسی انگریزی کتاب کے پہلے باب میں بھی کیا ہے[3] جس میں مختصراً اپنے ابتدائی حالات درج کیے ہیں۔ لیکن زیادہ تفصیل ہجری تاریخ میں ملتی ہے، جہاں ساتھ مہینہ بھی دیا ہے (ذی الحجہ)۔ وہ ہجری میں تاریخِ ولادت لکھنے پر مجبور تھے، کیونکہ دراصل یہی انہیں بتائی گئی ہو گی۔ وہ مکہ میں پیدا ہوئے، جہاں کی پوری معاشرت اسلامی تھی۔ ان

سی-۵۰۴، ڈیفنس کالونی، نئی دہلی ۲۴ .. ۱۱

۱۔ انڈیا ونس فریڈم (انگریزی)، ص ۷ (پیش لفظ)

۲۔ "تذکرہ" (ساہتیہ اکیڈمی ایڈیشن) ص ۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲

۳۔ "انڈیا ونس فریڈم" ص ۲ (متن)

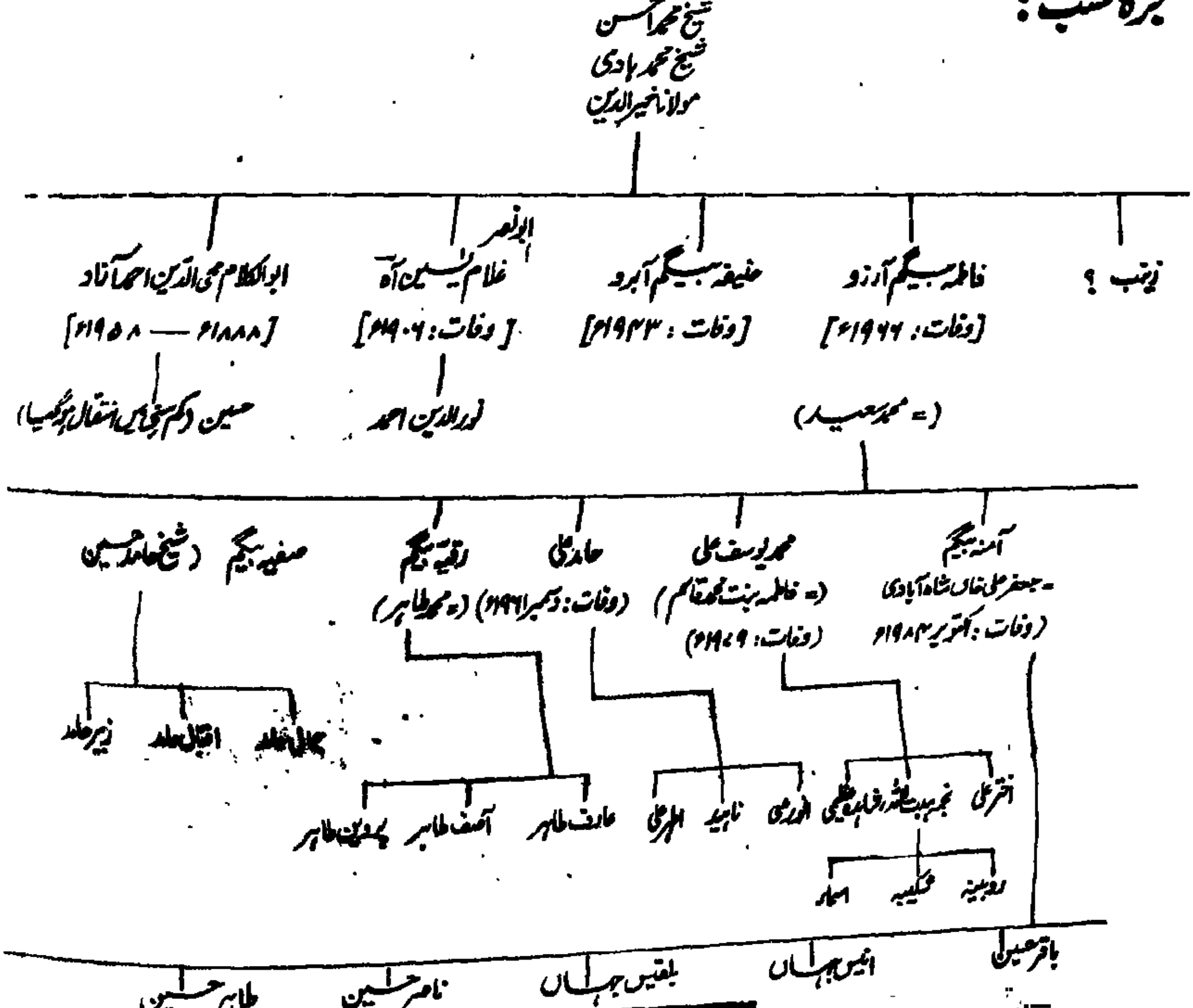
(باقی)

عبداللطیف اعظمی

سوانح مولانا ابوالکلام آزاد
سیاسی سرگرمیوں کی روشنی میں



شجرۂ نسب :



خاندانی حالات:

مولانا آزاد نے اپنے خاندان کے بارے میں "انڈیا ونس فریڈم" میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ خود ان ہی کے الفاظ میں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

"میرے آباؤ اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے انہوں نے آگرہ کو اپنا مسکن بنایا، بعد میں دہلی منتقل ہو گئے۔ وہ علمی ذوق رکھنے والے لوگ تھے۔ اکبر کے زمانے میں مولانا جمال الدین نے اپنے علم کی بدولت شہرت پائی پھر اس خاندان کے لوگ دنیا کی طرف جھک گئے۔ اور کئی ایک نے بڑے بڑے سرکاری عہدے حاصل کیے۔ شاہجہاں کے زمانے میں محمد ہادی آگرہ کے قلعہ دار مقرر ہوئے۔

مولانا منور الدین میرے والد کے نانا تھے۔ میرے دادا کا جب انتقال ہوا تو میرے والد مولانا خیر الدین بچے تھے۔ اس لیے ان کے نانا نے ان کی پرورش کی۔ غدر سے دو سال پہلے مولانا منور الدین نے ہندوستان کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، مگر سکندر جہاں بیگم[1] نے بھوپال میں انہیں روک لیا اور وہ بھوپال ہی میں تھے جب غدر شروع ہو گیا۔ دو سال تک وہ وہاں سے نکل نہ سکے۔ پھر بمبئی پہنچے۔ یہاں انہیں موت نے آگھیرا۔ اور مکہ معظمہ جانا انہیں نصیب نہ ہوا۔

اس وقت میرے والد قریب پچیس سال کے تھے۔ وہ مکہ معظمہ گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے اپنے لیے مکان بنایا اور شیخ محمد ظاہر وتری کی بھانجی[2] سے عقد کر لیا۔ وہ کئی بار بمبئی اور ایک بار کلکتہ آئے اور دونوں جگہ بہت سے لوگ ان کے مداح اور مرید ہو گئے۔

میں مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا[3]۔ دو سال بعد میرے والد پورے خاندان کو لے کر کلکتہ آئے۔ کچھ عرصہ پہلے جدّہ میں وہ گر گئے تھے، جس سے اُن کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ہڈی بٹھا تو دی گئی مگر وہ اچھی طرح سے نہیں بیٹھی تھی۔ اور لوگوں نے مشورہ دیا تھا کہ کلکتہ کے سرجن اسے ٹھیک کر دیں گے۔ ان کا ارادہ تھا صرف چند دن قیام کریں گے، مگر ان کے مریدوں اور مداحوں نے انہیں جانے نہیں دیا۔ ہمارے کلکتہ آنے کے ایک سال بعد میری والدہ نے وفات پائی۔ اور انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

اہم تاریخیں اور سیاسی سرگرمیاں:

۱۸۳۱ء: مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین کی دہلی میں پیدائش۔

۱۸۵۷ء: (تقریباً) مکہ معظمہ کو ہجرت۔

۱۸۶۶ء: " مکہ معظمہ کے ایک معزز خاندان میں مولانا خیر الدین کی شادی۔

۱۸۸۸ء: (ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ) مولانا آزاد کی اگست/ستمبر میں مکہ معظمہ میں پیدائش۔

۱۸۹۳ء: حرم شریف میں بسم اللہ کی تقریب۔

۱۸۹۰ء: پورے خاندان کی مکہ معظمہ سے ہندوستان کو واپسی اور کلکتہ میں سکونت۔

۱۸۹۹ء: مولانا کی والدہ کا کلکتہ میں انتقال۔

۱۸۹۷ء: مولانا کی تعلیم کا آغاز۔

۱۸۹۸ء: شعر و شاعری کی ابتدا۔

۱۸۹۹ء: گلدستہ "نیرنگِ عالم" کا اجرا۔

۱۹۰۰ء: (اواخر) "المصباح" کی ادارت۔

۱۹۰۲ء: (اوائل) تعلیم کی تکمیل اور مشق کے طور پر درس و تدریس کا آغاز۔

" : (اواخر) بمبئی کا سفر۔

۱۹۰۳ء: (اوائل) "احسن الاخبار" کے ادارۂ تحریر میں شرکت۔

" : ایک گلدستہ "خدنگ نظر" (لکھنؤ) کے حصۂ نثر کی ادارت۔

" : کلکتہ کے ایک معزز خاندان میں زلیخا بیگم سے مولانا کا عقد۔

۱۹۰۴ء: یکم تا ۲ اپریل: انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی۔ اور ایک برجستہ تقریر کی جو بے حد پسند کی گئی۔

" : (اواخر) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ کے ساتھ شرکت کی۔

---

[1] کتاب میں سلطان جہاں چھپا ہے جو غالباً طباعت کی غلطی ہے۔

[2] ...میں ماں کی چھپا ہے، مگر مولانا نے "تذکرہ" اور "آزاد کی کہانی" میں بھانجی ...

[3] ... تذکرہ' میں اپنی تاریخ پیدائش ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ لکھی ہے، جو تقویم کے مطابق ...ت/ستمبر ۱۸۸۸ء ہے" لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے: ...مولانا نے ان کو تاریخ ولادت ۸ یا ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ بتائی تھی جو مطابق ۱۷ ...۱۸ اگست ۱۸۸۸ء ہے" (ماہنامہ جامعہ بابت فروری ۱۹۸۸ء، صفحہ ۳۱)

صحیح سنہ ۱۸۹۰ء ہے، غالباً پروفیسر ہمایوں کبیر مرحوم کو سننے میں غلطی ہوئی۔

۱۹۰۵ء : ۲۲ اپریل : انجمن اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور برجستہ تقریر کی جس کا عنوان تھا : "اسلام زمانۂ آئندہ میں"

" اپریل / مئی : "لسان الصدق" کا دو ماہ کا مشترکہ شمارہ شائع ہوا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

" مئی یا جون : اپنے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ کے ساتھ بیرونی سفر پر روانہ ہوئے، مگر علالت کی وجہ سے عراق سے واپس آگئے۔ واپسی پر بمبئی میں پہلی مرتبہ مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی۔

" اکتوبر : "الندوہ" (لکھنؤ) کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اسی شمارے میں مولانا کا پہلا مضمون : "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" شائع ہوا۔ اسی زمانے میں مصر سے عربی "المرأۃ والمسلمۃ" کے عنوان سے ایک کتاب چھپی تھی، جس پر مولانا نے مفصل تبصرہ لکھا، جو "الندوہ" کے کئی شماروں میں شائع ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے الفاظ میں : "یہی سلسلۂ تحریر ہے، جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا۔"[5]

۱۹۰۶ء : مارچ : "الندوہ" سے علیحدگی اور سہ روزہ "وکیل" امرتسر کی ادارت۔

" اپریل : "وکیل" سے استعفیٰ۔

" (وسط) مولانا کے بڑے بھائی مولانا غلام یٰسین کی کلکتہ میں وفات[6]

۱۹۰۷ء : (اوائل) کلکتہ سے ہفتہ وار "دارالسلطنت" کا اجرا[7]

۱۹۰۸ء : ۱۷ اگست : مولانا کے والد مولانا خیرالدین کا کلکتہ میں انتقال[8]

" (اواخر) بیرونی ممالک : عراق اور حجاز وغیرہ کے دورے پر روانہ ہوئے۔

۱۹۱۲ء : ۶ اپریل : مصر کے مشہور صحافی، مجید عالم اور مفسر قرآن سید رشید رضا کی صدارت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ایک عظیم الشان جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ مولانا شبلی کی خواہش پر معزز صدر کی طویل تقریر کا ترجمہ اور خلاصہ مولانا آزاد نے بیان کیا۔ بقول مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم : "بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کردیا۔"[9]

" ۱۳ جولائی : مولانا کا مشہور ہفتہ وار مصور "الہلال" کا پہلا شمارہ کلکتہ سے نکلا۔

۱۹۱۳ء : ۲۰ جون : الداء والدواء (مرض اور علاج) کے مستقل کالم کے تحت "الہلال" میں "حزب اللہ" کے اغراض و مقاصد کی پہلی قسط شائع ہوئی۔

" ۱۸ ستمبر : "الہلال پریس" سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جس کی ادائیگی کے لیے ۲۷ ستمبر تک مہلت دی گئی تھی۔ مگر اس سے کافی پہلے ۲۳ ہی کو ادا کردی گئی۔

" ۲۴ ستمبر : "حزب اللہ" کی پانچویں اور آخری قسط شائع ہوئی۔ جس میں مولانا لکھتے ہیں : مختلف اسکیمیں لکھنے اور رد و کد کرنے کے بعد راہ مقصود کا راستہ پالیا ہے۔ جس پر چلنے سے مسلمان یقینی شاید مقصود سے ہم کنار ہو سکیں گے۔"

۱۹۱۴ء : ۲۷ اکتوبر : کلکتہ میں مولانا آزاد کی صدارت میں "اتحاد اسلامی" کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کے خطبے میں مولانا نے فرمایا : اس عاجز نے عام مجالس کی شرکت قطعاً بند کردی تھی [اس لیے] پہلے تو جی میں آیا کہ معذرت کے ساتھ انکار کردوں، لیکن اس کے بعد سوچا کہ وقت تو وہ آگیا ہے جب گونگے بولنے لگیں —

۵۔ مولانا سید سلیمان ندوی : حیاتِ شبلی، صفحہ ۴۴۴

۶۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے : "آزاد کی کہانی" میں مولانا غلام یٰسین کی وفات کا سال ۱۹۰۷ء لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ان کا انتقال وسط ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ ان کی وفات پر مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے پرچے "عالمگیر" کے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ایک شذرہ بھی لکھا تھا۔ (سہ ماہی "تحریر" جلد ۲ شمارہ ۱ (۱۹۶۸ء)۔

۷۔ کلکتہ سے "دارالسلطنت" کے نام سے ایک اخبار نکلتا تھا جو بند ہوگیا تھا۔ لوگوں کے اصرار پر مولانا آزاد کی ادارت میں دوبارہ نکالا گیا۔ (آزاد کی کہانی۔ صفحات ۲۹۶ - ۲۹۷ -) مگر ڈاکٹر رضا بیدار نے اپنی کتاب "ابوالکلام آزاد" میں لکھا ہے کہ یہ اخبار مجھے کہیں نہیں ملا۔ (صفحہ)

۸۔ بعض محققین نے تاریخ وفات ۱۵ اگست مطابق ۷ رجب ۱۳۲۶ھ لکھی ہے۔ مگر مولانا آزاد نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۰۸ء میں مولانا شبلی کو لکھا ہے : "والد کے انتقال کو آج دسواں دن ہے۔" اس لحاظ سے تاریخ وفات ۱۷ اگست ہوتی ہے، اسی لیے راقم الحروف اسی کو صحیح سمجھتا ہے۔

اندھے دیکھنے لگیں، لنگڑے چلنے لگیں اور بہرے سُننے لگیں۔ کیوں کہ اسلام اپنے ہر پیرو سے اس کے آخری فرض کا طالب اور اس شے کا خواستگار ہے جس کے بعد اس کے ذمہ اور کچھ باقی نہ رہے گا اور وہ توحید الٰہی کے حق سے سبکدوش ہو جائے گا۔ پس جو زبان نہیں بول سکتی اس کو بھی بولنے کی سعی کرنی چاہیے اور جو قدم نہیں اُٹھ سکتا اس کو بھی چلنے کے لیے اُٹھنا چاہیے۔"

۱۹۱۴ء : ۱۶ر نومبر: "الہلال" کی پچھلی دو ہزار کی ضمانت ضبط ہو گئی اور دس ہزار کی نئی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا۔ نیز ۱۲ر و ۱۷ر اکتوبر کا مشترک شمارہ (شمارہ : ۱۶ و ۱۷) بھی ضبط کر لیا گیا۔ حکومتِ بنگال نے جن مضامین کو قابلِ اعتراض قرار دیا تھا وہ "حدیث الجنوز" اور "سقوطِ اڈرنہ" تھے۔ ایک بیلجیئن تصویر بھی قابلِ اعتراض قرار دی گئی تھی۔ جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج تھی:

"وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۔"

(ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے)

〃 ۱۸ر نومبر : اس شمارہ : (نمبر ۲۰) کے بعد الہلال بند ہو گیا۔

۱۹۱۵ء : جولائی : (ماہ رمضان ۱۳۳۳ھ) مولانا نے دارالارشاد کی بنیاد رکھی اور اکتوبر سے قرآن کا درس شروع ہو گیا۔

〃 ۱۲ر نومبر : الہلال کے بند ہونے کے تقریباً ایک سال کے بعد مولانا نے کلکتے سے ہفتہ وار البلاغ جاری کیا۔ جس کے پہلے صفحہ پر ڈاکٹر محمد اقبال کی نظم "نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی" شائع ہوئی۔

۱۹۱۶ء : مارچ : البلاغ کا (۱۷ و ۲۴ مارچ) کا مشترک شمارہ (جلد ۱ نمبر ۱۵۔ ۱۶) آخری مرتبہ نکل کر بند ہو گیا۔

〃 ۲۳ر مارچ : حکومتِ بنگال نے ڈیفینس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت مولانا کو حکم دیا کہ ایک ہفتے کے اندر حدودِ بنگال سے باہر چلے جائیں (تذکرہ صفحہ ۳۴۴)

〃 ۳۰ر مارچ) مولانا نے لکھا ہے۔ "کلکتہ سے، سالہا سال کے متصل قیام کی بنا پہلے جا نہیں، اگر وطن کہوں، نکلا اور رانچی پہنچا" (تذکرہ : صفحہ ۳۴۳) ایک ہفتے کے بعد نظر بندی کا حکم ملا۔

۱۹۱۹ء : ۲۱ر مئی : مولانا نے دوران نظر بندی مساجد میں غیر مسلموں کے داخلے کے بارے میں ایک مضمون لکھا، جسے ماہ نامہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ جو مئی اور جون کے شماروں میں اور الگ سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اسی سلسلے میں "معارف" کے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو لکھتے ہیں : "آج بعض مسائل کے متعلق سخت گمراہی پھیل رہی ہے۔ اور اگر اس کا سدباب نہ ہوا تو ایک نہایت مفسدہ دروازہ کھل کر بند ہو جائے گا۔ اس کے متعلق میں نے ایک مختصر تحریر اخبارات میں شائع کرانی چاہی تھی، لیکن لکھنا شروع کیا تو بہت بڑھ گئی اور اب اخبارات کے لیے حدِ تحمل اور اندراج سے باہر ہو گئی۔ مجبوراً آپ کو بھیجتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حتی الوسع جلد اور بہ عنوانِ مناسب اس کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔ (تبرکاتِ آزاد صفحہ ۱۱۷)

۱۹۲۰ء : یکم جنوری : مولانا کو رانچی کی نظر بندی سے رہائی ملی۔

〃 ۱۶ر جنوری: دہلی میں خلافت وفد کے خیر مقدم کے جلسے میں مولانا آزاد نے ایک طویل اور پُر جوش تقریر کی۔

〃 ۱۸ر جنوری : گاندھی جی سے مولانا کی پہلی ملاقات۔

〃 ۱۹ر جنوری : خلافت وفد نے وائسرائے کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ جس پر منجملہ اور قومی رہ نماؤں کے مولانا آزاد کے بھی دستخط تھے۔

〃 فروری : مولانا کی صدارت میں کلکتہ "ٹاؤن ہال" میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اور مولانا نے مسئلۂ خلافت پر ایک مبسوط خطبہ دیا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

〃 ۲۳ر اپریل : (۴ر شعبان ۱۳۳۸ھ) مسلمانوں کو تحریکِ آزادی میں شامل کرنے کے لیے مولانا نے حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت قائم کی اور امام الہند کے عہدے کے لیے اپنے ہاتھ پر بیعت کا آغاز کیا۔

〃 ۹ر جون : الہ آباد میں خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ وائسرائے کو نوٹس دیا جائے کہ وہ خلافت کے مسئلے کو طے کرا دیں۔ ورنہ مسلمان ترکِ موالات پر مجبور ہوں گے۔ اس کے بعد ۹ اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی، جس کے ایک رکن مولانا آزاد بھی تھے۔

〃 ۱۳ر جولائی : تحریکِ حزب اللہ کی ترقی و توسیع کی اطلاع دیتے ہوئے مولانا آزاد ملیح آبادی صاحب کو لکھتے ہیں : "ہمارا دائرہ عمل منظم ہو چکا ہے۔ پنجاب، سندھ، بنگال بالکل متفق اور متحد ہے۔"

〃 ۴ر تا ۹ر ستمبر : کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس منعقد ہوا۔ اسی

زمانے میں مولانا آزاد کی صدارت میں خلافت کا اجلاس ہوا، جس میں مولانا نے مسئلۂ خلافت پر مفصل روشنی ڈالی۔

۱۹۲۰ء : اکتوبر : مولانا نے یہ فتویٰ دیا کہ "احکامِ شرعیہ کی رو سے کسی طالب علم کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی سرکاری کالج یا ایسے کالج میں تعلیم حاصل کرے جو سرکار سے امداد قبول کرتا ہو اور سرکاری یونیورسٹی سے ملحق ہو۔"

" ۲۳ اکتوبر : چند مسلم قومی رہنماؤں نے، جن میں مولانا آزاد بھی شامل تھے، علی گڑھ پہنچ کر اعلان کیا کہ ۲۹ اکتوبر کو جمعہ کی نماز کے بعد سے کامل آزاد مسلم یونیورسٹی کے لکچروں کا آغاز ہو جائے گا۔

" ۲۹ اکتوبر : مولانا آزاد اور دیگر قومی مسلم رہنماؤں اور ہزاروں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مجمع میں شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم نے بعد نمازِ جمعہ اپنے خطبہ سے سرکاری امداد سے آزاد مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کا افتتاح فرمایا۔

" ۲۲ نومبر : نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ علی گڑھ میں منعقد ہوا جس میں مولانا آزاد نے شرکت کی۔

" ۱۳ دسمبر : مولانا آزاد کی اپیل پر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے تقریباً ڈھائی سو طلبہ نے تحریکِ ترکِ موالات میں شرکت کی۔ مولانا نے ان کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں مدرسہ اسلامیہ کے نام سے ایک عربی اور دینی درس گاہ قائم کی جس کا افتتاح مہاتما گاندھی نے کیا۔

۱۹۲۱ء : ۲۹ اپریل : شیعہ پولیٹیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا لکھنؤ پہنچے۔

" ۲۵ اگست : دو روزہ مجلس خلافت منعقدہ آگرہ کی صدارت کی۔ مولانا نے اپنے افتتاحی خطبے میں "الہلال" کے لہجے اور نمایاں مقصد کے حوالے سے فرمایا۔ میں نے دعوت دی تھی کہ ملک کی آزادی اور خلافت کی خاطر "مسلمانوں کا فرضِ شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔"

" ۲۶ اگست : اپنے اختتامی اجلاس کے خطبے میں اعلان کیا : "ہاں، ہاں میں نے سپاہیوں سے، ہندوستان کی برٹش فوج سے یہ کہا ہے اور جب تک میرے حلق میں آواز کھینچی نہیں یہی کہتا رہوں گا۔ اور جب تک میری زندگی باقی ہے۔ ہر صبح کو ہر شام کو میرا پہلا فرض یہی ہوگا کہ سپاہیوں کو ورغلاؤں اور ان سے کہوں کہ گورنمنٹ کی نوکری چھوڑ دو۔"

۱۹۲۱ء : ۲۳ ستمبر : مولانا نے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار "پیغام" نکالا جس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ اور پہلے شمارے پر لوح کے نیچے درج تھا : "زیرِ نگرانی : مولانا ابوالکلام" دوسرے شمارے سے اس کے بجائے درج ہوتا تھا : "اس میں مولانا ابوالکلام کی تحریرات بالالتزام شائع ہوتی رہیں گی" ساتویں شمارے سے آخری شمارے تک تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ عبارت یوں شائع ہوتی رہی : "جس میں بالالتزام حضرت مولانا ابوالکلام کی تحریرات شائع ہوتی ہیں۔"

" ۹ نومبر : طویل دورے کے بعد مولانا کلکتہ واپس آئے اور انگورہ فنڈ کے لیے رقم مہیا کرنے میں جٹ گئے۔

" ۱۶ نومبر : جمعیۃ العلمائے ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے کلکتہ سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۸ کو دوپہر کے وقت لاہور پہنچے۔ ۱۹ اور ۲۰ کو سبجکٹ کمیٹی اور عام اجلاس کی صدارت کی اور اسی دن گاندھی جی کے تار پر بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے جہاں فرقہ وارانہ بدامنی اور شورش کی وجہ سے خطرناک صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ ۲۲ کو مولانا بمبئی پہنچے تو اس وقت تک حالات میں بڑی حد تک سکون پیدا ہو گیا تھا۔

" ۲۵ نومبر : بمبئی کے ایک بیان میں مولانا نے فرمایا : "میں ۱۴ سے سفر میں ہوں۔ میری عدم موجودگی میں کلکتہ میں میرے مکان اور پریس کی تلاشی لی گئی اور تمام غیر متعلق کاغذات اور میری تصنیفات اور یادداشتوں کے مسودات پولیس نے اپنے قبضے میں کر لیے۔" اسی بیان میں کارکنانِ خلافت کو پیغام دیتے ہوئے فرمایا ہے : "حکومت ایک نئی ہمت اور طاقت سے آگے بڑھی ہے۔ میں اس موقع پر تمام خلافت ورکرز کو خاص طور پر توجہ دلاتا ہوں کہ فرض اور ہمت کی روح سے معمور ہو جائیں۔ اور اپنے نظام کو ہر طرح کی خیال اور عمل کی کمزوریوں سے پاک کر دیں۔"

" یکم دسمبر : مولانا بمبئی سے کلکتہ چار بجے شام کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے رفیق اور ہفتہ وار پیغام (کلکتہ) کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

" ۱۰ دسمبر بروز جمعہ : تقریباً ساڑھے چار بجے شام کو کلکتہ میں مولانا

آزاد کو گرفتار کرکے پریسی ڈنسی جیل بھیجدیا گیا۔ مولانا نے جیل کے دفتر میں مغرب کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد یورپین وارڈ میں بند کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء : ۱۳ر دسمبر : مولانا کے مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی اور یہ اطلاع دینے کے بعد کہ دفعہ ۱ کے تحت انہیں گرفتار کیا گیا ہے۔ مقدمہ ۲۳ر دسمبر کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

۱۳ر دسمبر : تیرہ شمارے نکلنے کے بعد ایڈیٹر اور ناشر کی گرفتاری کے بعد ہفتہ وار پیغام بند ہو گیا۔

۲۳ر دسمبر : مولانا کے مقدمے کی دوسری پیشی ہوئی۔ مگر بغیر کسی خاص کارروائی کے ۵ر جنوری کے لیے مقدمہ ملتوی ہو گیا۔

۱۹۲۲ء : ۶ر جنوری : ۵ر جنوری کے بجائے ۶ر جنوری کو مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ سرکاری وکیل نے بیان کیا کہ مولانا کے خلاف دراصل دو مقدمے ہیں : ایک دفعہ ۱۷-۲، ترمیم ضابطہ فوجداری کے تحت، دوسرا ۱۲۴ (الف) تعزیرات ہند (بغاوت) کے تحت۔ چونکہ موخرالذکر جرم نہایت ہی سنگین ہے لہٰذا میں ان کے خلاف ترمیم شدہ ضابطۂ فوجداری کے تحت کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا اور اپنے اس دعوے کو واپس لیتا ہوں۔ مولانا اس دفعہ کے تحت آزاد ہیں۔ مجسٹریٹ نے مولانا سے کہا کہ آپ رہا کر دیے گئے۔ سرکاری وکیل نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا : "ملزم کے خلاف موجودہ مقدمہ زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) تعزیرات ہند ہے۔ یہ ان کی ان دو تقریروں کی بنا پر ہے جو انہوں نے پہلی اور ۱۵ر جولائی ۱۹۲۱ء کو مرزاپور پارک کلکتہ میں کی تھیں۔" ابتدائی کارروائی کے بعد ۱۱ر جنوری کے لیے سماعت ملتوی کر دی گئی۔

۱۱ر جنوری : چوتھی پیشی ہوئی۔ مجسٹریٹ نے مولانا سے دریافت کیا کہ کیا وہ کوئی بیان دینا چاہتے ہیں ؟ مولانا نے فرمایا : "ہاں، اگر عدالت کو اعتراض نہ ہو تو میں ایک تحریری بیان پیش کروں گا۔" مجسٹریٹ : "کیا وہ آپ کے پاس ہے ؟" مولانا : "ہاں، مگر اردو میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ انگریزی ترجمہ عدالت میں داخل کروں۔" اس کے بعد مقدمہ ملتوی ہو گیا

〃 ۱۷ر جنوری : پانچویں مرتبہ مولانا کے مقدمے کی سماعت پریسی ڈنسی جیل میں شروع ہوئی۔ حسب معمول پریسی ڈنسی کورٹ میں عوام کی بہت بڑی تعداد جمع تھی۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ مقدمے کی سماعت کورٹ کے بجائے جیل ہوگی تو بہت سے لوگ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ مگر کچھ لوگ فوراً کاروں اور ٹیکسیوں کے ذریعے جیل پہنچے، لیکن انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ حتیٰ کہ قریبی عزیزوں اور اخبارات کے نمائندوں کو بھی جیل کے احاطے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ٹھیک پونے بارہ بجے مولانا جیلر کے ساتھ آئے اور آتے ہی سوال کیا : "یہ کارروائی پبلک ہے یا پرائیویٹ ؟" مجسٹریٹ : "پرائیویٹ۔" اس کے بعد مجسٹریٹ نے کہا : "آپ تشریف رکھیں۔" مولانا : "کیا آپ نے مجھ سے کہا ہے ؟" غالباً آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں پہلے بھی دو مرتبہ آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہوں۔" مجسٹریٹ : "مجھے یاد ہے۔" مولانا : "گزشتہ موقعوں پر جب میں دو تین گھنٹے تک مسلسل کھڑا رہ سکا تو آج بھی کھڑے رہنے میں میرے لیے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔" مجسٹریٹ : "افسوس ہے کہ مجھے ان موقعوں پر یاد نہیں رہا۔" مولانا : "شکریہ۔" مجسٹریٹ : "کیا آپ اپنا بیان لائے ہیں ؟" مولانا : "اردو میں لایا ہوں، اپنے سکریٹری کی عدم موجودگی کی وجہ سے انگریزی میں ترجمہ نہ ہو سکا۔" مجسٹریٹ کے اس استفسار کے جواب میں کہ کیا آپ ترجمے کے لیے مہلت چاہتے ہیں ؟ مولانا نے فرمایا : "میں نہیں چاہتا کہ محض ترجمے کی وجہ سے مقدمہ میں تاخیر ہو۔" مجسٹریٹ : "لیکن اگر اس کا انگریزی ترجمہ ہو جاتا تو عدالت کے لیے آسانی ہوتی۔" اس کے بعد مقدمہ ۱۹ر تاریخ تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ بعد میں یہ تاریخ بدل کر ۲۴ر کر دی گئی۔

〃 ۲۴ر جنوری : مولانا کا مقدمہ سول جیل میں چیف پریسی ڈنسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا۔ تقریباً ایک بجے مولانا تشریف لائے۔ عدالت نے مولانا کا بیان لے لیا اور اگلی پیشی کے لیے ۳۱ر جنوری کی تاریخ مقرر کی۔

〃 ۳۱ر جنوری : مولانا کئی روز سے علیل تھے۔ جگر کا فعل خراب ہونے کی وجہ سے اسہال کی شکایت ہو گئی تھی۔ جیل کے ڈاکٹر نے کہا کہ ایسی حالت میں ان کا عدالت میں جانا نہایت مضر ہوگا، لیکن مولانا نے اسے پسند نہیں کیا۔ انہوں نے فرمایا جب کارروائی جیل کے احاطے میں ہوتی ہے تو تھوڑی دیر کے لیے چند قدم چلا جانا کچھ دشوار نہ ہوگا۔ لہٰذا عدالت کو کوئی اطلاع نہ کی جائے، مگر

تھوڑی دیر میں سپرنٹنڈنٹ جیل مسر بہ مہر پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی تحریر لے کر آیا، جس پر ۳۰ر جنوری کی تاریخ درج تھی اور جس میں لکھا تھا کہ مولانا کا مقدمہ ۹ر فروری کے لیے ملتوی کیا جاتا ہے۔

〃 ۹ر فروری: (آخری پیشی): مولانا تقریباً ۱۲ بجے کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے۔ پہلے سے ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ مجسٹریٹ نے عارضی طور پر اسے ملتوی کرکے، مولانا کے مقدمے کا فیصلہ سنایا جس میں ایک سال قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی۔ مولانا نے یہ فیصلہ سن کر مجسٹریٹ سے مسکراتے ہوئے فرمایا "یہ تو اس سے بہت کم ہے جس کی مجھے توقع تھی۔" اس طرح پورے ساٹھ (۶۰) دن کے بعد مقدمہ کا یہ مرحلہ ختم ہوا۔

۱۹۲۳ء: ۶ر جنوری صبح بروز جمعرات: ایک سال قید بامشقت کی مدت پوری کرنے کے بعد سینٹرل جیل علی پور سے رہا کیے گئے۔

〃 یکم اپریل: مولانا نے "الجامعہ" کے نام سے کلکتہ سے عربی زبان میں ایک رسالہ نکالا، جس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق لکھنوی (ملیح آبادی) تھے اور مولانا آزاد اس کے نگراں۔

〃 ۲۲ر جون: مولانا نے عدم تشدد کے مسئلے پر گاندھی جی سے گفتگو کی۔

〃 ۱۵ر دسمبر: کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی کی صدارت کی۔ اس وقت تک جن لوگوں کو یہ اعزاز ملا تھا، ان میں مولانا سب سے کم عمر تھے۔ اس وقت مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات میں بڑی شدت پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے پیش نظر مولانا نے اپنے خطبے میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے فرمایا: "آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔"

۱۹۲۴ء: مولانا کا عربی رسالہ "الجامعہ" کا آخری شمارہ شائع ہوا، اس کے بعد بند ہوگیا۔

〃 ۲۷ تا ۲۹ر جون: مولانا کی صدارت میں احمد آباد میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء کا مِلا جُلا اجلاس منعقد ہوا۔

۱۹۲۵ء: ۲۱ و ۲۲ر ستمبر: مولانا کی صدارت میں خلافت کمیٹی کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ منعقد ہوا۔

〃 ۲۶ر ستمبر: مولانا آزاد نے بحیثیت صدر خلافت کانفرنس اقوام لیگ کے صدر کو بحری تار دیا کہ گزشتہ جمعہ کو مسلمانانِ ہند نے ہزاروں مسجدوں میں جمع ہو کر اپنے ریفی بھائیوں کی فتح و نصرت کے لیے، ان غیر ملکی ظالموں کے خلاف دعائیں مانگیں جو انہیں آزادی سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔

〃 ۲۹ر دسمبر: مولانا نے آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ کان پور کی صدارت کی۔ اپنے خطبے میں ملک کے سیاسی حالات پر نظر ڈالتے ہوئے فرمایا: "اب سرگرمی کی جگہ افسردگی ہے۔ بیداری کی جگہ غفلت ہے، اتحاد کی جگہ انتشار ہے۔ ملک و قوم کی جگہ فرقہ اور جماعت کی صدائیں ہیں۔ اور کام کی رہی سہی قوتوں کے لیے نئے نئے گمراہ کرنے والے فتنے پیدا ہو رہے ہیں۔"

۱۹۲۷ء: ۱۹ر جنوری: مولانا نے غلام رسول مہر کو لکھا: "اردو میں اس وقت تک روزانہ اپنے کم تر سے کم تر معنوں میں بھی وجود پذیر نہ ہوسکا۔ دہلی سے ایک اچھا اخبار نکل سکتا ہے۔ میں وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر ارادہ کر چکا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح چند اخبارات شائع کر دیے جائیں۔ بالفعل کلکتہ سے روزانہ اخبار جاری کر رہا ہوں۔"

〃 ۲۸ر جنوری: مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری جالندھر اور گوجرانوالہ تشریف لے گئے۔ اور ان جلسوں میں تقریریں کیں جو سائمن کمیشن کے مقاطعہ اور ۳ر فروری کو ہڑتال ہونے والی ہے۔ یہ دونوں رہنما رات گئے تک لاہور واپس آگئے۔

〃 ۲۹ر جنوری: آج صبح کو مولانا آزاد، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری نے طلبائے اسلامیہ کالج سے خطاب کیا۔ اور سائمن کمیشن کے مقاطعہ اور مجوزہ ہڑتال کے لیے اپیل کی۔ اس کے بعد مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری نے سر ذوالفقار علی خاں کے مکان پر مسلم لیگ کے ارباب حل و عقد سے گفت و شنید کی۔ آج ہی سہ پہر کو باشندگانِ لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ بیرون موچی دروازہ منعقد ہوا۔ جس میں ان تینوں قومی رہنماؤں نے تقریریں کیں۔

〃 ۱۰ر جون (جمعہ): الہلال کے دورِ ثانی کا پہلا شمارہ نکلا،

جس میں مولانا لکھتے ہیں ۔ " آئندہ دونوں قسم کے مضامین درج کیے جائیں ۔ بڑا حصہ سہل و عام فہم ہو ۔ لیکن کچھ حصہ بلند اور خاص قسم کا بھی ہو ۔ اس طرح عوام اور خواص دونوں کے دوق نظر کا سامان مہیا ہو جائے گا۔

۱۹۲۷ء : ۹ر دسمبر : الہلال کے دور ثانی کا آخری شمارہ (جلد : ۱ نمبر ۲۵) نکلا ۔

" ۱۷ر ستمبر : ایک کمیٹی میں شرکت کے لیے مولانا کلکتہ سے شملہ پہنچے اور ۲۲ تک وہاں قیام کیا ۔

" ۳۱ر دسمبر : مسلم لیگ منعقدہ کلکتہ کے دوسرے اجلاس میں مولانا نے فرمایا : "لکھنؤ کے میثاق سے ہم نے اپنے مصالح اور مفادات کو بیچ دیا تھا ، لیکن تجویز دہلی نے مسلمانانِ ہند کے صحیح حقوق کو واپس لانے کا پھر لپید دروازہ کھول دیا ۔

۱۹۲۸ء : ۱۲ر جنوری : سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلے میں آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ بنارس میں مولانا نے فرمایا ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں نے آل پارٹیز کانفرنس سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ بالکل پوری ہو گئیں ۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خصوصیت سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ دیگر محبانِ وطن سے اس معاملے میں پیچھے نہ رہیں ۔

" ۲۵ر جنوری : سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے لیے ایک عظیم الشان اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں مولانا حسرت موہانی نے زور دے کر کہا کہ " وہ اس کے موافق نہیں ہیں کہ شاہی کمیشن کے ساتھ کوئی تعاون کیا جائے ۔ البتہ وہ مقاطعہ کے بھی موافق نہیں ہیں "۔

" مولانا آزاد نے اپنی تقریر میں اس کے حوالے سے کہا : " مولانا حسرت موہانی کے خیالات سن کر حیرت آمیز مسرت ہوئی ۔ جیسی کہ امید تھی ۔ وہ بھی کمیشن کے ساتھ تعاون کے حامی نہیں ہیں ۔ پھر دوسرا راستہ مقاطعہ کا ہے ۔ کوئی درمیانی راستہ نہیں ہے "!

" ۲۱ر نومبر : شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے کے انتقال (مورخہ ۱۷ر نومبر) پر مولانا آزاد نے مدراس میں پریس کے نمائندوں سے کہا ۔ " لالہ جی کی موت سے ملک کا اتنا زبردست نقصان ہوا ہے جس کی تلافی مشکل ہے ۔ لالہ جی جنگِ آزادی کے قابل ترین سپاہی تھے ۔

" ۱۹ر دسمبر : آج روزنامہ " اجمل " (بمبئی) میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہمعصر ریاست " سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جنوری ۱۹۲۹ء کے دوسرے ہفتے سے دارالحکومت دہلی " سے "الاقدام" کے نام سے ایک اخبار جاری کرنا چاہتے ہیں ۔ مولانا اپنا قدیم اخبار " الہلال " دہلی سے نکالنا چاہتے تھے ۔ لیکن چونکہ اس اخبار کے نام کا ڈکلریشن کیا جا چکا ہے ، اس لیے مولانا کو نام کی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی "۔

۱۹۲۹ء : ۱۵ر فروری : کانگریس ورکنگ کمیٹی منعقدہ دہلی نے بدیشی کپڑوں کے بائیکاٹ کی اسکیم منظور کی اور اس سلسلے میں گاندھی جی کی صدارت میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی اس کے ایک رکن مولانا آزاد بھی تھے ۔

" ۲۷ر جولائی : مولانا نے ایک نئی سیاسی پارٹی " آل انڈیا مسلم نیشنلسٹ پارٹی " قائم کی اور وہی اس کے صدر مقرر ہوئے ۔

۱۹۳۰ء : ۲ر جنوری : مولانا آزاد اور ڈاکٹر انصاری نے ملک و قوم سے اتحاد و اتفاق کی پُرزور اپیل کی ۔

" ۳ر جنوری : مولانا نے لاہور کی ایک مجلس میں جہاں سخن سنج حضرات جمع تھے ۔ حسب ذیل رباعی ارشاد فرمائی :

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے کا رنگ و روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

مولانا کی یہ رباعی بخطِ شاعر بھی " ارمغانِ آزاد (مرتبہ : ابو سلمان شاہ جہاں پوری) شامل ہے ، جس پر دستخط کے نیچے درج ہے : " لاہور : ۲ر جنوری ۳۰ ء " اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً اسی تاریخ کو مولانا نے لاہور میں رباعی کہی ہے ۔

" ۱۰ر اگست : آج شام ساڑھے چھ بجے گاندھی گراؤنڈ دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا : " میں آج ٹھیک ۳ ماہ کے بعد آپ کے سامنے آکر کھڑا ہوا ہوں ۔ پہلے نمک کے قانون کو ہندوستانیوں نے توڑا ہی نہیں بلکہ میں کہوں گا کہ پیروں کے نیچے روند ڈالا ۔ دوسری تحریک غیر ملکی کپڑے کے مقاطعہ کی تھی اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی گزشتہ تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جب ملک نے غیر ملکی کپڑوں کا ایسا مقاطعہ کیا ہو ۔ انگلستان کی ریڑھ کی ہڈی کو شدید ضرب پہنچی ہے "۔

" ۷ر اگست : ولبھ بھائی پٹیل کی جگہ مولانا آزاد کانگریس کے صدر نامزد کیے گئے ۔

" ۱۱ر اگست : کلکتہ میں دوپہر بعد قائم مقام صدر کانگریس مولانا

آزاد کو گرفتار کر لیا گیا۔ موصوف کی گرفتاری میرٹھ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے وارنٹ پر عمل میں آئی۔ مولانا کو دہرہ دون ایکسپریس سے پولیس کی حفاظت میں میرٹھ پہنچایا گیا۔

۱۹۳۰ء : ۲۷ اگست آج دوپہر بعد میرٹھ ڈسٹرکٹ جیل میں مسٹر کاگھل جوائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مولانا کے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ عدالت کے سوال پر مولانا نے فرمایا: "مقدمے کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لوں گا۔ مجسٹریٹ نے مولانا کو ۱۹۳۰ء کے آرڈیننس نمبر ۶ دفعہ ۲ کے تحت چھ ماہ قیدِ محض کی سزا دی اور سفارش کی کہ مولانا کو اے کلاس میں رکھا جائے۔

۱۹۳۱ء : ۲۸ جنوری: آج صبح کو مولانا آزاد گوڑہ جیل سے، جہاں وہ کچھ روز پہلے میرٹھ جیل سے منتقل کر دیے گئے تھے، رہا ہو کر دہلی پہنچے۔ موصوف نے نمائندہ اخبار "تیج" سے انٹرویو میں فرمایا: گزشتہ ۹ ماہ میں (؟ چھ ماہ میں) صورتِ حالات میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، ان کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو اور اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کو صورتِ حال پر غیر جانبداری سے غور کرے۔ اندریں حالات جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ مہاتما گاندھی نے صحیح طور پر واضح کر دیا ہے۔"

" ۲ فروری: یوپی کونسل (میرٹھ) میں چودھری بلدیو ممبر کونسل نے سوال کیا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ قائم مقام صدر کانگریس مولانا آزاد نے میرٹھ جیل سے گوڑہ جیل جاتے وقت فرسٹ کلاس میں سفر کیا۔ جس کے لیے ان کو اپنے پاس سے کرایہ ادا کرنا پڑا؟

" ۶ فروری: پنڈت موتی لال نہرو کی وفات پر مولانا آزاد نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا: "قومی جد و جہد کے اس مرحلے پر پنڈت موتی لال نہرو کی وفات ایک بھاری ضرب ہے — تھکاوٹ اور صحت کی تباہی کے باوجود وہ جس دلیری اور بہادری سے قومی تحریک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔"

" ۱۱ فروری: مہاتما گاندھی سے مشورے کے لیے ممتاز قومی رہنما آنند بھون (الہ آباد) میں جمع ہوئے۔ ان میں مولانا آزاد بھی کلکتہ سے تشریف لائے ہیں۔

" ۳۱ مارچ و یکم اپریل: جمعیۃ العلماء ہند کے دسویں اجلاس منعقدہ کراچی کی مولانا آزاد نے صدارت کی۔

۱۹۳۲ء : ۲۹ جنوری: کلکتہ کارپوریشن کے خصوصی اجلاس میں سبھاش چندر بوس کی جگہ پُر کرنے کے لیے، جو اُن کی گرفتاری کی وجہ سے خالی ہو گئی تھی کانگریس پارٹی کی طرف سے مولانا آزاد کا نام پیش کیا گیا۔ اور وہ کثرتِ رائے سے الڈرمین کی حیثیت سے منتخب ہو گئے۔

" ۳۰ جنوری: مولانا کو کلکتہ کارپوریشن کا چیرمین منتخب کیا گیا

" مارچ: سہ روزہ (مدینہ) بجنور مورخہ ۱۲ مارچ کے مطابق مولانا آزاد قائم مقام صدر کانگریس کی قیام گاہ واقع دریا گنج دہلی پر کئی دن سے سی آئی ڈی کا زبردست پہرا ہے۔ اور ہر آنے جانے والے کی تلاشی لی جاتی ہے۔

" ۱۲ مارچ: مولانا آزاد گرفتار کر لیے گئے۔

" ۱۱ مئی: آج مولانا آزاد کو جیل سے تقریباً دو ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے فوراً بعد انہیں نوٹس دیا گیا کہ وہ کانگریس کی سرگرمیوں میں شرکت نہ کریں اور بغیر اجازت کے دہلی سے باہر نہ جائیں۔

" ۱۳ اگست: مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں "میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کے بقیہ انفاس صرف اسی کام (تصنیف و تالیف اور علمی کام) کے لیے وقف کر دوں۔ دیکھیے وقت ملتا ہے یا نہیں؟" حاشیے میں درج ہے "مہلت نہ ملی اور یہ ارادہ بار ہا فسخ ہوا۔" (تبرکاتِ آزاد صفحہ ۱۳۷)

۱۹۳۴ء : ستمبر: مولانا نے جمعیۃ تبلیغ اہلحدیث کے جلسہ منعقدہ کلکتہ کی صدارت کی۔

۱۹۳۵ء : ۱۱ اپریل: مولوی محی الدین قصوری مرحوم کو مولانا آزاد لکھتے ہیں: "میں ادھر ارادہ کر رہا تھا کہ جنوری سے "الہلال" ماہ وار رسالے کی شکل میں شائع کرنا شروع کر دوں۔ کیوں کہ لوگوں کا تقاضا حدِ برداشت سے گزر چکا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ماہ وار رسالہ وہ مقاصد پورے نہیں کر سکتا جو ہفتہ وار رسالے سے متوقع ہیں۔"

۱۹۳۶ء : ۲۵ دسمبر: آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی سبجکٹ کمیٹی منعقدہ فیض پور میں تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا "اگر کانگریس عہدے قبول کرنے والوں کے مقاصد کو تقویت پہنچا سکتی ہے تو پھر کانگریسی ارکان عہدے کیوں قبول نہیں کر سکتے۔"

۱۹۳۷ء: یکم جنوری: شمالی مغربی سرحدی صوبے کے عوام کے لیے فیض پور سے مولانا آزاد نے ایک پیغام بھیجا، جس میں وہاں کے رائے دہندوں سے اپیل کرتے ہوئے فرمایا: "اگر میری صحت اجازت دیتی تو میں خود آپ تک پہنچتا۔ اس لیے اس پیغام کے ذریعے آپ کو اپنا فرض یاد دلاتا ہوں۔ اسمبلی کے انتخابات کی تاریخیں قریب آگئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ تمام رجعت پسند قوتوں کے خلاف پورے زور کے ساتھ لڑیں گے۔ اور فریب کاری کے خلاف مقابلہ کرتے ہوئے کامیاب ہوں گے۔"

" ۲۸ مارچ: مولانا آزاد الٰہ آباد تشریف لائے، جہاں اس مسئلے پر غور و خوض کیا جائے گا کہ مسلمانوں کو کانگریس کے حلقۂ عمل میں لانے کے لیے کیا کوشش کی جائے۔

" ۱۱ جولائی: صدر آل انڈیا کانگریس پارلیمنٹری سب کمیٹی، سردار پٹیل نے بمبئی سے بذریعہ تار صوبوں کی کانگریس پارٹیوں کے تمام لیڈروں کو مطلع کیا ہے کہ کابینہ کے مسلم ممبروں کا تقرر کرنے سے قبل مولانا آزاد سے مشورہ کر لیا جائے اور ان کی اجازت حاصل کر لی جائے۔

" ۱۳ جولائی: یوپی میں وزارت سازی کے سلسلے میں باہمی مشورے کے لیے مولانا آزاد لکھنؤ سے الٰہ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ پنڈت گوبند پنت بھی تھے۔ نمائندہ پریس کے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا: فرقہ وارانہ بنیاد پر نمائندگی کا کوئی خیال نہیں ہے۔ جب پریس کے نمائندے نے یہ دریافت کیا کہ اگر مسلم لیگ پارٹی مجالس آئین ساز میں کانگریس کے پروگرام پر عمل کرنے کے لیے رضامند ہوئے۔ تو کیا کانگریس لیگ کا کوئی نمائندہ کابینہ میں شامل کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ مولانا نے جواب دیا کہ ایک آدمی دو مالکوں کی فرماں برداری نہیں کر سکتا۔

" ۱۷ جولائی: لکھنؤ میں چودھری خلیق الزماں سے گفت و شنید کے بارے میں مولانا آزاد نے الٰہ آباد میں نمائندہ تیج کو بتلایا کہ کانگریسی وزارت میں کسی دوسری پارٹی کو شامل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے دروازے ہر اس شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں جو کانگریس کے عہدنامے پر دستخط کر دے۔

" ۲۷ جولائی: مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو کے پیغامات کے ساتھ یوپی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا اجلاس لکھنؤ میں شروع ہوا۔

مولانا نے اپنے پیغام میں منزلِ مقصود کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا۔ "راستے میں ریگستان اور نخلستان دونوں ہیں، لیکن نخلستان کو دیکھ کر آپ کے منہ میں پانی نہیں بھر آنا چاہیے اور آپ کو اپنے راستے سے الگ ہو کر نخلستان کو اپنا مستقل ٹھکانا نہیں بنا لینا چاہیے۔"

۱۹۳۷ء: ۲۹ جولائی: لکھنؤ سے پٹنہ کے لیے روانہ ہونے سے قبل نمائندہ ایوشی ایٹڈ پریس کو ایک مدلل مبسوط بیان دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "کابینہ میں شریک کرنے کے لیے کانگریس کی شرائط پر میں نے چودھری خلیق الزماں اور بعدازاں نواب اسمٰعیل خاں سے بات چیت کی۔ مگر ان سے مکمل سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے سردست گفت و شنید ترک کر دی گئی ہے۔

" ۱۳ اگست: کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کے لیے مولانا آزاد آج بذریعہ کلکتہ میل واردھا پہنچ گئے۔

" ۲۹ اگست: مولانا کلکتہ سے پشاور کے لیے پنجاب سے روانہ ہوئے۔ روانگی سے قبل نمائندہ ایوشی ایٹڈ پریس کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: "ہم یہ توقع کرتے ہیں کہ سرحدی اسمبلی کے نصف درجن غیر ملکی کے مشترکہ مفاد کے معاملے میں ہمارے ساتھ اشتراکِ عمل کریں گے۔ اور اگر ہماری توقع بر آئی تو وہاں کانگریسی وزارت کے قیام کو کوئی روک نہیں سکتا۔

" یکم ستمبر: مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کل شام کو جب ایبٹ آباد پہنچے تو شہریوں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔

" ۲۶ اکتوبر: آج ڈیڑھ بجے کلکتہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی، جس میں مولانا آزاد نے شرکت کی۔

" ۳۰ اکتوبر: آج آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس کلکتہ میں شروع ہوا جس میں مولانا آزاد نے ایک ریزولیشن پیش کیا اور فیڈریشن کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا: "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بابت ۱۹۳۵ء میں اوّل صوبجاتی آزادی اور دوم فیڈریشن کی اسکیم پیش کی گئی ہے۔ مگر ملک کے بہترین مفاد کے پیش نظر کانگریس دونوں کے خلاف ہے۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے اس ریزولیشن کی تائید کی۔ بالآخر کافی بحث و گفتگو کے بعد یہ ریزولیشن پاس ہو گیا۔

" ۹ نومبر: آج صبح کلکتہ سے مولانا آزاد پٹنہ پہنچے، جہاں وہ

زمیں داروں اور کسانوں کے نمائندوں سے ملاقات کریں گے۔ نیز قانونِ مزارعہ کے ترمیمی بل پر جس کے خلاف پورے صوبے میں شدید احتجاج کیا جا رہا ہے، تبادلۂ خیالات کریں گے۔ آج صبح دیر تک ڈاکٹر راجندر پرشاد سے گفتگو کی۔ قیام ڈاکٹر سید محمود کے یہاں ہے۔

۱۹۳۸ء یکم جنوری: صوبۂ سرحد کی کانگریس استقبالیہ کمیٹی کی میٹنگ پشاور میں ہوئی۔ جس میں کانگریس کے آئندہ اجلاس کی صدارت کے لیے مولانا آزاد کے نام کی سفارش کی گئی۔

〃 ۲ر جنوری: بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے شرکت کی۔

〃 ۸ر جنوری: آج بمبئی میں کانگریسی ممبرانِ اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں خصوصی دعوت پر مولانا آزاد نے شرکت کی۔ موصوف نے کانگریسی وزارتوں کے رویے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: "تمام اقلیتوں کے ساتھ مساوی سلوک کر رہی ہیں۔" مزید فرمایا: "جداگانہ انتخابات فرقہ پرستوں کے ہتھیار ہیں۔ ان کا خاتمہ فرقہ وارانہ اتحاد کا موجب ہوگا۔"

〃 ۱۲ر جنوری: تبرا مدحِ صحابہ کے تنازعہ کے سلسلے میں کل شام کو لکھنؤ میں مولانا آزاد نے شیعہ نمائندوں سے بات چیت کی اور آج سنیوں کے نمائندوں سے گفتگو کی۔ ان نمائندوں میں مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا ظفر الملک شامل تھے۔ دونوں گفتگو ابھی صیغۂ راز میں ہیں۔

〃 ۱۴ر جنوری: مدحِ صحابہ کے سلسلے میں مجلسِ احرار اور جمعیۃ العلماء کے رہنماؤں سے مولانا آزاد کی جو گفتگو ہو رہی ہے، وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی ہے۔ مولانا چاہتے ہیں کہ خوش اسلوبی کے ساتھ دونوں فریقوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن اگر کچھ نہ ہو سکا تو آئندہ شروع ہفتہ میں فیصلہ سنا دیا جائے گا۔

〃 ۳۰ر جنوری: مولانا آزاد نے وزیرِ اعظم بنگال فضل حق کو خط لکھا ہے جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسے خاص واقعات بتائیں جن میں کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں پر سختیاں کی گئی ہیں۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اگر آپ ایسے واقعات پیش کریں گے تو میں کانگریس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے اس قسم کی شکایتوں کو دور کر دوں گا۔

۱۹۳۸ء : ۲۲ر فروری: آج آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ ہری پورہ (ہنگری) کے اجلاس میں صدر کانگریس سبھاش چندر بوس نے اپنی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکین کے جن ناموں کو پیش کیا ہے، ان میں مولانا آزاد بھی شامل ہیں۔

〃 ۱۷ر مارچ: مسئلۂ شہید گنج (لاہور) کے سلسلے میں سر سکندر حیات خاں نے کل پنجاب اسمبلی میں جو بیان دیا تھا اس پر مولانا آزاد نے ان کو مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا: "بلاشک و شبہ یہی صحیح طرزِ عمل ہو سکتا تھا۔" نیز فرمایا: "میں کانگریس کی طرف سے انہیں یقین دلاتا ہوں کہ مسئلہ شہید گنج کے حل کرنے کے لیے ان کی کوششوں میں ہر ممکن امداد کرے گی۔"

〃 ۸ر اپریل: کلکتہ پریذیڈنسی جیل کے سیاسی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں گاندھی جی ان سے ملے اور اس کے بعد مولانا آزاد سے ملے اور تقریباً دو گھنٹے تک تبادلۂ خیالات کیا۔

〃 ۲۲ر اپریل: مولانا آزاد ۲۴ر اپریل کو بمبئی روانہ ہو جائیں گے تاکہ جس وقت مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کے درمیان گفت و شنید ہو تو مولانا کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مولانا آزاد پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے خاص طور پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ کانگریسی وزارتوں میں مسلم وزیروں کو شامل کرنے کے لیے ان کو مشورہ دیں۔ چنانچہ گزشتہ چند مہینوں میں انہوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور مختلف الخیال مسلمانوں کی رائے معلوم کی۔

〃 ۲۵ر مئی: صوبہ سی۔ پی کی وزارت میں جس جمود کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے فضا بہت مکدر ہو گئی تھی۔ مولانا آزاد اور سردار پٹیل کی شرکہ کوششوں سے یہ خطرہ ٹل گیا۔ سردار پٹیل نے اعلان کیا کہ مولانا آزاد ایک دن اور ٹھہریں گے تاکہ دیگر مسائل کو بھی طے کیا جا سکے۔ اور بے جا طرف داری اور اس قسم کے دیگر معاملات کی تحقیقات کی جائے۔

〃 ۸ر جون: مسٹر جناح نے کانگریس پر ہندی نوازی کا جو الزام لگایا ہے، اس کی تردید میں مولانا نے کلکتہ سے ایک طویل اور مدلل بیان جاری کیا ہے جس میں ایک جگہ فرمایا: "کانگریس کا فیصلہ نیز اس کا عمل ذمہ دار مسلم جماعتوں کے عین مطابق ہے۔"

〃 ۱۹ر جون: قانونِ مزارعین کے بارے میں حکومتِ بہار اور زمینداروں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا، اس لیے بہار اسمبلی کا اجلاس

غیر معینہ عرصہ کے لیے ملتوی ہوگیا اور بہار کے وزیر اعظم سری کرشن سہائے نے فوراً ہی فون پر مولانا آزاد سے بات کی اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ مولانا نے وعدہ کیا کہ وہ ۴ جولائی کو پٹنہ آئیں گے۔ اور حکومت اور زمیں داروں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کریں گے۔

" ۵ جولائی : پٹنہ سے مولانا آزاد نے ایک بیان جاری کیا جس کے مطابق ان کی کوششوں سے بہار کی حکومت اور وہاں کے زمیں داروں کے درمیان مکمل سمجھوتہ ہوگیا۔

۱۹۳۸ء ۵ ستمبر : چونکہ ڈاکٹر راجندر پرشاد خرابیٔ صحت کی وجہ سے ہندستانی کمیٹی بہار کے چیرمین کے فرائض انجام نہیں دے سکتے، اس لیے حکومت بہار نے ان کی جگہ مولانا ابوالکلام آزاد کو چیرمین مقرر کیا ہے۔

" ۱۱ دسمبر : آج صبح نو بجے واردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ جس میں مولانا آزاد نے شرکت کی۔

" ۱۲ دسمبر : کل مولانا آزاد کی صدارت میں ہندوستانی کمیٹی بہار کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا جس میں اس سوال پر غور کیا گیا کہ ہندوستانی زبان میں لغت، قواعد، صرف و نحو اور کتابیں تیار کی جائیں۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں زبان کے مسئلے پر بہت ہی تفصیل سے بحث کی ہے۔

" ۲۳ دسمبر : آج صبح کو مولانا آزاد پٹنہ سے الہ آباد تشریف لائے۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو کے یہاں آنند بھون میں قیام پذیر ہیں۔

۱۹۳۹ء : ۱۱ جنوری : آج سہ پہر میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس سبھاش بابو کی صدارت میں باردولی ستیہ گرہ آشرم میں شروع ہوا۔ جس میں مولانا آزاد نے شرکت کی۔

" ۲۰ جنوری : ورکنگ کمیٹی کے جلسے کے بعد کچھ ممبر باردولی میں رہ گئے تھے۔ انہوں نے تری پورہ اجلاس کے صدر کے ناموں پر آپس میں مشورہ کیا۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ موجودہ حالات میں اس کے لیے مولانا آزاد مناسب رہیں گے مگر مولانا اس کے لیے تیار نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنے بجائے ڈاکٹر سیتا رمیّہ کا نام تجویز کیا۔

" ۲۴ جنوری : تری پورہ کانگریس اجلاس کی صدارت کے لیے ورکنگ کمیٹی کے چند ممتاز ممبروں نے، مثلاً سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، جے۔ بی۔ کرپلانی، بھولا بھائی ڈیسائی، وغیرہ نے باردولی میں ایک طویل بیان دیا، جس میں کہا گیا کہ ہمارے لیے بڑے رنج کا مقام ہے کہ مولانا آزاد نے صدارتی انتخاب کی اُمیدواری سے اپنا نام واپس لینا مناسب سمجھا اور ہم سے مشورہ کرکے انہوں نے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیّہ کے نام کی سفارش کی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بہت مناسب ہے۔

" ۲۶ جنوری : کانگریس کے آئندہ صدر کے انتخاب میں جو شدید اختلافات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کے حوالے سے جواہر لال نہرو نے الموڑہ میں ایک طویل بیان دیتے ہوئے فرمایا۔ اس سال کانگریس کی صدارت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد موزوں ترین آدمی ہیں۔ میرے خیال میں وہ ہمارے اہم مسائل کو حل کرنے کے لیے خاص طور سے موزوں ہیں۔ ان کے اندر ایسی لطیف دور اندیشی اور جذبۂ احساس موجود ہے کہ وہ اپنے نظریے کے مقابلے میں دوسروں کے نظریوں کو سمجھنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ وہ کانگریس کے ایک بزرگ مدبر ہیں، جو کا سب احترام اور اعتماد کرتے ہیں۔ اور جو ہم سب کو متحد رکھنے کے لیے موزوں ترین ہیں۔ مولانا آزاد کی معاملہ فہمی اور ان کے تدبر کے متعلق میرے دل میں جو تعریف کا جذبہ موجود ہے وہ گزشتہ بیس سال کے اندر یعنی جب سے انہیں جاننے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے سال بہ سال بڑھتا گیا —— میں نے اور دوسرے لوگوں نے ان پر زور ڈالا کہ وہ صدارت کے لیے کھڑے ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے کھڑا ہونا منظور نہیں کیا۔

" ۱۰ فروری : آج فرنٹیر میل سے مولانا آزاد پشاور پہنچے۔ ۱۳ فروری کو سرحد اسمبلی کی کانگریس پارٹی کی خصوصی میٹنگ میں شریک ہوں گے اور ۱۴ کو صوبہ کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں بھی شرکت فرمائیں گے۔ لاہور سے گزرتے ہوئے مولانا نے لاہور اسٹیشن پر قوم پرست کارکنوں سے ملاقات کی اور اخباری نمائندوں سے بات چیت کی۔

" ۱۶ فروری : مولانا آزاد آج صبح سے رات تک تقریباً گیارہ گھنٹے صوبہ سرحد کے چار وزیروں سے گفت و شنید کی۔ صوبے کے بہت سے انتظامی معاملات پر تبادلۂ خیال کیا۔ نیز سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں اور وزیر اعظم ڈاکٹر خان سے بھی بات چیت کی۔ یہاں کے کاموں سے فراغت کے بعد ۱۸ فروری کو دہلی اور ۱۹ کو واردھا پہنچنا چاہتے ہیں۔

" ۷ مارچ : آج تری پورہ میں اے۔ آئی۔ سی۔ سی کا اجلاس منعقد

ہوا۔ صدر کانگریس سبھاش چندر بوس علالت کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ اس لیے سب سے سینیئر ممبر مولانا آزاد نے جلسے کی صدارت کی۔

۱۹۳۹ء ۱۴ر مارچ: مولانا آزاد دہلی تشریف لا رہے تھے کہ اتفاقاً الٰہ آباد ریلوے اسٹیشن پر کیلے کے چھلکے پر پیر پڑ جانے سے پھسل کر گر گئے۔ اور پیر کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا۔ اسٹریچر پر کار تک لایا گیا اور آنند بھون پہنچا دیا گیا۔

" ۲۴ر مارچ: گاندھی جی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور بعض دیگر قومی رہنما مولانا آزاد کی عیادت کے لیے آنند بھون (الٰہ آباد) تشریف لائے۔ جہاں مولانا زیر علاج ہیں۔

" ۱۳ر اپریل: مولانا آزاد نے جو پیر کے فریکچر کی وجہ سے ابھی تک 'صاحبِ فراش ہیں' کلکتہ میں ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا:
بعض اخبارات میں صدر کانگریس سبھاش بابو کے نام ایک فرضی خط شائع ہوا ہے چونکہ مجھے سبھاش بابو اور گاندھی جی کے درمیان خط و کتابت کی نقل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لیے میں عوام کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مبینہ خط کے بارے میں دہلی رپورٹ کو باور نہ کریں۔ اس رپورٹ میں گاندھی جی سے جو بعض باتیں وابستہ کی گئی ہیں، وہ بالکل غلط ہیں۔

" ۱۹ر اپریل: پیر کے فریکچر کے بارے میں کلکتہ سے مولانا آزاد غلام رسول مہر کو لکھتے ہیں:
"بائیں گھٹنے میں فتور واقع ہونے سے اوپر کے جوڑ کی بڑی ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور نیچے کے جوڑ میں جسے TIBIA کہتے ہیں۔ فریکچر ہو گیا ہے۔ اب پیرس پلاسٹر پورے پاؤں پر چڑھا دیا گیا ہے۔ اور شب و روز چت پڑا رہنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ کم از کم چھ ہفتے تک اسی طرح پڑے رہنا چاہیے — اس کے بعد پلاسٹر کاٹیں گے۔"
اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اپنی مشغولیت کے بارے میں جو فیصلہ کر چکا ہوں، وہ بہرحال فیصلہ ہے۔ اس آخری جملہ پر مولانا مہر نے حاشیے میں لکھا ہے: "فیصلہ یہ تھا کہ وہ سیاست کی عملی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر علمی و دینی کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ زبانی بات چیت ہو چکی تھی۔ میں نے تصدیق مزید چاہی تو فرمایا، کہ فیصلہ پختہ ہے، لیکن رفیقوں کے اصرار کے باعث اپنا فیصلہ ملتوی کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ وہ صدر کانگریس منتخب ہو گئے اور گرفتاریوں کا خطرہ سامنے آ گیا۔ اس حالت میں علیحدگی پر راضی ہو ہی نہ سکتے تھے۔" (نقشِ آزاد۔ ص: ۱۷)

۱۹۳۹ء : ۲ر جون: مولانا نے کلکتہ کے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بیان دیتے ہوئے فرمایا: یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ لکھنؤ میں روز بروز شیعہ سنّی تنازعہ بڑھتا جا رہا ہے اور دونوں فرقے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے دو فرقوں کا باہمی تنازعہ ہے۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم باہم طور پر طے کریں۔ شیعہ ایجی ٹیشن کے تمام لیڈروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ سول نافرمانی کی تحریک معطل کر دیں۔ معطل ہونے کے بعد میں شیعوں اور سنّیوں کی ایک نمائندہ کانفرنس بلاؤں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ ہم باہمی مصالحت سے کسی تصفیہ پر پہنچیں۔" پیر کے فریکچر کی وجہ سے مولانا اب تک صاحبِ فراش ہیں۔

" ۱۲ر جون: مولانا کی اپیل سے متاثر ہو کر شیعہ فرقے کا ایک وفد لکھنؤ کے ایک ریٹائرڈ جج سید اصغر حسین کی سرکردگی میں مولانا سے ملا۔

" ۱۶ر جون: وہ شیعہ وفد جو مولانا آزاد سے ملنے کے لیے کلکتہ گیا تھا آج لکھنؤ واپس آ گیا۔ اس نے بتلایا کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ پہلے ایجی ٹیشن بند کر دیا جائے تو اس کے بعد وہ دونوں فریقوں کی کانفرنس الٰہ آباد میں بلائیں گے۔

" ۱۶ر جولائی: کراچی کی اطلاع کے مطابق وزیر اعلیٰ سندھ خان بہادر اللہ بخش نے فون پر سندھ کی کانگریس پارٹی کی وزارت کے بارے میں مولانا آزاد سے گفتگو کی۔

" ۱۸ر اگست: شیعہ سنّی تنازعہ کو حل کرنے کے لیے مولانا آزاد آج کلکتہ سے بذریعہ بمبئی میل لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ اگرچہ ابھی آپ کی صحت سفر کے لائق نہیں ہے۔ مگر مسئلے کی اہمیت کے پیشِ نظر اس سفر کے لیے تیار ہو گئے۔

" ۲۴ر اگست: پچھلے تین دنوں سے مولانا آزاد تبرّا اور مدحِ صحابہ ایجی ٹیشن کے سلسلے میں جو کوششیں فرما رہے ہیں، اس میں اب کچھ امید کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔

" ۲۸ر اگست: مولانا آزاد کی کوششوں سے شیعہ فرقے نے تبرّا ایجی ٹیشن بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا نے اس کام پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے دونوں فرقوں سے اپیل کی کہ اس فضا کا خیرمقدم

کریں اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں جس سے شہر کی فضا پھر مکدر ہو۔

۱۹۳۹ء : ۱۹ر ستمبر: مولانا نے کلکتہ میں ایک اخباری بیان جاری کرتے ہوئے فرمایا: "دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے ہندوستان کی پوزیشن نہایت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ ایک طرف اسے جمہوری ممالک سے ہمدردی ہے۔ اور دوسری طرف اپنے سیاسی درجے کا خیال ہے ملک کا اتحاد چاہے وہ سیاسی ہو یا فرقہ وارانہ، اس نازک صورتِ حال میں کام یابی کے لیے ضروری ہے۔

۱۸ر ستمبر: شیعہ سنّی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا آزاد کل رات لکھنؤ پہنچے۔ یونائیٹڈ پریس کے نمائندہ کو موجودہ سیاسی صورتِ حال کے متعلق بتایا کہ ایسی حال میں وارِدھا کانگریس نے جو ریزولیشن پاس کیا ہے، وہ ہر لحاظ سے بہترین ہے اگر برطانوی حکومت نے کانگریس کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ براہِ راست کارروائی شروع کی جائے گی

۲۰ر ستمبر: ریاست میسور کے دیوان سر مرزا محمد اسمٰعیل نے شیعہ سُنّی تنازعے کے سلسلے میں مولانا آزاد کو ایک خط لکھا ہے جس میں مولانا آزاد پر اعتمادِ کلی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "لکھنؤ میں بد قسمتی سے شیعہ اور سُنّی جماعتوں کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کا تصفیہ کرنے کے لیے آپ سے زیادہ موزوں شخص ہندوستان بھر میں نہیں ہے۔"

۲ر اکتوبر: کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے آج صبح مولانا لکھنؤ سے دہلی تشریف لائے۔ آپ کا قیام آصف علی صاحب کے یہاں ہے۔

۲۷ر اکتوبر: شیعہ سنّی کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا آزاد لکھنؤ تشریف لائے۔ کانفرنس میں تنازعہ کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا گیا اور کل تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

۱۴ر نومبر: سر سید وزیر حسن کی صدارت میں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں شیعہ سُنّی تنازعہ کے حل کے سلسلے میں مولانا آزاد کی کوششوں کو سراہا گیا اور اس پر افسوس ظاہر کیا گیا کہ کانگریسی وزیروں کے اچانک مستعفی ہونے کی وجہ سے مولانا کی ان کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

۱۷ر نومبر: کلکتہ کے یونائیٹڈ پریس کو معلوم ہوا ہے کہ مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک موثر اور کارآمد فارمولا تیار کیا ہے جسے وہ ۱۹ر نومبر کو کانگریس ورکنگ کمیٹی میں رکھیں گے۔

〃 ۲۰ر نومبر: الٰہ آباد کے ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: ہمیں اگلا قدم اٹھاتے وقت اپنے پچھلے تجربے سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں احتیاط کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ پچھلے سوا دو سال میں ہم نے کیا کام کیا۔ ایک سال تک ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہم نے وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کیا ــــ مگر جب موقع آیا تو وزیروں کو ان کے عہدوں سے واپس بلانے میں ۲۴ گھنٹے بھی نہیں لگے۔

〃 ۲۹ر نومبر: گزشتہ مارچ میں الٰہ آباد کے پلیٹ فارم پر مولانا آزاد کے پیر کا جو فریکچر ہوا تھا، اس کے بارے میں اُن کے معالج ڈاکٹر بی۔ رائے نے آج معائنہ کرنے کے بعد کلکتہ میں کہا کہ گھٹنے کی چوٹ کے اثرات برابر چلے آرہے ہیں۔ حال میں اُن کی تکلیف بڑھ گئی ہے اور بعض اوقات تو چند منٹ چلنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بجلی کے علاج اور زیادہ سے زیادہ آرام کا مشورہ دیا ہے۔

۲ر دسمبر: مولانا آزاد ہندوستانی کمیٹی بہار کے جلسے میں شرکت کے لیے پٹنہ تشریف لائے۔ قیام ڈاکٹر سیّد محمود کے یہاں ہے ــ جلسے کے بعد دہلی ہوتے ہوئے لاہور تشریف لے گئے۔

〃 ۱۸ر دسمبر: آج صبح واردھا میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ صدر کانگریس ڈاکٹر راجندر پرشاد بیماری کی وجہ سے اس وقت تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اس لیے ان کی بجائے مولانا آزاد نے صبح کے اجلاس کی صدارت کی۔

۱۹۴۰ء : ۳ر فروری: ناگ پور ریلوے اسٹیشن پر کانگریس کے آئندہ صدر کے متعلق گفتگو شروع ہوئی تو گاندھی جی نے فرمایا: موجودہ حالات میں کانگریس کی صدارت کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد ہی سب سے زیادہ موزوں شخصیت ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ ان کا انتخاب متفقہ طور پر ہوگا۔

〃 ۴ر فروری: کانگریس کے جنرل سکریٹری آچاریہ کرپلانی نے اعلان کیا کہ رام گڑھ سیشن کی صدارت کے لیے نام زدگیاں بھیجنے کی آج آخری تاریخ تھی۔ اور اس کے لیے صرف دو ناموں کی تجاویز موصول ہوئی ہیں۔ ایک مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے۔

اور دوسرے ایم۔ این رائے کے لیے۔

" ۱۲ر فروری: جے پرکاش نرائن نے کانگریس کے صدارتی انتخاب میں مولانا آزاد کی حمایت کا اعلان کیا۔ اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ مولانا کو ووٹ دیں۔

" ۱۵ر فروری: آج کانگریس کی صدارت کے لیے الکشن ہوا۔ اور ایم۔ این۔ رائے کے مقابلے میں ۱۸۳ ووٹ کے مقابلے میں ایک ہزار آٹھ سو گیارہ ووٹ سے مولانا آزاد جیت گئے ۔۔ (دی انڈین اینوئل رجسٹر جلد اول ۱۹۴۰ء) مولانا نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے"۔ دراصل صدر کے انتخاب کا کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔ ایم۔ این۔ رائے جو میرے خلاف کھڑے ہوئے تھے بہت سے ووٹوں سے ہار گئے۔ (ہماری آزادی۔ ص: ۱۰۱)

" ۱۸ر فروری: صدر منتخب ہونے کے بعد مولانا پہلی مرتبہ لاہور تشریف لائے تو وہاں کے اخبار نویسوں نے ان سے ملاقات کی اور بہت سے سوالات کیے۔ ان میں سے ایک سوال کے جواب میں مسٹر جناح کے دو قومی نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "میں اس نظریے کو صحیح تسلیم نہیں کرتا۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم ہے، دو نہیں"۔

بیرون دہلی دروازہ لاہور میں مولانا آزاد کے استقبال کے لیے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا کی شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔

" ۲۸ر فروری: کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شرکت کے لیے مولانا آزاد ٹھیک نو بجے صداقت آشرم پٹنہ پہنچے۔

" ۱۵ر مارچ: آج صبح کانگریس کے منتخب صدر مولانا آزاد کلکتہ سے رام گڑھ پہنچ گئے۔ اور ڈھائی تین ہزار والنٹیر...... ...... ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر) سروجنی نائیڈو نے پُرتپاک استقبال کیا اور والنٹیر نے سلامی دی۔

" ۱۹ر مارچ: سبجکٹ کمیٹی نے قومی ترانے کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "۳۰ برس پہلے کلکتہ میں اے آئی سی سی کے سامنے یہ مسئلہ آیا تھا اور اس پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی گئی تھی مگر قومی گیت کبھی کوئی کمیٹی نہیں بناتی۔ "بندے ماترم" کا گیت ۳۰ برس سے برابر گایا جا رہا ہے اور اس طرح سے اس نے قومی گیت کی جگہ حاصل کر لی ہے"۔

" ۲۰ر مارچ: کانگریس کا ترپنواں (۵۳ واں) اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں کل شام کو شروع ہونے والا تھا۔ مگر موسلا دھار بارش کی وجہ سے کل کی بجائے آج شروع ہوا۔ اور مولانا آزاد نے یادگار خطبہ پڑھا۔ اور اپنی نئی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کا اعلان کیا۔

" یکم اپریل: آج کل مولانا آزاد الٰہ آباد میں ہیں۔ اور ممتاز قومی رہنماؤں سے اہم سیاسی مسائل پر مشورہ کر رہے ہیں۔

" ۳ر اپریل: پریس کے ایک نمائندہ نے مسٹر جناح کے دو قومی نظریے کے متعلق مولانا آزاد سے ان کی رائے دریافت کی۔ جس کے جواب میں مولانا نے فرمایا۔ میں اس کو اس قدر لغو اور بے معنی سمجھتا ہوں کہ کچھ کہنے کے لیے بھی طبیعت راغب نہ ہوئی۔

" ۵ر اپریل: تعلیمی تربیت کیمپ (الٰہ آباد) کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: ہم نے گاندھی جی کی لیڈر شپ اور ان کے طریق کار کو تسلیم کر لیا اور اسی میں ملک و قوم کا بھلا ہے۔

" ۱۰ر اپریل: آج صبح مولانا کلکتہ پہنچ گئے۔

" ۱۲ر اپریل: آج رات کو مولانا بمبئی میل سے واردھا کے لیے روانہ ہو گئے۔

" ۱۳ر اپریل: آج شام کو واردھا میں گاندھی جی کے سکریٹری مہادیو ڈیسائی اور دوسرے حضرات نے مولانا کا خیر مقدم کیا۔ راستے میں ناگ پور سے گزرتے ہوئے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "اس وقت کانگریس ایک عظیم جدوجہد کے دہانے پر کھڑی ہے"۔

" ۱۵ر اپریل: آج واردھا میں مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ممتاز رہنماؤں کے علاوہ گاندھی جی نے بھی شرکت کی۔

" ۱۸ر اپریل: آج مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا چار روزہ اجلاس ختم ہو گیا۔ جس میں رام گڑھ کے اجلاس کے بعد جو سیاسی حالات پیدا ہوئے تھے۔ ان پر سنجیدگی اور تفصیل سے غور کیا گیا اور فیصلے کیے گئے۔

" ۲۰ر اپریل: لکھنؤ میں شیعوں اور سُنّیوں میں تبرّا اور مدح صحابہؓ کا جو جھگڑا چل رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے واردھا میں ایک طویل اخباری بیان جاری کیا، جس میں انہوں نے سُنّیوں سے اپیل کی کہ وہ سارے مسئلے کو معقولیت کی نظر سے

دیکھیں اور ایسا طرز اختیار کریں جس سے دونوں فرقوں میں بھائی چارہ اور یگانگت پیدا ہو۔

״ ۲۲ اپریل : واردھا میں نمائندہ ایوسی ایٹیڈ پریس کو ایک بیان دیا جس میں لارڈ زٹلینڈ وزیر ہند کو جواب دیتے ہوئے فرمایا "کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی ہے۔ اور یہ مقصد مکمل فرقہ وارانہ اتحاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ دونوں چیزیں ایسی اسمبلی ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں جو عوام کی حقیقی نمائندہ ہو۔"

״ ۴ مئی : آج شب کو پنجاب میل سے مولانا آزاد نینی تال کے لیے روانہ ہو گئے۔

״ ۱۳ مئی : معلوم ہوا کہ آج کل مہادیو ڈیسائی مولانا آزاد کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔

״ ۱۷ مئی : نینی تال سے مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری نے اخبارات کو یہ اطلاع بھیجی کہ مولانا اپنی صحت کی خاطر یہاں جولائی تک قیام کریں گے۔ سوائے اس کے کہ کوئی ناگہانی صورت پیدا ہو جائے۔

״ ۲۵ مئی : مولانا نے وزیر ہند مسٹر ایمرے کے بیان کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "یہ امر افسوسناک ہے کہ ہندوستان سے متعلق وزارت برطانیہ کے نقطۂ نگاہ میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وزیر ہند نے اُسی رویے کو دہرایا ہے جس کے متعلق کانگریس اپنے نقطۂ نظر کو کئی بار بیان کر چکی ہے۔"

״ ۱۱ جون : مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کا جلسہ واردھا میں شروع ہوا۔ جس نے موجودہ صورتِ حال کے متعلق ایک طویل بیان جاری کیا۔

״ ۱۴ جون : نینی تال کے لیے روانگی سے قبل مولانا نے فرمایا: "کانگریس کو گاندھی جی کی رہنمائی حسبِ معمول حاصل رہے گی۔"

״ ۲۴ جون : آج شام مولانا دہلی سے نینی تال کے لیے روانہ ہو گئے روانگی سے پہلے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے فرمایا "موجودہ جمود اور تعطل زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہے گا۔" مولانا نے اُمید ظاہر کی کہ دو ہفتے کے اندر اندر جنگ کی صورتِ حال فیصلہ کن رُخ اختیار کرے گی اور ہم یہ جاننے کے قابل ہو سکیں گے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اگر کانگریس اس نتیجے پر پہنچی کہ جدوجہد کرنی چاہیے تو وہ گریز نہ کرے گی۔

۱۹۴۰ء ۷ جولائی : آج صبح کو برلا ہاؤس دہلی میں مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے بعد وزیر اعظم پنجاب سر سکندر حیات خاں نے مولانا سے تنہائی میں ملاقات کی۔ بعد میں موصوف نے اخبارات کے نمائندوں کو بتایا کہ وہ پنجاب کی تازہ گرفتاریوں کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے آئے تھے۔

״ ۸ جولائی : نئی دہلی کے ایک جلسے میں مولانا نے مکمل آزادی کے سلسلے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولیشن کی وضاحت کی۔

״ ۱۱ جولائی : کانگریس ورکنگ کمیٹی کی منظور شدہ قرارداد کی وضاحت کرتے ہوئے نینی تال میں مولانا نے فرمایا: "اگر ہندوستان کے مطالبے پورے کر دیے گئے تو جنگ میں حصہ لینا ہندوستان کا فرض ہو گا۔"

״ ۱۳ جولائی : آج دہلی میں اس کا انکشاف ہوا کہ مولانا آزاد نے مسٹر ایم۔ اے۔ جناح کو ایک خفیہ تار بھیجا تھا، جس میں لکھا تھا: "آپ کا ۹ جولائی کا بیان پڑھا۔ کانگریس کے دہلی والے ریزولیوشن میں قومی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ مشترکہ کیبنٹ' یہ کسی ایک پارٹی تک محدود نہیں ہو گی۔ کیا لیگ کی یہ پوزیشن ہے کہ وہ کسی ایسے عارضی انتظام پر رضامند ہو جو دو قوموں کی اسکیم پر مبنی نہ ہو؟" اس کے جواب میں مسٹر جناح نے مولانا سے کسی قسم کی گفتگو یا مراسلت سے انکار کر دیا۔

״ ۲۲ جولائی : واردھا جاتے ہوئے دہلی میں پریس کے نمائندوں سے مولانا نے فرمایا: "مجھے تاسف نہیں ہے کہ میں نے مسٹر جناح کو کوئی تار دیا' وضاحت کرتے ہوئے مزید فرمایا: "میں نے محض اپنی شخصی حیثیت سے ان کے ایک بیان کی وضاحت کے لیے دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ لیگ اور کانگریس کے درمیان کسی قسم کی گفت و شنید جاری ہے۔"

״ ۲۵ جولائی : آج سہ پہر میں مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ واردھا میں منعقد ہوا۔ اور اہم سیاسی مسائل پر غور کیا گیا۔

״ ۲۷ جولائی : آج بعد دوپہر پونہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس مولانا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنی افتتاحی تقریر میں بہت تفصیل سے کانگریس کی پچھلی کارروائیوں اور فیصلوں پر تبصرہ کیا۔

״ ۲۹ جولائی : کانگریس ورکنگ کمیٹی نے مولانا کو یہ اختیار دیا کہ وہ کانگریس کا آئندہ اجلاس جس صوبے میں چاہیں کر سکتے ہیں۔ مولانا

آج رات بمبئی جا رہے ہیں، وہاں سے کلکتہ جائیں گے اور راستے میں ایک روز کے لیے وارد ھا میں ٹھہریں گے۔

۱۹۴۲ء : ۲۱ جولائی : آج بمبئی کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے فرمایا : "گاندھی جی کی رہ نمائی کو برقرار رکھنے کے لیے کانگریس نے انتہائی کوشش کی، مگر اب تک کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔ اگر آئندہ جدوجہد میں کانگریس کو گاندھی جی کی رہ نمائی حاصل نہ ہو سکی اور ضروری ہوا تو کانگریس کی رہ نمائی کا بار خود اپنے کاندھوں پر لے لوں گی۔"

" اگست : وائسرائے نے مولانا کو اس تجویز پر گفتگو کرنے کی دعوت دی کہ ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کی تعداد اور اس کے اختیارات بڑھا دیے جائیں، تاکہ کانگریس حکومت میں شریک ہو سکے۔ مولانا نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر اس پیش کش کو نامنظور کر دیا۔ مولانا نے لکھا ہے : "مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے کانگریسی میرے فیصلے سے متفق نہیں تھے۔" (ہماری آزادی۔ ص: ۷۷،۷۸)

" ۵ر اگست : مولانا نے بحیثیت صدر کانگریس، پنجاب اسمبلی کے لیڈر سردار کمپوران سنگھ سے پٹیالہ کے سانحے کی وضاحت طلب کی۔

" ۲۶ر اگست : مولانا نے تمام صوبجاتی کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت دی کہ وہ وائسرائے کے اعلان اور دارالعوام (لندن) میں وزیر ہند مسٹر ایمری کے بیان کی مخالفت کریں۔

" ۵ر ستمبر : کلکتہ کے مارواڑی طالب علموں کے ایک جلسے میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا : "کانگریس نے مرکز میں قومی حکومت قائم کرنے کا جو مطالبہ کیا تھا۔ اس کے متعلق برطانوی حکومت کے رویے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس کے ہاتھ میں جو طاقت ہے، اس سے وہ دست بردار نہیں ہونا چاہتی۔" آج رات کو مولانا دہلی میل سے الہ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

" ۱۰ر ستمبر : الہ آباد یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا : "ہم ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں پرانا نظام مردہ ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی سامراجی اور درجہ نو آبادیات کا تخیل بھی مردہ ہو چکا ہے۔"

" ۱۳ر ستمبر : مولانا آج صبح بمبئی پہنچے اور ان کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ دو بجے سہ پہر میں شروع ہوا اور ۸ بجے رات تک جاری رہا۔ اس جلسے میں گاندھی جی نے موجودہ سیاسی حالات پر طویل تقریر کی۔

۱۹۴۰ء : ۱۵ر ستمبر : اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے جلسے میں مولانا نے اعلان کیا کہ : "گاندھی نے حسب معمول کانگریس کی رہ نمائی کا وعدہ کر لیا ہے۔"

" ۱۷ر ستمبر : آج مولانا کی صدارت میں تمام پراونشل کانگریس کمیٹیوں، پریذیڈنٹوں، جنرل سکریٹریوں اور کانگریسی صوبوں کے سابق وزیروں کی ایک اہم کانفرنس بند کمرے میں منعقد ہوئی۔ جس میں تقریباً سو کانگریسی نمائندوں نے شرکت کی۔ تقریباً ۹۰ منٹ کی بے ضابطہ بات چیت کے اختتام پر مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا : "تیار رہو، ہر طرح چوکس رہو، مہاتما گاندھی پر مکمل اعتماد رکھو اور ان کے پیچھے پختہ ارادے کے ساتھ چلو۔"

" یکم اکتوبر : مولانا نے کلکتہ میں گاندھی وائسرائے ملاقاتوں کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کے ان تاریخی الفاظ کو دہرایا : "اب ہمارے سامنے صرف ایک ہی باوقار راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جنگ کے متعلق اپنے خیالات کا کھلے بندوں اظہار کریں۔"

" ۲ر اکتوبر : گاندھی جینتی کے موقع پر لکھنؤ کے کانگریسی کارکنوں کے ایک جلسے میں مولانا نے فرمایا : "قوم کی زندگی کے اس نازک وقت میں متحد ہو جاؤ اور اپنے آپ کو مضبوط بناؤ۔"

" ۸ر اکتوبر : مولانا نے ایک اخباری بیان میں فرمایا : "انضباطی کارروائی کے تحت سبھاش چندر بوس کو کانگریس پارٹی سے خارج کر دیا گیا ہے۔"

" ۱۱ر اکتوبر : مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دو روزہ اجلاس وارد ھا میں شروع ہوا جس میں آئندہ تحریک شروع کرنے کے مسائل پر غور کیا گیا۔

" ۸ر نومبر : مولانا نے اخبارات کے لیے ایک بیان جاری کیا جس میں فرمایا : "موجودہ حالات میں مہاتما گاندھی کے برت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

" ۹ر نومبر : آج صبح مولانا دہلی کے لیے ناگپور سے گزرتے ہوئے نمائندہ پریس کو ایک انٹرویو دیا، جس میں فرمایا : "مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی صرف جنگی فائنس بل میں حصہ لینے کے لیے شریک ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی اور کارروائی میں حصہ نہیں لے گی۔"

" ۱۹ر نومبر : مولانا کراچی تشریف لے گئے اور سیاسی مسائل پر لوگوں سے تبادلۂ خیال کے لیے چند روز قیام کریں گے۔ اس کے بعد سکھر کے مصیبت زدہ علاقے کے دورے کے لیے تشریف لے جائیں گے۔

۱۹۴۰ء : ۲۰؍ نومبر: آج رات کو کراچی کے کانگریسی کارکنوں کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "صوبہ سندھ کے موجودہ حالات کی ذمہ داری یہاں کی مختلف سیاسی پارٹیوں پر عائد ہوتی ہے، مگر چونکہ کانگریس ایک بڑی سیاسی پارٹی ہے، اس لیے صوبے میں امن و امان کے قیام کی ذمہ داری سے وہ اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتی۔"

〃 ۲۴؍ نومبر: مولانا نے کراچی میں ایک طویل بیان جاری کیا جس میں فرمایا: "میری کوششوں سے سندھ میں وزارت قائم کی گئی ہے جس میں تمام پارٹیوں کی نمائندگی ہوتی ——— موجودہ کشیدہ صورتِ حال میں میرے خیال میں اس سے بہتر اور اس سے زیادہ مستحکم وزارت کا قیام مشکل تھا۔"

〃 ۲۵؍ نومبر: مولانا نے کراچی میں ہندو مسلم یونٹی بورڈ کا افتتاح کیا۔

۲۶؍ نومبر: لاہور کے اخباری نمائندوں سے انٹرویو کے دوران مولانا نے اس خبر کی تردید کی۔ صدر کانگریس پنجاب میں کولیشن وزارت بنانے اور میاں افتخار الدین صدر صوبہ کانگریس کمیٹی اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے مل کر ستیہ گرہ ملتوی کرانے کے لیے آ رہے ہیں۔ مولانا نے اس خبر کو مہمل قرار دیا۔

〃 ۲۸؍ نومبر: آج صبح مولانا اور گاندھی جی میں ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی، جسے سیاسی حلقوں میں بڑی اہمیت دی جا رہی ہے آج شام مولانا دہلی سے وار دھا کے لیے گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے روانہ ہو رہے ہیں۔

〃 ۳۰؍ نومبر: آج صبح مولانا نے گاندھی جی سے دو گھنٹے سے زیادہ بات چیت کی۔ مولانا نے فرمایا: "ابھی گفتگو مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ۲½ بجے پھر ہوگی۔"

〃 یکم دسمبر: وار دھا میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "ہماری تحریک کی پشت پر کئی کروڑ ہندوستانی ہیں۔ جس کا ملک اور بیرون ملک بہت زبردست اثر پڑے گا۔

〃 ۸؍ دسمبر: آج صبح مولانا پٹنہ تشریف لائے اور سہ پہر میں بہار صوبہ کانگریس کمیٹی کے ممبروں اور دوسرے کارکنوں سے ملاقات کی اور کانگریس کے عملی پروگرام پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی وضاحت کی۔

〃 ۲۵؍ دسمبر: لاہور کے لیے روانہ ہوتے وقت وائسرائے کی اسپیچ ایڈنبرا چیمبر آف کامرس کی تقریر اور ہندوستان کے متعلق برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے یونائٹیڈ پریس کے نمائندے سے کہا: "ان میں کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے جس کی وجہ سے کانگریس اپنا موجودہ طرزِ عمل بدلے ستیہ گرہ کے بارے میں مولانا نے فرمایا: "۶؍ جنوری سے اس میں اور وسعت پیدا ہوگی۔

〃 ۲۷؍ دسمبر: کلکتہ سے لاہور جاتے ہوئے جب مولانا دہلی پہنچے تو بہت بڑی تعداد میں لوگ ان سے ملنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ مولانا نے ان سے فرمایا: "مجاہدینِ آزادی کے لیے آج جیل کے دروازے کھل گئے ہیں اور نئی بات یہ ہے کہ نیچے کی کڑیوں کی بجائے اونچی کڑیوں سے ستیہ گرہ شروع کیا گیا ہے۔

〃 ۲۸؍ دسمبر: آج چھ بجے شام لاہور کے تقریباً ۵۰ ہزار کے مجمع میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "صوبہ پنجاب کے کانگریسی کارکنوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی، اس کی بنیاد پر ذمہ داری سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ صوبہ پنجاب ان تمام شرطوں پر اسی طرح مضبوطی سے قائم ہے جس طرح ہندوستان کے باقی صوبے۔"

〃 ۳۰؍ دسمبر: مولانا نے لاہور میں ایک انٹرویو میں فرمایا: "اگر ہندوستان پر کل حملہ کر دیا جاتا ہے تو اگر اپنے ملک کی مدافعت کے لیے میرے پاس کوئی اور صورت باقی نہیں رہتی تو میں بلا تامل جنگ کے میدان میں کود پڑوں گا اور ایک لمحے کے لیے بھی ہتھیار کے استعمال میں تامل نہ کروں گا۔"

〃 ۳۱؍ دسمبر: آج صبح فرنٹیئر میل سے مولانا لاہور سے دہلی پہنچے اور مسٹر آصف علی کے مکان پر تشریف لے گئے۔

۱۹۴۱ء : یکم جنوری: آج شام کو جامع مسجد سے ملحق اردو پارک میں ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "ہندوستان ایک نازک سیاسی منزل سے گزر رہا ہے۔ قومی زندگی کا بنیادی مسئلہ موجودہ جنگ ہے۔ جس میں ہمارے ملک کو اس کی مرضی کے بغیر شریک کر لیا گیا ہے۔"

〃 ۳؍ جنوری: آج صبح سوا پانچ بجے مولانا دہلی سے الہ آباد پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر انھیں گرفتار کر کے نینی جیل پہنچا دیا گیا۔ ان کی یہ گرفتاری الہ آباد کی ایک تقریر مورخہ ۱۲؍ دسمبر ۱۹۴۰ء کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ وارنٹ ۲۹؍ دسمبر ۱۹۴۰ء کو جاری کیا گیا تھا۔

〃 ۸؍ جنوری: سٹی مجسٹریٹ الہ آباد نے ڈیفنس آف انڈیا رولز

دفعہ ۳۸ (۵) کے تحت ڈیڑھ سال قید محض کی سزا دی گئی۔
مقدمہ کی سماعت نینی جیل میں ہوئی۔

۱۹۴۱ء ۲۸ نومبر: نینی جیل (الہ آباد) سے رہا ہونے والے قیدیوں سے معلوم ہوا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک معزز رکن مولانا سے ملاقات کے لیے جیل خانے میں تشریف لے گئے تو ایک پولیس انسپکٹر ملاقات کے وقت موجود تھا اور دونوں لیڈروں کی گفتگو کو نوٹ کر رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس قسم کی کارروائی کی گئی تھی۔ مولانا نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور فرمایا: "میں ملاقات کی سہولت کو ترک کرنے کے لیے تیار ہوں مگر یہ برتاؤ ناقابلِ برداشت ہے۔"

" ۴ دسمبر: آج بعد دوپہر مولانا نینی جیل (الہ آباد) سے رہا کر دیے گئے۔ مولانا ٹھیک ساڑھے چار بجے شام کو جیل سے باہر نکلے، جہاں ان کا شاندار خیرمقدم کیا گیا۔ وہ جیل سے سیدھے آنند بھون گئے۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے نے مولانا سے انٹرویو لینے کی خواہش کی تو انہوں نے انکار کر دیا۔

- ۱۴ دسمبر: مولانا نے کلکتہ کے نمائندۂ ایسوسی ایٹڈ پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا۔ اب جبکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبر رہا ہو چکے ہیں، میں نے ۲۳ دسمبر کو باردولی میں ورکنگ کمیٹی کا جلسہ طلب کیا ہے۔" مولانا نے مزید فرمایا: "اب پورے چودہ مہینے کے بعد ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ اس اثنا میں ایک بھی واقعہ ایسا نہیں ہوا جس سے برطانوی حکومت کے رویّے میں کسی تبدیلی کا اظہار ہوتا ہو۔"
- ۱۹ دسمبر: آج شام کو بمبئی کے چوپاٹی کے میدان میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "برطانوی حکومت کے موجودہ سخت رویّے کی موجودگی میں کسی خوددار ہندوستانی کے ذہن میں اپنا رویّہ بدلنے کا خیال تک نہیں آ سکتا۔ ہم وہاں ہی ہیں، جہاں چند مہینے پہلے تھے۔ جب ہم گرفتار ہوئے تو کوئی رنج نہ ہوا اور جب رہا ہوئے تو کوئی خوشی نہ ہوئی۔"
- ۲۳ دسمبر: مولانا کی زیرِ صدارت کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ سوراج آشرم باردولی میں منعقد ہوا۔ اور ملک کی سیاسی صورتِ حال پر تقریباً چھ گھنٹے تک غور کیا گیا۔

۱۹۴۲ء: ۲ جنوری: مولانا نے ایک پریس کانفرنس منعقدہ بمبئی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "باردولی کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لیے جاتے وقت میں نے بمبئی میں کہا تھا کہ پچھلے چودہ مہینوں میں ملک کے حالات اور جنگ کی صورتِ حال میں کوئی ایسی بنیادی تبدیلی نہیں آئی ہے، جس کی وجہ سے کانگریس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئے۔ آج بھی اسی بات کو دہراتا ہوں۔

۱۹۴۲ء: ۱۵ جنوری: اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے جلسہ منعقدہ واردھا میں مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا: "اگر برطانوی حکومت فوری طور پر قومی حکومت کے قیام کا اعلان کر دے تو کانگریس جنگ میں اس کی مکمل حمایت کرے گی۔

- ۱۷ جنوری: مولانا نے ایک بیان میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: کانگریس نے حکومتِ برطانیہ سے آنریبل سمجھوتہ کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔"
- ۳۰ جنوری: پٹنہ کے ایک زبردست جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے مولانا نے جنگ کے بارے میں حکومتِ ہند کے طرزِ عمل پر سخت تنقید کی۔
- ۶ فروری: دہلی کی صوبائی کانگریس ورکنگ کمیٹی منعقدہ نئی دہلی میں مولانا نے باردولی ریزولیشن کی وضاحت کی۔
- ۲۳ فروری، مولانا نے ایک بیان میں پنجاب کے کچھ کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری پر حکومت کی مذمت کی۔
- ۲۷ فروری: کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں مولانا نے جنگ کے بارے میں کانگریس کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔
- ۱۱ مارچ: رات کے آٹھ بجے بی بی سی کی خبروں سے معلوم ہوا کہ کرپس مشن ہندوستان آ رہا ہے تو اس کے ایک گھنٹے کے اندر اندر اخبار کے نمائندے مولانا سے ملے اور ان کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا نے فرمایا: "میں اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتا جب تک کہ مجھے اس تجویز کی صحیح تفصیلات معلوم نہ ہوں جو سر اسٹیفرڈ کرپس پیش کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ مگر ایک پرانے دوست کی حیثیت سے میں ان کا خیرمقدم کروں گا۔ اور جہاں تک ممکن ہوگا، ان کی رائے کو مان لوں گا۔"
- ۱۹ مارچ: مولانا کو وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری کا تار ملا۔ کہ سر اسٹیفرڈ کرپس کانگریس کے نمائندوں سے ۲۹ مارچ یا اس کے آس پاس کسی تاریخ کو ملنا چاہتے ہیں۔
- ۲۲ مارچ: خلافت کمیٹی کا سہ روزہ تیرھواں اجلاس لاہور میں

بصدارت مولانا حسین احمد مدنی منعقد ہوا جس کے آخری اجلاس میں مولانا آزاد نے تقریر کی، انہوں نے فرمایا: "انگریزی حکومت کے خلاف جو چولہا دہک رہا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس میں لکڑیاں ڈالوں۔"

۲۵ مارچ: کرپس مشن کے آنے کے بعد آج پہلی مرتبہ سر اسٹیفرڈ کرپس مولانا سے ملے۔

۲۹ مارچ: مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا، جس کا سلسلہ ۱۱ اپریل تک چلتا رہا۔ مولانا کے الفاظ میں: "گاندھی جی پہلے دن سے ان تمام تجویزوں کے خلاف تھے جو منظوری کے لیے پیش کی گئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا سبب یہی نہیں تھا کہ وہ تجویزوں کو قابلِ اعتراض سمجھتے تھے، بلکہ اس سے موثر وجہ جنگ سے نفرت تھی۔ ایسی ہر بات سے جو ہندوستان کو جنگ میں الجھا دیتی، انہیں خلقی اور ازلی عداوت تھی۔"

یکم اپریل: مولانا نے کرپس سے دوبارہ ملاقات کی۔ مولانا لکھتے ہیں: "یہ ملاقات فیصلہ کن تھی۔ ہم کوئی تین گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ پہلی ملاقات کے بعد سے اس وقت تک سر اسٹیفرڈ کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اب وہ جو جواب دے رہے تھے، ان کی کیفیت پہلی ملاقات کے جوابوں سے بالکل مختلف تھی۔"

〃 ۱۱ اپریل: مولانا نے پریس کانفرنس منعقدہ دہلی میں سر اسٹیفرڈ کرپس سے بات چیت کی وضاحت کی۔

〃 ۲۷ اپریل: مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ جس میں سیاسی صورتِ حال پر غور کیا گیا۔

〃 ۳۰ اپریل: اے۔ آئی۔ سی۔ سی کی میٹنگ کے موقع پر پرچم کشائی کی رسم ادا کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "غیر ملکی جھنڈے کو اپنی سرزمین سے ہٹانے کے لیے ہم اپنی جانیں قربان کرنے سے دریغ نہ کریں گے۔"

۸ مئی: مولانا نے ایل۔ ایس۔ ایمرے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے بیان پر جو دارالعوام میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ضبط شدہ ریزولیشن کے بارے میں دیا گیا تھا، تبصرہ کیا۔

۸ جولائی: مولانا کی صدارت میں سیوا گرام میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ جس میں ملک کی سیاسی صورتِ حال پر غور کیا گیا۔

〃 ۱۷ جولائی: نئی دہلی میں یونائیٹڈ پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "کانگریس اس سے کم پر کسی طرح راضی نہیں ہوگی کہ فوری طور پر آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ اور حکومت ہندوستان کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔"

۱۹۴۲ ، ۲۰ جولائی: نئی دہلی میں اخبارات کو بیان دیتے ہوئے مولانا نے برطانوی حکومت سے بات چیت کی وضاحت کی۔

〃 ۲۸ جولائی: نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے برطانیہ اور امریکہ کے ان تبصروں کا ذکر کیا، جن میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن پر غور کیا گیا تھا۔ خاص طور پر سر اسٹیفرڈ کرپس کی اس تقریر کا ذکر کیا جو امریکہ کے لیے نشر کی گئی تھی۔ مولانا نے امریکہ سے کہا کہ وہ برطانیہ پر زور دے کہ وہ جلد سے جلد اقتدار ہندوستان کو منتقل کر دے۔

〃 ۴ اگست: کانگریس ورکنگ کمیٹی اور اے آئی سی سی کے جلسوں کی صدارت کے لیے مولانا کلکتہ سے بمبئی پہنچے اور ورکنگ کمیٹی کا جلسہ اسی روز شروع ہو گیا۔

〃 ۷ اگست: دوپہر سے مولانا کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ شروع ہوا اور ۸ کی رات کو گیارہ بجے تک جاری رہا۔ اور بالآخر "ہندوستان چھوڑ دو" کے تاریخی فیصلے کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

〃 ۹ اگست: مولانا سو رہے تھے کہ انہیں جگا کر اطلاع دی گئی کہ ڈپٹی کمشنر ان کی گرفتاری کا وارنٹ لایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ڈپٹی کمشنر سے کہہ دیا جائے کہ "مجھے تیار ہونے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔" اس کے بعد مولانا نے غسل کیا اور کپڑے پہنے۔ اپنے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں کو ضروری ہدایات دیں۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر کے پاس آئے اور فرمایا "میں تیار ہوں۔" اس وقت پانچ بجے تھے۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے نو ممبروں اور مولانا کو قلعہ احمد نگر میں نظربند کیا گیا۔

۱۹۴۳ء: ۹ اپریل: مولانا کی اہلیہ زلیخا بیگم کا کلکتہ میں انتقال ہوا۔

۱۹۴۴ء: مولائی: مولانا آزاد نے جب یہ خبر پڑھی کہ گاندھی جی مسٹر جناح سے خط و کتابت کر رہے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے بمبئی جا رہے ہیں تو مولانا نے اپنے نظربند ساتھیوں سے کہا: "گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا یہ اقدام کسی مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ہندوستانی سیاست کو اور بگاڑ دے گا۔" مولانا نے لکھا ہے:
"بعد کے واقعات نے میرے اس خدشے کی تصدیق کر دی۔"

۱۹۴۵ء : اپریل (اوائل) مولانا کو قلعۂ احمد نگر سے بانکورہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

" ۱۵ر جون : مولانا کو بانکورہ جیل سے رہا کر دیا گیا اور وہ کلکتہ ایکسپریس سے پانچ بجے شام کو روانہ ہوئے اور دوسرے روز صبح کو کلکتہ پہنچے۔

" ۱۸ر جون : بنگال گورنر کی معرفت مولانا کو وائسرائے کا دعوت نامہ ملا کہ وہ ۲۵ر جون کو شملہ میں مختلف رہنماؤں کی کانفرنس میں شرکت فرمائیں۔

" ۲۰ر جون : مولانا نے کلکتہ میں ایک انٹرویو کے دوران فرمایا : "وائسرائے کی تجاویز میں اگزیکٹو کمیٹی کے ممبروں کے انتخاب کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ اگر شملہ کانفرنس کے شرکاء مل کر انتخاب کریں گے تو مجھے اس سے اختلاف نہیں ہے"۔

" ۲۱ر جون : مولانا بمبئی پہنچے اور ان کی صدارت میں تقریباً تین سال کے وقفے کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دو روزہ اجلاس شروع ہوا۔ کمیٹی نے وائسرائے کے دعوت نامے پر غور کرنے کے بعد شملہ کانفرنس میں کانگریس کی نمائندگی کے لیے مولانا کو مجاز قرار دیا۔

" ۲۴ر جون : شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے مولانا آزاد شملہ پہنچے۔

" ۲۵ر جون : ساڑھے گیارہ بجے صبح کو شملہ کانفرنس شروع ہوئی، جس میں مولانا نے کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔

" جولائی و اگست : صحت کی بحالی کے لیے ڈاکٹروں کے مشورے پر مولانا نے یہ دو مہینے گل مرگ (کشمیر) میں گزارے۔ مولانا کشمیر ہی میں تھے کہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ برطانیہ کی لیبر پارٹی نے عام انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے۔ مولانا نے فوراً ہی مسٹر اٹلی اور سر اسٹیفرڈ کرپس کو مبارکباد کے تار بھیجے اور یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ان کی پارٹی نے حزب مخالف کی حیثیت سے ہندوستان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، برسر اقتدار آنے کے بعد اس پر عمل کرے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے میرے اس اقدام کو پسند نہیں کیا۔

" ۱۳ر اور ۱۷ر نومبر کے درمیان : سکون اور صحت کی تلاش میں مولانا بندھیاچل (ضلع مرزاپور) تشریف لے گئے۔ ۱۴ر نومبر کو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو لکھتے ہیں : "کیا کروں، دل نہیں مانتا کہ آدمی بیماری کے مقابلے میں ہار مان لے۔ بہر حال اب ارادہ کیا ہے کہ چند دنوں کے لیے بندھیاچل کے ایک غیر آباد مقام میں چلا جاؤں اور سکونِ خاطر کی کوشش کروں"۔

۱۹۴۵ء : ۲ر دسمبر : غالباً ۲ر دسمبر کو مولانا بندھیاچل سے کلکتہ واپس آگئے۔ مولانا عبدالرحمٰن کاشمیری کو ۲۲ر نومبر کو بندھیاچل سے مولانا لکھتے ہیں : "میں یہاں سے ۲ر دسمبر کو کلکتہ جاؤں گا"۔

۱۹۴۶ء : ۸ر جنوری : بنگال گورنر کی معرفت مولانا کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کا ایک خط ملا کہ برطانوی پارلیمنٹری ڈیلی گیشن کے اراکین آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

" ۱۹ر جنوری : برطانوی پارلیمنٹری ڈیلی گیشن کے اراکین نے بمبئی میں مولانا سے ملاقات کی۔

" ۲۶ر جنوری : یومِ جمہوریہ کی ایک تقریر میں مولانا نے حصولِ آزادی کے لیے اتحاد اور نظم و ضبط پر زور دیا۔

" ۳ر فروری : مولانا اور سردار پٹیل نے جی۔ ایم۔ سیّد اور حاجی مولا بخش سے سندھ اسمبلی کی مخلوط پارٹی کے مسائل پر بڑی طویل بات چیت کی۔

" ۵ر فروری : کراچی کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے فرمایا : "کانگریس پارٹی سندھ میں آل پارٹی حکومت کے قیام کا خیر مقدم کرے گی"۔

" ۷ر فروری : مولانا نے کلکتہ میں ایک اخباری بیان میں فرمایا : "برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کے متعلق جو اعلان کیا ہے، اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے"۔

" ۱۹ر فروری : مولانا نے ایک بیان میں فرمایا : "برطانوی حکومت ستمبر ۱۹۴۵ء کا وعدہ پورا کرنے سے قطعاً قاصر رہی ہے، کانگریس نے اب تک جو انتظار کیا ہے اس کے معنی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ جدّ و جہد کرنے سے کتراتی ہے"۔

" ۱۸ر مارچ : مولانا بمبئی سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی پہنچے اور دوسرے روز کلکتہ روانہ ہو گئے۔

" ۲۳ر مارچ : کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا۔ بنگال کے ایک ممتاز کانگریسی لیڈر جے۔ سی۔ گپتا، سر اسٹیفرڈ کرپس سے ملنے کے لیے دہلی جا رہے تھے۔ مولانا نے ان کے ذریعے کرپس کو ایک خط بھیجا جس میں ان کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔

" ۲۸ر مارچ : مولانا نے مسلم لیگ کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے لکھنؤ میں فرمایا : "کانگریس دو دستور ساز اسمبلی کے قیام کی حمایت نہیں کرے گی۔

" یکم اپریل : مولانا ہوائی جہاز کے ذریعے کلکتہ سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ دہلی میں ۵ر تاریخ تک قیام کا ارادہ ہے۔

" ۲ر اپریل : مولانا نے دہلی پہنچ کر فرمایا : "اس وقت سب سے اہم مسئلہ

جس پر غور کرنا چاہیے، ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔"

- ۳ر اپریل: مولانا نے کیبنٹ مشن سے ملاقات کی۔ دونوں کی بات چیت انتہائی بے تکلف فضا میں ہوئی۔
- ۷ر اپریل: مولانا نے نئی دہلی میں اعلان کیا کہ کانگریس ایسی آزادی کی خواہاں ہے، جس میں ملک کا بٹوارہ نہ ہو۔
- ۱۲ر اپریل، نئی دہلی میں مولانا کی صدارت میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی، جس میں مولانا نے کیبنٹ مشن سے اپنی گفتگو کی رپورٹ پیش کی اور فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے بارے میں اپنے خیالات بیان کیے۔
- ۱۵ر اپریل: مولانا نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے بارے میں ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے فرمایا: "مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے، اس پر میں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے، ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔"
- ۲۶ر اپریل: مولانا نے اپنے ایک بیان میں کانگریس کی صدارت کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کا نام پیش کیا اور کانگریسیوں سے اپیل کی کہ انہیں بالاتفاق منتخب کیا جائے۔ مگر کچھ لوگوں نے سردار پٹیل اور اچاریہ کرپلانی کے نام بھی تجویز کیے، لیکن بالآخر پنڈت جی بہ اتفاق رائے منتخب ہو گئے۔
- ۲ر مئی: کیبنٹ مشن سے شملہ میں گفتگو شروع ہوئی اور ۱۲ر مئی تک جاری رہی۔ مولانا نے لکھا ہے: "باضابطہ کانفرنس کے علاوہ ہم نے بہت سی بے ضابطہ طور پر بحثیں کیں، مشن کے ممبر کئی موقعوں پر مجھ سے ملنے کے لیے میری قیام گاہ پر آئے، میں بھی ان سے ملنے کے لیے، کبھی انفرادی طور پر اور کبھی اجتماعی طور پر، جیسا بھی مناسب معلوم ہوا ان سے ملنے کے لیے گیا۔ ان ملاقاتوں میں آصف علی یا ہمایوں کبیر کبھی کبھی میرے ساتھ گئے۔ کوئی دو ہفتے کے بعد ہم دہلی واپس آ گئے۔"
- ۱۸ر جون: مولانا آزاد وائسرائے سے ملے۔
- ۲۱ر جون: مولانا کی صدارت میں نئی دہلی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا جس میں عارضی حکومت میں شرکت کے لیے تجاویز کو آخری شکل دی گئی۔
- ۲۳ر جون: مولانا، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔
- ۲۵ر جون: مولانا نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ کانگریس نے عارضی حکومت کے لیے کیبنٹ مشن کی تجاویز کو نامنظور کر دیا ہے، لیکن ہندوستان کے لیے ________ دستور مرتب کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی طویل مدتی تجویز کو منظور کر لیا ہے۔
- ۳۰ر جون: دہلی میں خاصی گرمی تھی، نیز اب دہلی میں کوئی خاص کام بھی نہیں رہ گیا تھا، اس لیے مولانا کلکتہ چلے گئے۔
- ۴ر جولائی: کانگریس ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لیے مولانا بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے انڈیا ونس فریڈم میں لکھا ہے: "تقریباً ہر اسٹیشن پر بہت سے لوگ ملتے اور کہتے کہ مجھے کانگریس کی صدارت سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔"
- ۶ر جولائی: پروگرام کے مطابق ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جس نے اے آئی سی سی کے لیے متعدد ریزولیوشن مرتب کیے۔ پہلا ریزولیوشن کیبنٹ پلان سے متعلق تھا۔ طے پایا کہ اسے آئی سی سی میں اسے مولانا پیش کریں گے۔ کیونکہ سوشلسٹ خیال کے لوگوں کی طرف سے شدید مخالفت کا اندیشہ تھا۔
- ۷ر جولائی: جب اے آئی سی سی کا اجلاس شروع ہوا تو مولانا نے پنڈت جواہر لال نہرو سے صدارت کے لیے فرمایا۔ سردار پٹیل نے مولانا کے شکریے کی تجویز پیش کی جس میں صدر کی حیثیت سے ان کی خدمات کو سراہا گیا تھا۔ اس کے بعد مولانا نے کیبنٹ مشن پلان کے بارے میں تجویز پیش کی۔ جب توقع سوشلسٹ خیال کے لوگوں نے شدید مخالفت کی مگر پھر بھی بھاری اکثریت سے تجویز پاس ہو گئی۔
- ۱۳ر اگست: مولانا آزاد، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نئی دہلی میں اکٹھا ہوئے اور انہوں نے عارضی حکومت کی تشکیل کے بارے میں وائسرائے کو تجاویز پیش کرنے کے لیے آپس میں تبادلۂ خیال کیا۔
- ۱۶ر اگست: کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے مولانا کلکتہ سے دہلی کے لیے ہوائی جہاز کے ذریعے روانہ ہوئے۔ مسلم لیگ کے ڈائرکٹ ایکشن کی وجہ سے نظم و ضبط اور امن و امان مفقود تھا۔ ہوائی اڈے پر جاتے وقت مولانا کی کار پر بھی حملہ ہوا، مگر کسی نہ کسی

طرح ذم ڈم ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔

" ۱۷ر اگست : عارضی حکومت کی تشکیل کا کام کانگریس نے پارلیمنٹری کمیٹی کے سپرد کیا تھا جس کے ممبر مولانا آزاد، جواہر لال، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے۔ آج جب اس کمیٹی کا جلسہ شروع ہوا تو اس کے ممبروں نے مولانا سے اصرار کے ساتھ عارضی حکومت میں شرکت کے لیے درخواست کی، مگر انہوں نے انکار کردیا اور اپنی جگہ پر آصف علی صاحب کا نام پیش کیا جو منظور کرلیا گیا۔

" ۲۸ر دسمبر: وائسرائے ہاؤس کے ایک پریس کمیونکے میں یہ خبر شائع ہوئی کہ آصف علی کو واشنگٹن میں ہندوستان کا سفیر مقرر کیا گیا ہے اور ان کی جگہ پر مولانا آزاد کو وزیر کابینہ مقرر کیا گیا ہے۔

۱۹۴۷ء ۱۵ر جنوری : مولانا آزاد کو وزیر تعلیم مقرر کیا گیا، یہ عہدہ اب تک راج گوپال اچاری کے پاس تھا۔

" ۲۸ر جنوری : گروپنگ کے معاملے میں کانگریس کی پوزیشن کو واضح کرتے ہوئے مولانا نے دستور ساز اسمبلی میں شرکت کے لیے مسلم لیگ کو دعوت دی۔

" ۳۱ر جنوری: مولانا نے اخبارات کو بیان دیتے ہوئے فرمایا: "میں نے محکمۂ تعلیم کا انتخاب اپنے ذوق اور اپنی دلچسپی کی وجہ سے کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کی از سر نو تنظیم ہماری قومی زندگی کی بنیاد رکھنے کا موجب ہوگی"۔

" ۸ار فروری، مولانا نے نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ایک طویل بیان دیا جس میں انہوں نے ہندوستان میں تعلیم کی کیفیت اور مستقبل کی ضروریات اور موجودہ پروگرام پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے فرمایا: "ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کو اعلیٰ ترین ترجیح حاصل ہونی چاہیے" انہوں نے امید ظاہر کی اگر ہم کامل عزم وارادہ کے ساتھ مل کر کوشش کریں تو ہم اپنی خامیاں دور کرسکیں گے اور ہندوستان کو تعلیم کے ذریعے دنیا کے ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں کی صف میں لا کھڑا کریں گے۔

" ۲۳ر فروری: مولانا نے صوبجات متحدہ کی مجلس عربی و فارسی کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت کی اور تحریری خطبے کے بجائے تقریباً سو منٹ تک زبانی تقریر کی جس میں فرمایا: "اس مجلس کی بنیاد ۱۹۴۱ء میں رکھی گئی تھی، لیکن دفعۃً کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہوجانے سے اس مجلس کا کام شروع نہ کیا جاسکا۔" مولانا نے مزید فرمایا: "جب میں نے اس مجلس کی صدارت قبول کی تو میرا ارادہ تھا کہ دونوں زبانوں — عربی اور فارسی کو اسی معراج کمال پر پہنچایا جائے جس پر یہ زبانیں اسلامی دور میں فائز تھیں"۔

" ۲۴ر فروری: ایسوسی ایٹڈ پریس کو مولانا نے ایک بیان دیا جس میں مسٹر اٹلی کے تازہ بیان پر اظہار خیال کرتے ہوئے سابق وائسرائے، لارڈ ویول کے خلوص کی تعریف کی۔ جون ۱۹۴۵ء سے اب تک کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: "شملہ کانفرنس ہی میں میری رائے قائم ہوگئی تھی کہ لارڈ ویول اور سیاست دانوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ پرخلوص ہیں اور ایک سپاہی کی طرح سیدھے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں"۔

" ۲۵ر فروری: مولانا نے عربی اور فارسی کی مجلس کی صدارتی تقریر میں جو کچھ فرمایا تھا، اس کی رپورٹ اخبارات میں کچھ اس طرح شائع ہوئی جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان تھا کہ مولانا انگریزی زبان کے معیار کو باقی رکھنے کے حق میں نہیں ہیں۔ مولانا نے اس امکانی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا: "انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے، اگر ہندوستان اس طرف توجہ نہیں کرے گا تو وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے گا، اس لیے میرے خیال میں جہاں تک ممکن ہو انگریزی کے موجودہ اعلیٰ معیار کو مستقبل میں بھی رکھنا چاہیے"۔

" مارچ: بین ایشیائی کانفرنس منعقدہ نئی دہلی کے موقع پر مولانا نے ان ممالک سے ثقافتی تعلقات کے مستحکم قیام پر زور دیتے ہوئے اپنے ایک اخباری بیان میں فرمایا: "ہم ان لوگوں کے ممنون ہیں جنہوں نے ہندوستان کا دعوت نامہ قبول کیا، مجھے امید ہے کہ جب وہ واپس جائیں گے تو اپنے ساتھ ہندوستان کی دوستی اور خیر سگالی کا پیغام لے کر جائیں گے"۔

" ۲۱ر مئی: لیجسلیچر اسٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ شملہ میں مولانا آزاد نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا: "حکومت تعلیم کی طرف سب سے پہلے توجہ دیتی، لیکن ملک کی سیاسی حالت پیچیدہ ہے اور ہم سیاسی حالات کی متواتر تبدیلیوں کی وجہ سے تعلیم کی طرف توجہ نہیں دے پائے"۔

" ۲۹ر جون : آج نئی دہلی میں مولانا نے ایک بیان جاری کیا جس میں یہ تجویز کیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں ایک مشترکہ چارٹر تیار کرنے کی غرض سے دونوں ملکوں، ہندوستان اور پاکستان کی آئین ساز اسمبلیوں کا مشترکہ اجلاس منعقد کیا جائے۔

- ۱۵ اگست: آج یوم آزادی کے موقع پر مولانا نے قوم کو حسب ذیل پیغام دیا: "ہماری قومی آزادی کا پہلا مرحلہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ ہم نے آزادی حاصل کر لی، ہم یہ آزادی ساری قوم کے تمام و کمال تعاون، اتحاد اور استقلال کے بغیر حاصل نہیں کر سکتے تھے، قومی تعمیر جدید کے دوسرے اہم ترین مرحلے پر ہمیں ان باتوں کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوگی۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اپنی اس نئی جیتی ہوئی آزادی کو اس طرح کام میں لائیں جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہماری امیدیں حقیقی معنوں میں پوری ہو گئیں۔ ہر ہندوستانی کا خواہ عورت ہو یا مرد، یہ فرض ہے کہ وہ اس نازک موقع پر ملک کی آواز پر لبیک کہے اور اپنے فرائض کو زندگی کے جس عہدے پر بھی مامور ہو وفاداری کے ساتھ انجام دے۔"
- ۲۲ ستمبر: دہلی کی فرقہ وارانہ فضا کے بارے میں مولانا نے اپنے ایک بیان کے دوران فرمایا: "دہلی میں اب فضا تقریباً پُر سکون ہے اور رفتہ رفتہ حالات اعتدال پر آ رہے ہیں۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں کہ غصہ اور نفرت کی وہ آگ جو فضا کو مکدر کیے ہوئے تھی، جلد از جلد ٹھنڈی کی جا سکے۔"
- ۲۴ ستمبر: کل مولانا آزاد اور سہروردی کی موجودگی میں مسلم لیگ کی مجلس عمل کے صدر نواب اسمٰعیل خاں نے ملک کی بالخصوص دہلی کی فرقہ وارانہ صورت حال پر گاندھی جی سے گفتگو کی۔
- ۲۹ ستمبر: مولانا نے آج ایک اہم بیان شائع کیا ہے، جس میں موجودہ صورت حال کا مقابلہ کرنے، حالات کو مزید خراب ہونے سے بچانے اور ملک سے بدامنی کو دور کرنے کے سلسلے میں چند اہم تجاویز پیش کیں۔ مثلاً مشرقی و مغربی پنجاب کی حکومتوں کا اعتراف کہ وہ اقلیتوں کے تحفظ میں ناکام رہیں، مشرقی و مغربی پنجاب کے مابین سفر کے سلسلے میں حفاظتی انتظامات، دونوں علاقوں میں مؤثر طور پر قیام امن، مشرقی اور مغربی پنجاب کی دونوں حکومتوں میں مشترکہ وزارتوں کی تشکیل، حکومت اور عوام کی طرف سے بے گناہ لوگوں کے قتل کی برملا مذمت وغیرہ وغیرہ۔
- ۲۳ اکتوبر بروز جمعہ: مولانا نے شاہجہاں کی یادگار مسجد میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان مجمع میں پُر جوش اور طویل تقریر کی جس میں بہت سی اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

"اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے . . . ہر اس کا یہ موسم عارضی ہے، میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہے۔"
- ۱۴ نومبر: مولانا کی صدارت میں کل مسلم جماعتوں کی دو روزہ کانفرنس دہلی میں شروع ہوئی۔ پہلے دن کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ مسلم لیگ اور دوسری فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں کو ختم کر کے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جائیں جو اتحاد، جمہوریت اور ترقی کی حامل ہے۔
- ۱۹ دسمبر: سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے افتتاحی اجلاس میں مولانا نے استادوں کی ٹریننگ پر زور دیا۔
- ۲۱ دسمبر: پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "مغربی تعلیم کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر جو طرز تعلیم ایجاد کیا گیا، وہ ہماری زندگی اور اس کے مقتضیات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔"
- ۲۷ دسمبر: مولانا کی دعوت پر اور ان کی صدارت میں مسلمانوں کی دو روزہ کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی، جس میں مولانا نے ہندوستانی مسلمانوں کو مفید سیاسی مشورے دیے۔ مثلاً انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں ایک جگہ فرمایا: "جہاں تک ملک کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے، فرقہ پرستی کو جو مذہب کے نام پر ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ کسی ایک گوشے کی فرقہ پرستی نہیں، کسی ایک جماعت کی فرقہ پرستی نہیں، سب کی فرقہ پرستی۔ ان بربادیوں میں جو ۱۵ اگست کے بعد سے ہوتی رہی ہیں، بدقسمتی سے ہر فرقہ پرست جماعت کے لوگ اضافہ کرتے رہے ہیں اور کوئی جماعت ایسی نہیں رہی جس پر خون کا دھبہ نہ لگا ہو۔ مسلمانوں کے ہاتھ پر خون کا دھبہ ہے، ہندوؤں کے ہاتھ پر بھی خون کا دھبہ ہے اور سکھوں کے ہاتھ پر بھی خون کا دھبہ لگا ہوا ہے۔"

۱۹۴۸ء ۱۳ جنوری: آج نئی دہلی میں مولانا کی صدارت میں تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا: "بورڈ کا یہ چودھواں اجلاس ہے، اس سے پہلے

تیرہ اجلاس برطانوی عہد میں ہوئے تھے، اس بدلے ہوئے حالات میں اس اجلاس کو افتتاحی اجلاس سمجھنا چاہیے۔"

〃 ۱۶ر جنوری: آج مولانا نے کل ہند تعلیمی کونسل منعقدہ دہلی کی صدارت کی اور دوران صدارت یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے ایک قسم کی جبری خدمت کی ضرورت ہے۔

〃 ۱۷ر جنوری: آج شام کو جامع مسجد دہلی کے نزدیک اردو پارک میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں اخبارات کے اندازے کے مطابق دہلی کے تقریباً تین لاکھ باشندوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "میں جلسے میں آنے سے دس منٹ پہلے گاندھی جی کے پاس تھا۔ وہ اپنا برت توڑنے کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ دہلی کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ان کی شرطیں مان لیں۔ ان شرطوں کا تعلق دہلی میں امن وامان کے قیام اور مسلمانوں کے تحفظ سے ہے۔"

〃 ۱۸ر جنوری: چوں کہ دہلی کے باشندوں نے گاندھی جی کی شرطیں مان لیں اور اس عہد نامے پر دو لاکھ سے زیادہ لوگوں نے دستخط کر دیے اس لیے دوپہر کے وقت ممتاز قومی رہنماؤں کی موجودگی میں گاندھی جی نے اپنا برت توڑا۔ گاندھی جی کے پوتے کی بیوی سنترے کا رس لے کر آئیں اور مولانا آزاد نے گاندھی جی کو پیش کیا۔

〃 فروری: گاندھی جی کی شہادت کے چند ہی روز کے بعد نئی دہلی کانسٹی ٹیوشن کلب میں مولانا آزاد کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں گاندھی جی کی یادگار کے قیام پر غور کیا گیا۔ مولانا نے فرمایا: "آج مہاتما گاندھی کے بعد نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں ان کی یادگار مختلف شکلوں میں قائم ہے۔ حال ہی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی چھ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے جو ان کے پاکیزہ مقصدِ حیات اور اس کی روح کو دنیا کے سامنے نمایاں کرے۔"

〃 ۲۰ر مارچ: دہلی میں جمعیۃ العلماء ہند کا کل ہند اجلاس منعقد ہوا، جس میں ہندوستان کے مقتدر علماء نے شرکت کی۔ ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمٰن کی تائید کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا: "جمعیۃ کو اب سیاست کی ضرورت نہیں ہے۔ سیاست سے ہٹ کر بھی بہت سے میدان ہیں، تعلیمی میدان ہے، سماجی میدان ہے، معاشی میدان ہے اور ان ہی میدانوں کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی طاقتور جماعت بنائی جائے۔ ظاہر ہے اس مقصد کے لیے جمعیۃ العلماء سے بڑھ کر کون سی جماعت ہو سکتی ہے۔"

〃 ۱۲ر اپریل: دہلی میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان اور ریاست حیدرآباد کے تعلقات خوشگوار ہونے کے بجائے ادھر چند مہینوں سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ متنازعہ فیہ مسائل کا پُرامن تصفیہ حیدرآباد ہی کے لیے نہیں ہندوستانی عوام کے لیے بھی خالی از فائدہ نہیں۔"

〃 ۲۶ر اپریل: جمعیۃ العلماء کا پانچواں سالانہ اجلاس آج شام کو مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت میں بمبئی میں منعقد ہوا۔ مولانا آزاد نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا: "ہندوستان میں پیش آنے والی تبدیلیاں صرف کاغذی نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف ملک کی صورت ہی میں نہیں بلکہ دلوں میں بھی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔"

〃 ۱۱ر مئی: آج شام کو سری نگر کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "میں یہاں کشمیر کے باشندوں کو کوئی پیغام دینے کے لیے نہیں بلکہ اس پر مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں کہ انہوں نے کچھ بنیادی سبق سیکھے ہیں۔ اول یہ کہ انہوں نے ایک لیڈر کی قیادت میں کام کرنا سیکھا ہے، دوم یہ کہ ان کے پاس ایک جماعت ہے جس کی فرقہ پروری پر بنیاد نہیں ہے، بلکہ جس کے سامنے سب کی اور خود ریاست کی بھلائی کا ایک معینہ پروگرام ہے، سوم یہ کہ کشمیر کے مسلمان اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مولانا نے اپنی تقریر کے اختتام پر فرمایا: "کشمیر پر شرمناک حملہ کیا گیا تھا، لیکن کشمیریوں نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ وہ اپنی آزادی کی بقا کے لیے اپنا آخری قطرۂ خون بھی گرانے کے لیے تیار ہیں۔"

〃 یکم جون: گزشتہ شام نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے بنیادی اور سماجی تعلیم کی جزئیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: "امید ہے کہ آئندہ دو سال میں یہ اسکیم پورے صوبۂ دہلی میں نافذ ہو جائے گی۔ ابتدا میں یکم جولائی سے سماجی تعلیم کے پچاس نئے مراکز کھلیں گے اور ان کے ساتھ ہی ساتھ موجودہ ڈیڑھ سو پچاس اسکولوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ سماجی تعلیم شامل کر دی جائے گی۔" مولانا نے مزید فرمایا: "دہلی میں اسکیم کی نوعیت ایک تجربے کی سی ہوگی اور یہاں جو تجربات حاصل ہوں گے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے آئندہ سال اپریل سے اسکیم کو

دوسرے صوبوں میں بھی نافذ کرنے کی تجویز پر غور کیا جائے گا "

• ۶ر جولائی : جامعہ ملیہ میں مرحوم بریگیڈیر محمد عثمان کی نماز جنازہ ، جنہیں کشمیر کے محاذ پر شہادت نصیب ہوئی ، مولانا آزاد نے پڑھائی اور شیخ محمد عبداللہ نے میت کو قبر میں اتارا ۔ مرحوم کو جامعہ کے مخصوص قبرستان میں ان کے خاندانی بزرگ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے متصل سپرد خاک کیا گیا ۔

• ۱۵ر اگست : یوم آزادی کے موقع پر مولانا نے اپنی تقریر میں ایک جگہ فرمایا : " آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے سال آج ہی کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ پیش آیا تھا ، دنیا کے نقشے میں ایک نیا خاکہ تھا ، آزادی کا اس خاکے کو سامنے رکھتے ہوئے آج ہم اس کی یاد منا رہے ہیں ، لیکن جب ہم اس دن کو یاد کرتے ہیں تو بدقسمتی سے ہمیں اس کا چہرہ ایسا ہشاش بشاش نظر نہیں آتا جیسا کہ آنا چاہیے ۔ اس کے خد و خال میں دکھوں کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں ۔ ہمیں آزادی ملی لیکن بدقسمتی سے ساتھ ہی ایک ایسا سیلاب آیا جس میں لاکھوں آدمی ختم ہو گئے ۔ اس تکلیف دہ حادثے سے جو زخم ہمیں لگے ہیں وہ ایسے نہیں تھے کہ جلد بھر جاتے ، ان میں آج تک ٹیس باقی ہے "

" ۱۹ر ستمبر : اخبارات کے لیے ایک طویل بیان جاری کرتے ہوئے مولانا نے ہندوستانی عوام کے تمام طبقوں کو ان کے اس رویے پر مبارکباد دی جس کا مظاہرہ انہوں نے حیدرآباد کی جنگ کے موقع پر کیا تھا ۔ انہوں نے فرمایا : " گزشتہ بجٹ اجلاس کے زمانے میں میں نے مجلس اتحاد المسلمین کے لیڈروں کو متنبہ کیا تھا کہ اگر تم نے یہ سمجھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی طبقہ تمہاری فرقہ وارانہ روش کی تائید کرے گا تو یہ تمہاری غلطی ہوگی "

" ۲۴ر ستمبر : آج سہ پہر کو دہلی کی جامع مسجد میں بعد نماز عصر ایک جلسہ منعقد ہوا ۔ جس میں دہلی کے مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی اور حیدرآباد کی فتح پر خوشی منائی ۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے تقریر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ انہوں نے خود نظام کو تین خط بھیجے تھے ۔ پہلی بار جون میں حیدرآباد کے وزیر اعظم میر لائق علی جب دہلی آئے تھے تو مولانا نے ان سے دو گھنٹے تک گفتگو کی تھی مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی ۔ مولانا نے مزید فرمایا : " میں آج خدا کے اس مقدس گھر میں اعلان کرتا ہوں کہ میری حکومت نے کوئی ایسا کام نہیں کیا کہ اسے خدا یا انسان کے سامنے شرمسار ہونا پڑے "

" دسمبر : نئی دہلی میں یونیورسٹی کمیشن کا پہلا اجلاس منعقد ہوا ، جس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا : " ملک کی تعلیم میں اب ایک نیا باب کھلا ہے ، اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا پھر سے جائزہ لے کر اس کی تشکیل کی جائے "

" ۔ ر دسمبر : آج ڈھائی بجے دن کو نئے منتخب صدر ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ کی صدارت میں گاندھی گراؤنڈ میں ایک جلسہ منعقد ہوا ، جس میں گاندھی جی کے " پیغام " کے نام سے جواہر لال نہرو نے ایک ریزولیوشن پیش کیا ، جس کی تائید کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا : " اس ریزولیوشن کا نام اس کی مناسبت سے " پیغام " رکھا گیا ہے ، لیکن یہ پیغام برائے نام نہیں ہے ، بلکہ یہ گاندھی جی کا وہی پیغام ہے جسے وہ ساری عمر سناتے رہے اور اب ان کے بعد بھی اس پیغام کو ہندوستان کے عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے ، اس لیے کہ یہی وہ صحیح راستہ ہے ، جس پر گاندھی جی پوری قوم کو لگانا چاہتے تھے "

" ۲۳ر دسمبر : آج صبح دہلی یونیورسٹی میں مولانا کی زیر صدارت تاریخی ریکارڈ کمیشن کی سلور جوبلی کا اجلاس منعقد ہوا ، جس میں مولانا نے کمیشن کے ۲۵ سالہ کام کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا : " کمیشن نے قابل قدر کام کیا ہے ، مگر ہندوستانی تاریخ کے کچھ ایسے گوشے ہیں جن پر کافی تحقیق نہیں ہوئی ہے ، مثلاً موہنجوداڑو کی تہذیب کا تعلق جنوبی ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک سے اسی طرح پہلے دور کے خاتمے کے بعد حالات کے مطالعے کی ضرورت ہے "

۱۹۴۹ ۲۰ر فروری : مولانا آزاد نے مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کیا کہ وہ سر سید اور ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے کے کبھی دشمن یا مخالف تھے ۔ انہوں نے اس احساس یا خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ممکن تھا ہی نہیں ، کیوں کہ میں ان کے شاندار اصلاحی کارناموں کا معترف اور ان کی عظمت کا معتقد تھا ۔ انہوں نے مزید فرمایا : " میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے جب سر سید مرحوم کی تصنیفات نے میرے دماغ پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا ... آج یہاں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ان کی شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا خراج عقیدت پیش کروں " مسلم یونیورسٹی کے متعلق مولانا نے فرمایا : " ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایک ایسی شاندار داستان رکھتا ہو ، قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے کہ ایک شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے "

• ۔ ر دسمبر : مولانا میسور تشریف لے گئے ، واپسی تین چار روز میں ہوگی ۔

" ۳۰ر دسمبر: آج بروز جمعہ تاج محل ہوٹل بمبئی میں جمعیۃ العلماء ہند کے ایک وفد کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "ملک کے حالات سامنے ہیں۔ اگرچہ ماضی کی تلخیوں کو بہت زیادہ دن نہیں گزرے ہیں مگر مستقبل کی ہر گھڑی مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں تسلی بخش ہے، کون کہہ سکتا تھا کہ دو سال پہلے کے حالات اس طرح بدل جائیں گے۔ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔"

۱۹۵۰ء (اوائل) بیرونی ممالک خصوصاً عرب ممالک سے ہندوستان کے ثقافتی اور علمی تعلقات کو بہتر اور مستحکم بنانے کے لیے مولانا نے "انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز" کے نام سے نئی دہلی میں ایک ادارہ قائم کیا۔

" ۸ر جنوری: تعلیمی مرکزی مشاورتی بورڈ کے جلسہ منعقدہ کٹک میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "اپنی تمام کوششوں کے باوجود روپیہ کی کمی کی وجہ سے ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ توسیع تعلیم کے پروگرام پر عمل کر سکیں۔"

" ۲۸ر جنوری: آج جمہوریہ ہند کی پہلی پارلیمنٹ کا اجلاس دن کے گیارہ بجے شروع ہوا۔ مولانا آزاد نے انگریزی میں حلف لیا۔

" ۱۶ر فروری: کلکتہ کے فساد کی اطلاع ملتے ہی مولانا کل شام کو ساڑھے چار بجے دہلی سے کلکتہ پہنچے۔ ہوائی جہاز سے اترتے ہی سب سے پہلے ڈم ڈم کنٹونمنٹ، ناکل تلہ، راجا بازار اور دوسرے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ انہوں نے پارک سرکس کے کیمپ کو بھی دیکھا، جہاں مسلمان خاندان متاثرہ علاقوں سے منتقل ہو کر آئے ہیں اور انہیں عارضی طور پر پناہ دی گئی ہے۔ آج رات کو ایک بیان میں انہوں نے فرمایا: "کلکتہ کی فرقہ وارانہ صورتحال اب پوری طرح قابو میں ہے۔"

" مارچ: مولانا کی تحریک اور کوشش سے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، حکومت ہند کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ "ثقافۃ الہند" کے نام سے جاری کیا گیا اور اس مہینے میں اس کا پہلا شمارہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہوا۔

" ۳ر جون: مرکزی وزیر مالیات ڈاکٹر جان متھائی کے استعفے پر اظہار تعجب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "مجھے سب سے زیادہ تعجب اس پر ہے کہ انہوں نے ایک وجہ نہرو لیاقت معاہدہ بھی بتائی ہے، حالاں کہ انہوں نے ہمیشہ پاکستان کے ساتھ دوستانہ رویے کی تائید کی ہے۔"

" ۵ر جون: مصر کے بااثر اور مقبول اخبار "السوادی" کے ایڈیٹر احمد التنابلی نے تین مہینے تک ہندوستان میں قیام کرنے کے بعد مصر واپس جاتے ہوئے بمبئی میں یہ بیان دیا کہ مولانا آزاد کا مشرق وسطیٰ کا مجوزہ دورہ ہندوستان کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

" ۱۹ جون: کراچی کی ایک خبر میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد ایران اور ترکی کے دورے پر جاتے ہوئے ۴ر جولائی کو ایک دن کے لیے کراچی ٹھہریں گے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ پاکستانی وزیر اعظم نواب لیاقت علی دہلی گئے تھے تو انہوں نے مولانا کو پاکستان آنے کی دعوت دی تھی۔

" ۱۸ر نومبر: لالہ لاجپت رائے کی برسی کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے نیپال کی خانہ جنگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا: "نیپال کے موجودہ حکمراں وقت کے تقاضے کو سمجھیں اور مزید خوں ریزی سے بچنے کے لیے معاشی اور سیاسی اصلاحات رائج کریں۔"

" ۱۵ر دسمبر: سردار پٹیل کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "سردار پٹیل کی کہانی انسانوں کے بڑے لیڈر کی کہانی ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر یہ کہانی ختم ہو گئی، لیکن اصل میں وہ ختم نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ سردار پٹیل کی کہانی ذہنوں اور دماغوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔" سردار سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "میری پہلی ملاقات ۱۹۲۰ء میں ہوئی، جب سے ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے مسافر تھے اور غم و مسرت اور فتح و شکست میں برابر کے شریک تھے۔"

" ۲۵ر دسمبر: مولانا کی صدارت میں انڈین ہسٹاریکل کمیشن کا ۲۷واں اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ تاریخ کو صحیح طریقے پر پیش کرنے کے لیے ریکارڈ رکھنے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے فرمایا: "تاریخی دستاویزیں تاریخ کی بنیاد ہیں اور ماضی میں ان ہی کی بدولت ہمیں واقعات کی صحت کا پتہ چلتا تھا۔"

۱۹۵۱ء ۸ر جنوری: دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر مولانا وہاں تشریف لے گئے اور ایک سپاس نامے کے جواب میں انہوں نے دارالعلوم کے بزرگوں کی گراں قدر خدمات اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

" ۲۰ر جنوری: دہلی میں سپرو اکادمی کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا

نے فرمایا: "ہندوستان کے ثقافتی اثرات کو جو مختلف ادوار کے متعدد ثقافتی رجحانات کا مجموعہ ہے، ایک ثقافتی ڈھانچے میں محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دہلی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان میں دو ثقافتیں ہیں: ایک قدیم ہندو ثقافت اور دوسری عرب ثقافت۔ اس خیال کی تردید کرتے ہوئے مولانا نے کہا، "ہندوستان میں عرب ثقافت کبھی موجود نہیں تھی۔ ہندوستانی ثقافت پر صرف ایک مختصر مدت کے لیے سندھ میں اثر انداز رہی۔ ہندوستانی ثقافت پر بیرونی اثرات میں سب سے زیادہ اثر ایرانی ثقافت نے ڈالا لیکن یہ اثر بھی جداگانہ موجود نہیں رہا، بلکہ ہندوستانی ثقافت کے دھارے میں گھل مل گیا، اس لیے ہندوستانی ثقافت زمانہ قدیم، قرون وسطیٰ اور عصر جدید کے رجحانات کا مجموعہ ہے۔"

〃 ۲۵ر جنوری: مولانا کی رہائش گاہ پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دو روزہ اجلاس منعقد ہوا۔

〃 ۲۹ر جنوری: احمد آباد کے ایک کالج کے یوم تاسیس کے جشن میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "اس کی خوشی ہے کہ گجرات میں ایک جداگانہ یونیورسٹی قائم ہوگئی ہے، مگر یہ کافی نہیں ہے۔ ملک کا تعلیمی معیار اپنی انتہائی پستیوں تک پہنچ گیا ہے، ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ جلد سے جلد نظام تعلیم کو بہتر بنائیں۔"

〃 ۳۰ر جنوری: آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ احمد آباد میں مولانا نے پنڈت جواہر لال نہرو کی تجویز پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "آزادی کے حصول کے بعد کانگریسیوں نے عام طور پر یہ خیال کرنا شروع کر دیا ہے کہ اب آزادی کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ یہ ایک خطرناک ذہنیت ہے اور یہ ذہنیت کانگریس کو تباہ کر دے گی۔"

〃 ۴ار فروری: وزیر داخلہ راج گوپال اچاری کی تجویز پر کانگریس پارلیمنٹری پارٹی نے متفقہ طور پر مولانا آزاد کو پارٹی کا لیڈر منتخب کیا۔

〃 ۸ار فروری: غالب کی برسی کے موقع پر مولانا نے غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اردو کی ہمہ گیری اور اس کے علم و ادب کی وسعت و ترقی کی تعریف کی۔

〃 ۲۵ر فروری: کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دو روزہ اجلاس مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا۔

〃 ۳ر مارچ: آج پارلیمنٹ میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "وزارت تعلیم نے تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے، جس میں انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں خوشگوار فضا پیدا کرنے کے لیے خاص اقدامات کریں، تاکہ ۱۹۵۰ء کے ہندو پاک معاہدہ کو پورا کیا جا سکے۔"

〃 ۱۵ر مارچ: آج کونسل آف اسٹیٹ چیمبرس نئی دہلی کے اہتمام میں ہندی ادیبوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے ترقی دینے اور اسے عالمی لٹریچر سے مالا مال کرنے پر زور دیا۔

〃 ۲۲ر مارچ: آج نئی دہلی میں یونسکو کے دوسرے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "اگر آپ چاہتے ہیں کہ انسان انسان کو اپنا بھائی سمجھنے لگے تو آپ کو تاریخ اور جغرافیہ کو پڑھانے کا جو طریقہ ہے، اس کو بالکل بدل دینا ہوگا۔ اس وقت تو یہ دونوں علم انسان کو گروہوں اور خطوں میں تقسیم کرتے ہیں۔"

〃 ۲۶ر اپریل: آج پارلیمنٹ میں مولانا نے ہندو یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۱۵ء میں ترمیم کرنے کے لیے ایک بل پیش کیا، جس کی رو سے یونیورسٹی کے دروازے تمام طبقات، تمام مذاہب اور تمام ذات پات کے طالب علموں کے لیے کھل جائیں گے۔ بل کے اغراض و مقاصد میں کہا گیا ہے کہ حکومت ہند نے بنارس اور علی گڑھ یونیورسٹیوں کے نام کو بدلنے کا خیال ترک کر دیا ہے، مگر آئندہ سے ان دونوں کی کورٹ کے ممبر ہندو اور مسلمان بھی ہو سکیں گے۔

〃 ۱۸ر مئی: آج جمعہ کے دن مولانا مشرق وسطیٰ کے دو ماہ کے دورے پر روانہ ہوئے جس کا مقصد ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے درمیان ثقافتی تعلقات کو مضبوط کرنا ہے، نیز یونسکو کے چھٹے سالانہ اجلاس میں شریک ہوں گے، جو پیرس میں ہونے والا ہے۔ پروگرام کے مطابق مولانا ۱۹ر مئی کو لندن پہنچیں گے، جہاں نو روز قیام کرنے کا ارادہ ہے، مولانا کے ساتھ ان کے نائب مشیر تعلیم ہمایوں کبیر اور ان کے پرائیویٹ سکریٹری مرزا مسعود بیگ ہیں۔

〃 ۹ر جون : لندن کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے فرمایا :
" انڈیا آفس میں جو مسودات اور تصاویر موجود ہیں وہ ہندوستان کو واپس ملنی چاہئیں ۔ کل روم روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے کہا کہ یہاں ہندوستانی آرٹ کا خزانہ اس قدر قیمتی ہے کہ اس کا صحیح اندازہ کرنا فی الحال مشکل ہے ۔

〃 ۲۲ر جون : کل مولانا نے یونسکو کے عام اجلاس میں فرمایا : " صرف یہی واحد ادارہ ہے جس سے بنی نوع انسان کے خوش کن مستقبل کے لیے امید کی جاسکتی ہے ، لیکن امید کی یہ کرن بھی کسی حد تک دھندلی سی ہے ۔

〃 ۲۴ر جون : مولانا نے کل فرانس کی قومی لائبریری دیکھی ، جس میں بہت ہی نادر اور قدیم مخطوطے ہیں ، نیز مشرقی ممالک سے متعلق عجائب خانہ بھی دیکھا ۔ آج پیرس سے استنبول کے لیے روانہ ہو رہے ہیں ۔

〃 ۲۹ر جون : آج انقرہ میں ہندوستان اور ترکی کے درمیان ثقافتی معاہدہ ہوا ، جس پر ہندوستان کی طرف سے مولانا آزاد نے دستخط کیے ۔ معاہدے کا مقصد دونوں ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات کو استوار کرنا اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ نیز سائنسی اور تہذیبی اداروں میں کام کرنے والوں کے درمیان تبادلہ کرنا ہے ۔

〃 ۶ر جولائی : انقرہ کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے ہندوستان اور کشمیر کے مسائل پر اپنی واضح اور دو ٹوک رائے کا اظہار کیا ۔

〃 ۸ر جولائی : مولانا آزاد کل استنبول سے تہران پہنچے جہاں ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا ۔ ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق نے مولانا سے ملاقات کی ۔

〃 ۱۹ر جولائی : مولانا آزاد یورپ اور مشرق وسطیٰ کے دورے سے آج نئی دہلی واپس آگئے ۔ کل ایران سے آتے وقت کراچی کے ہوائی اڈے پر مولانا پہنچے تو قائم مقام ہائی کمشنر خوب چند اور پاکستان کے افسر استقبال اے ایم مصطفیٰ نے مولانا کا خیر مقدم کیا ۔

〃 ۲۸ر جولائی : آج نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے اپنے حالیہ دورے کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے فرمایا : " یہ غلط ہے کہ ہندوستان او پاکستان کے اختلافات کے سلسلے میں انگلستان کے لوگ پاکستان کے جانبدار ہیں ، لیکن یہ ضرور ہے کہ کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے نقطہ نظر کو جس طرح سمجھنا چاہیے نہیں سمجھتے اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کشمیر کی بیس سالہ تاریخ سے ناواقف ہیں " مولانا نے مزید فرمایا : " میں نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹلی سے گفتگو کی اور انہیں کشمیر کے بارے میں ہندوستان کے نقطہ نظر کو سمجھانے کی کوشش کی "

〃 یکم اگست : آج سہ روزہ مدینہ (بجنور) کے خصوصی نمائندے کو مولانا آزاد نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے دورے کے بارے میں اپنا مطبوعہ بیان دیا ، جس سے معلوم ہوا کہ مولانا نے ترکی میں دو تقریریں کی تھیں ، ایک انقرہ یونیورسٹی میں " مشرق کی بیداری " اور دوسری استنبول میں ہند ترکی تمدنی ادارے کے اہتمام میں " ہندوستانی کلچر " پر ۔

〃 ۲۲ر اگست : آج پارلیمنٹ کے ممبروں نے مولانا آزاد کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جس میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا : " مشرق وسطیٰ کے ملک ہندوستان کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں اور اسے ایشیا کا لیڈر تسلیم کرتے ہیں "

〃 ۲۳ر ستمبر : ایک مرکزی یونیورسٹی کے طور پر وشوا بھارتی (شانتی نکیتن) کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے ڈاکٹر ٹیگور کی مخلصانہ خدمات پر روشنی ڈالی اور فرمایا : " اب یہ ادارہ ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے ، لیکن اس کے اساتذہ اور طلبا کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ گوردیو ٹیگور نے استادوں کو مالی طمع یا جاہ و جلال کی خواہش سے نہیں بلکہ سادگی اور عزلت پسندی اور خدمت کے جذبے سے کام کرنے کی تلقین کی تھی "

〃 ۱۳ر دسمبر : نئی دہلی میں مشرق و مغرب کے بارہ ممالک سے آئے ہوئے مفکرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا : " مشرق و مغرب کے مفکرین کی یہ کانفرنس جو یونیسکو کی سرپرستی میں ہو رہی ہے ، حقیقت انسان کے نظریے کی روحانی حیثیت کو اجاگر کرنے کے بعد زمین پر خدائے واحد کی معرفت کے تصور کو حقیقی شکل میں پیش کرے گی " ۔

〃 ۲۰ر دسمبر : مشرق و مغرب کے مفکرین کی کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا : " انسانی دماغ ایک بڑے انقلابی دور سے گزر رہا ہے ۔ پرانے سانچے جو صدیوں کی زندگی سے بنے تھے ، ٹوٹ رہے ہیں اور نئے سانچے بے چین روح کے تقاضوں کا جواب نہیں دے سکتے ۔ فلسفی جس قدر تیزی سے شک کے دروازے کھولتی ہے ، اتنی تیزی کے ساتھ یقین کے دروازے تک نہیں لے جاتی "

〃 ۲۶ر دسمبر : ہندوستانی تاریخی ریکارڈ کا ۲۸ واں اجلاس آج

جے پور میں منعقد ہوا، جس کا افتتاح مولانا آزاد کو کرنا تھا، مگر کسی مجبوری کی وجہ سے وہ تشریف نہ لاسکے، اس لیے ان کا افتتاحی خطبہ پی این کرپالانی نے پڑھ کر سنایا، جس میں مولانا نے مورخوں سے اپیل کی تھی کہ وہ برطانوی دور کی تاریخ کا مطالعہ بے لاگ ہو کر غیر جانبداری سے کریں۔ نیز مولانا نے ہندوستان کے آثار قدیمہ کو محفوظ رکھنے پر زور دیا۔ انہوں نے فرمایا: "یہ بہت قیمتی سرمایہ ہے، جس کے مطالعے سے مورخین مفید اور کارآمد نتائج نکال سکتے ہیں"۔

۱۹۵۲ء ۹ر فروری: مولانا پہلے جنرل الکشن میں رام پور کے حلقے سے ہندو مہاسبھا کے امیدوار کے مقابلے میں ۳۵،۰۵۳ ووٹوں سے جیت گئے۔ مولانا کو کل ایک لاکھ آٹھ ہزار ایک سو اسی ووٹ ملے اور ان کے مخالف امیدوار کو بہتر ہزار چار سو ستائیس ووٹ۔

۵ر مارچ: نئی دہلی میں سوویٹ روس کے فن اور مصوری کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "فنون لطیفہ قوموں کے درمیان امن و خیر سگالی کے سب سے بڑے پیامبر ہیں"۔ مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ آج دنیا کے مختلف ممالک کے عوام کو ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔

۲۷ر اپریل: راشٹرپتی بھون میں دہلی کے پرائمری اسکولوں کے ٹیچروں کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "اب تک راشٹرپتی بھون کے دروازے صرف شہزادوں اور اعلیٰ افسروں کے لیے کھلتے تھے لیکن آج یہ دروازے ملک کے غریب ترین طبقے کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ یہی نہیں آج ملک کے عوام کے لیے دلوں کے دروازے بھی کھول دیے گئے ہیں اور یہ آزادی کے پہلے پھلوں میں سے ایک ہے"۔ انہوں نے مزید فرمایا: "گو کہ پرائمری مدرسین کو یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی طرح سہولیات میسر نہیں ہیں، لیکن پھر بھی سماج کا مستقبل بنانے میں ان کا بنیادی حصہ ہے"۔

۱۸ر مئی: مصر کے مفتی اعظم کے ایک فتوی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "میری توجہ مصر کے مفتی اعظم شیخ حسن محمد مخلوف کے ایک فتوے کی جانب مبذول کرائی گئی ہے، جس میں موصوف نے لکھا ہے کہ خواتین کی حق رائے دہندگی اور پارلیمنٹری انتخابات میں ان کی شمولیت اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ میرے لیے یہ بیان موجب حیرت ہے، کیوں کہ جب ہم اسلامی قانون کے فلسفے یا اسلامی سماج کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ اسلام نے سیاسی یا عوامی زندگی میں عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی امتیاز روا ہی نہیں رکھا ہے"۔

۶ر جون: مولانا نے آج پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ بچوں کو ہندی میں یکساں طریقے پر لازمی تعلیم دینے کے متعلق مرکز کی طرف سے صوبائی حکومتوں کو جلد ہی ہدایات بھیجی جائیں گی۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ سائنسی اصطلاحات بنانے کے لیے ایک مرکزی بورڈ قائم کردیا گیا ہے اور ایک ادارہ ہندی کی سکشا کے لیے ہے، یہ دونوں ادارے ہندی کی ترقی کے لیے کام کررہے ہیں۔

۱۴ر ستمبر: آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ اندور میں مولانا نے، جو بیرونی معاملات کی کابینہ کمیٹی کے رکن ہیں، ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں ایک ریزولیوشن پیش کیا اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دو گروہوں میں سے کسی میں شامل ہو کر زیادہ سے زیادہ ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا چاہیے، مگر یہ خود غرضانہ تنگ نظر پالیسی نہ تو ہندوستان کے وقار میں اضافے کا باعث ہوسکتی ہے اور نہ عالمی امن کے لیے مفید، بلکہ اس سے عالمی امن کے خطرات میں اضافے کا امکان پایا جاتا ہے"۔

۱۲ر اکتوبر: آج صبح جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا جس میں مولانا نے شرکت کی۔

یکم نومبر: آج گرو نانک جی کے یوم پیدائش کے موقع پر دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "گرو نانک جی کسی ایک فرقے یا جماعت کے بزرگ نہیں تھے، بلکہ وہ جو پیغام لے کر اس دنیا میں آئے وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے تھا"۔

۱۹۵۳ء ۲۸ر دسمبر: آج یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نئی دہلی کے پہلے اجلاس میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "حکومت نے ۱۹۴۵ء میں اس کمیشن کو قائم کیا تھا جس کا کام صرف تین مرکزی یونیورسٹیوں کو مشورہ دینا تھا، اس کے علاوہ اس کے اختیارات بہت محدود تھے، اس لیے ۱۹۴۷ء تک کوئی کام نہ کرسکا۔ ۱۹۴۷ء میں کمیشن کی جدید تشکیل کی گئی اور ۱۹۵۲ء میں مزید توسیع کی گئی۔ حکومت کو احساس ہے کہ یونیورسٹیوں کی بڑھتی ہوئی مشکلات کو حل کرنے کے لیے فوری اقدام کی ضرورت ہے، چنانچہ گزشتہ نومبر کی قرارداد کے مطابق اس کو فوراً کام شروع کردینے کی اجازت دے

دی گئی ہے۔

۱۹۵۴ء ۴؍جنوری: آج صبح مولانا اپنی رہائشی کوٹھی میں پھسل کر گر پڑے اور ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر ایس کے سین نے ان کی ہڈی بٹھائی، ان کا کہنا ہے کہ چھ ہفتے کے بعد اپنے سرکاری فرائض انجام دینے کے لائق ہو جائیں گے، اس عرصے میں وہ صرف اہم کاغذات پر لیٹے لیٹے دستخط کر سکتے ہیں۔

" ۹؍جنوری: آج یونسکو کمیشن کانفرنس منعقدہ نئی دہلی میں مولانا کا خطبہ پڑھ کر سنایا گیا، جس میں انہوں نے فرمایا کہ آج کل مشرق کے طول و عرض میں یہ عام احساس پایا جاتا ہے کہ انجمن اقوام متحدہ اور اس کے خصوصی ادارے مشرق کی طرف اتنی توجہ نہیں کر رہے ہیں جتنی توجہ کے وہ مستحق ہیں۔

" ۷؍فروری: آج تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ کا اکیسواں اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا، چوں کہ مولانا اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، اس لیے ان کا خطبۂ صدارت پروفیسر ہمایوں کبیر نے پڑھ کر سنایا۔ مولانا نے طالب علموں کی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اس کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے تاکہ یونیورسٹیاں علم کا صحیح مرکز بن سکیں۔"

" ۱۲؍مارچ: آج نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز (ساہتیہ اکیڈمی) نئی دہلی کے پہلے اجلاس میں اکیڈمی کے فرائض اور سرگرمیوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: "اگر اکیڈمی اپنا اعلیٰ ترین معیار قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے اور اس طرح ادیب دل و جان سے کام کریں گے اور ان کی تصنیفات انسانی ورثے میں اضافے کا باعث ہوں گی۔"

" ۲۷؍مارچ: آج لوک سبھا میں بجٹ سیشن کے موقع پر اس وقت سخت تلخی پیدا ہو گئی جب پرشوتم داس ٹنڈن نے مرکزی حکومت کی لسانی پالیسی کی شدید مذمت کی، نیز انہوں نے مولانا آزاد پر الزام لگایا کہ ہندوستانی زبان کے اداروں کی طرف ان کا جھکاؤ ہے اور وہ ہندی اداروں کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتے ہیں، خصوصاً ہندی ساہتیہ سمیلن سے وہ خاصی بے رخی برتتے ہیں۔

" ۲۹؍مارچ: آج مولانا نے اپنی وزارت کے مطالباتِ زر کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے پرشوتم داس ٹنڈن اور دوسرے معترضین کو بہت تفصیل سے جواب دیا۔ مولانا کی یہ تقریر لوک سبھا کی تاریخ میں یادگار سمجھی جاتی ہے۔

" ۴؍ستمبر: جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا، جس میں مولانا آزاد نے شرکت کی۔

" ۸؍نومبر: تاریخ تحریک آزادی کمیٹی کی پہلی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا: "یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں نے یہاں سے جاتے وقت وہ تمام قیمتی کاغذات، جن میں زمانۂ تحریک آزادی میں قومی رہنماؤں کی سرگرمیوں کی رپورٹ تھی، جلا ڈالا، اب مرکزی حکومت کے محافظ خانے (آرکائیوز) میں ایک بھی ایسا کاغذ نہیں ہے جس سے تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے میں مدد مل سکے۔"

" ۱۴؍نومبر: آج کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے ایک جلسے میں جو پنڈت نہرو کی ۶۶ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کو مبارک باد دینے کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا تھا، مولانا نے ان کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی کرنے کے لیے ایک طویل عرصے تک زندہ رہیں گے۔

" ۱۷؍نومبر: لوک سبھا کے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا: "انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو کے سلسلے میں صدر جمہوریہ کو جو عرضداشت پیش کی گئی ہے، اس پر ابھی صدر جمہوریہ غور کر رہے ہیں۔"

۱۹۵۵ء ۱۹؍جنوری: کانگریس کے ۶۰ ویں اجلاس کی سبجکٹ کمیٹی میں اشتراکی طرز سماج کی قرارداد کی تائید کرتے ہوئے مولانا نے ایک طویل تقریر کی، انہوں نے فرمایا: "اس اصطلاح میں ہر طرز زندگی کی تمام اچھی باتیں شامل ہیں۔ اسی لیے کانگریس نے اشتراکی طرز زندگی کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔"

" ۲۳؍مئی: آج صبح مولانا آزاد ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں سے ۲۵؍مئی کو بذریعہ اسٹیمر براہ کراچی لندن کے لیے روانہ ہوں گے۔

" ۲۶؍مئی: مولانا آج کراچی بندرگاہ پہنچے، رات اسٹیمر ہی میں گزاریں گے اور کل لندن کے لیے روانہ ہوں گے، لیکن روانگی سے قبل پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی مولانا سے ملنے کے لیے آئیں گے۔

" ۸؍جولائی: لندن کی ایک پریس کانفرنس میں کل مولانا نے یہ ظاہر کیا کہ انڈیا آفس لائبریری کے مستقبل کا مسئلہ باہمی گفت و شنید کے ذریعے طے ہو جائے گا۔

〃 ۲۹ر جولائی : نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں مولانا نے اپنے دورۂ یورپ کا ذکر کرتے ہوئے بہت سختی سے کہا کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے سکریٹری کی یہ دلیل ایک منٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ انڈیا آفس لائبریری برطانوی حکومت کی ملکیت ہے۔

〃 ۹ر اگست : انڈیا آفس لائبریری کی منتقلی کے سلسلے میں مولانا نے لارڈ ہیوم کے خط کا جواب بھیج دیا ہے۔ خیال ہے کہ مولانا نے لکھا ہے کہ ہندوستان لارڈ ہیوم کے اس دعوے کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ انڈیا آفس لائبریری برطانیہ کی ملکیت ہے۔ اس خط کی ایک کاپی پاکستان بھیج دی گئی ہے۔

〃 ۱۱ر اگست : مولانا نے انڈیا آفس لائبریری کے سوال پر غور کرنے کے لیے یہ تجویز کیا ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ کے نمائندوں کی نئی دہلی میں ایک کانفرنس کی جائے۔ پاکستان بار بار یہ کہہ چکا ہے کہ یہ لائبریری ہندوستان اور پاکستان دونوں کی ملکیت ہے۔

〃 ۱۶ر اکتوبر : وزیر تعلیم مولانا آزاد کی اس تجویز کو کہ انڈیا آفس لائبریری کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ کے نمائندوں کی مشترکہ کانفرنس بلائی جائے، دولت مشترکہ کے سکریٹری لارڈ ہیوم نے اسے مسترد کرتے ہوئے لکھا کہ یہ لائبریری حکومت برطانیہ کی ملکیت ہے۔

〃 ۸ر نومبر : کانگریس ورکنگ کمیٹی نے آج وزیر اعظم نہرو، مولانا آزاد، پنڈت پنت اور صدر کانگریس ڈھیبر پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو پنجاب کے مسئلے پر اکالی لیڈروں سے بات چیت کر کے کوئی قطعی رائے قائم کرے گی۔

〃 ۷ر دسمبر : مولانا نے پنجاب کانگریس پارٹی کے ان لوگوں کو سخت انتباہ کیا جو وزیر اعلیٰ بھیم سین سچر اور پرتاپ سنگھ کیرول کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۱۹۵۶ء ۲۹ر فروری : مولانا کے سکریٹری اجمل خاں مولانا مہر کو لکھتے ہیں:

"مولانا کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا، دو ہفتے سے فریش ہیں، سب کام بند ہے، ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے، کل دباؤ نارمل تھا۔"

〃 ۲۷ر مارچ : اجمل خاں تقریباً ایک ماہ کے بعد پھر لکھتے ہیں: "حضرت مولانا بفضلہ رو بہ صحت ہیں، اگرچہ انہیں قطعی آرام کرنے

کی ہدایت ہے، اس لیے دفتر یا پارلیمنٹ بھی نہیں جاتے۔"

۱۹۵۷ء ۱۶ر جنوری : آج صبح مولانا کی صدارت میں مرکزی تعلیمی بورڈ کا ۲۴واں اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا: "ہم نے نظام تعلیم میں جو اصلاحات کی ہیں، وہ صرف اسی وقت خاطر خواہ نتائج حاصل ہو سکیں گی جب ان کو مخالفت اور مداخلت کے بغیر عمل میں لانے دیا جائے۔" تقریر کے آخر میں انہوں نے یہ امید ظاہر کی کہ بورڈ تعلیمی معیار میں اضافے کے لیے موثر اقدامات تجویز کرے گا۔"

〃 ۲۶ر جنوری : آج دوسرے انتخابات کے سلسلے میں مولانا نے لوک سبھا کی ممبری کے لیے اپنے کاغذات نامزدگی گوڑگاؤں پارلیمنٹری حلقۂ انتخاب سے ریٹرننگ افسر کے یہاں پیش کر دیے۔

〃 ۱۰ر مارچ : مولانا آج پنجاب کے گوڑگاؤں حلقۂ پارلیمنٹری سے لوک سبھا کے لیے منتخب ہو گئے۔ انہوں نے اپنے واحد حریف جن سنگھی امیدوار کو ۹۵۶۶۷ ووٹوں کی زبردست اکثریت سے شکست دے دی۔

〃 ۵ر دسمبر : مولانا سید حسین احمد مدنی کے انتقال پر مولانا آزاد نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا: "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ مرحوم اتر پردیش کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں میں تھے اور جب بھی کانگریس نے کوئی تحریک شروع کی تو انہوں نے اس میں شرکت کی۔"

۱۹۵۸ء ۷ر فروری : وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد اور جی ایم صادق نے ایک ساتھ مولانا آزاد سے ملاقات کی۔ خیال ہے کہ ریاستی انتخابات اور جی ایم صادق کی نئی پارٹی کے باہمی تعلقات پر اس ملاقات میں غور کیا گیا۔ اس سے قبل ان دونوں رہنماؤں نے مولانا سے الگ الگ ملاقات کی تھی۔

〃 ۱۴ر فروری : مولانا کی صدارت میں انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کا اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا کی صدارت میں کونسل کا یہ آخری اجلاس تھا۔

〃 ۱۵ر فروری : آج سہ پہر میں لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان پریڈ گراؤنڈ پر کل ہند انجمن ترقی اردو کی سہ روزہ اردو کانفرنس کا پہلا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں شروع ہوا، جس کا افتتاح وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کیا۔ افتتاح کے بعد مولانا نے ملک کے لسانی مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ مل چکی اور ہم نے اس پر دستور کی چھاپ لگا دی، اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اس کے ساتھ ہی اردو کا جو جائز مقام ہے وہ ابھی اسے ملنا باقی ہے۔ اس کا یہ حق اسے ملنا چاہیئے۔" مولانا کی اس تقریر کی خاص اہمیت یہ ہے کہ یہ ان کی زندگی کی آخری تقریر ہے۔

۲۲ر فروری: آج رات کو سوا دو بجے مولانا آزاد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۲ بجے دوپہر کو مرحوم کا جنازہ اٹھایا گیا اور جامع مسجد کے سامنے نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس سے سات روز قبل اردو کی حمایت میں جو آخری تقریر کی تھی، پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں: "کسے خیال تھا کہ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد، اسی دن، اسی وقت اور اسی جگہ لاکھوں کا سوگوار ہجوم انہیں دفن کرنے کے لیے جمع ہوگا۔"

کتابیات

مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی تاریخوں میں خاصا اختلاف ہے، اس کے علاوہ ان کا شجرۂ نسب کسی مستند کتاب یا مضمون میں میری نظر سے نہیں گزرا، اس لیے احتیاطاً میں نے ان دونوں چیزوں کو جناب مالک رام صاحب کو دکھلا لیا ہے اور انہوں نے ازراہ کرم حسب ضرورت مفید مشورے دیتے ہیں۔ خاص طور پر شجرۂ نسب پر ان کی گہری نظر ہے۔ نیز اس مضمون کی تیاری میں الہلال والبلاغ اور مولانا آزاد کے خطوط سے مدد لی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حسب ذیل اخبارات اور کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ سہ روزہ مدینہ (بجنور) از ابتدا تا ۱۹۵۸ء
۲۔ روزنامہ ہمدم (لکھنؤ) متفرق شمارے
۳۔ روزنامہ زمیندار (لاہور) متفرق شمارے
۴۔ ابوالکلام آزاد : تذکرہ
۵۔ 〃 : ہماری آزادی (ترجمہ: محمد مجیب)
۶۔ عبدالرزاق ملیح آبادی : ذکر آزاد
۷۔ قاضی محمد عدیل عباسی : تحریک خلافت
۸۔ ابوسلمان شاہجہانپوری : امام الہند (تعمیر افکار)
۹۔ عابد رضا بیدار : مولانا ابوالکلام آزاد

●●

پتہ: ۳۴۹ ذاکر نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

بقیہ: مولانا آزاد کی تاریخ ولادت

کی ننھیال اور ددھیال کے دونوں گھرانے بھی ٹھیٹ اسلامی بلکہ علماء کے تھے۔ پس تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں جگہ ہجری کے سوائے کوئی اور تقویم استعمال ہوتی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ذی الحجہ کا مہینہ بھی ملتا ہے۔ یقیناً بتانے والے نے انہیں دن اور تاریخ بھی بتائی ہوگی، جو وہ بھول گئے۔ لیکن جتنی معلومات میسر ہیں، یہ بھی کچھ کم نہیں۔

یکم ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ عیسوی تقویم کے لحاظ سے جمعرات ۹ راگست ۱۸۸۸ء کو تھی۔[۵] یہ مہینہ ۲۹ دن کا تھا، اسی کے ساتھ سال ۱۳۰۵ھ ختم ہوگیا۔ یکم محرم ۱۳۰۶ھ مطابق تھی جمعہ، ستمبر ۱۸۸۸ء کے اور ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء کہیں اتوار، ربیع الاول ۱۳۰۶ھ کو ہوئی۔ کہاں ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ اور کہاں ربیع الاول ۱۳۰۶ھ! یہ نہ ان کے تاریخی نام (فیروز بخت) سے میل کھاتی ہے، نہ تاریخ ولادت (جواں بخت و جواں طالع / جواں باد) کے مطابق ہے۔ ان دونوں سے (۱۳۰۵) برآمد ہوتے ہیں پس "۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء" بہر حال غلط اور ناقابل قبول ہے۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے[۶] کہ مولانا آزاد نے ایک موقع پر خود انہیں اپنی صحیح تاریخ ولادت ۸ یا ۹ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ بتائی تھی۔ انھوں نے اسے ۱۷ یا ۱۸ راگست ۱۸۸۸ء کے مطابق قرار دیا ہے۔ یہ اس جنتری کے مطابق ہوگا جو ان کے سامنے تھی۔ میں نے جس جنتری کا حوالہ دیا ہے، اس کی رو سے یہ تاریخیں ۱۶ر اور ۱۷ر اگست کو پڑیں گی۔ ان تقابلی جنتریوں میں ایک آدھ دن کا تفاوت عام طور پر ملتا ہے۔

خود میں نے ایک مرتبہ مولانا مرحوم سے اس مسئلے سے متعلق بات کی تھی۔ انھوں نے کسی تاریخ کا تعین تو نہیں کیا، لیکن میں نے ان کے بتائے ہوئے کوائف سے اندازہ کیا تھا کہ وہ بدھ ۲۲ راگست ۱۸۸۸ء یعنی ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ کو پیدا ہوئے تھے اور یہ میں لکھ بھی چکا ہوں۔[۷]

غرض کہ وہ ۱۷، ۱۸ راگست ۱۸۸۸ء کو پیدا ہوئے ہوں یا ۲۲ راگست ۱۸۸۸ء کو، ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء کو بہر حال نہیں ہوئے، یہ تاریخ یقیناً ٹھیک نہیں ہے۔ یقینی بات صرف یہ ہے کہ وہ ۹ راگست اور ۶ ستمبر ۱۸۸۸ء کے درمیان کسی دن پیدا ہوئے اور ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء ان کی تاریخ ولادت نہیں ہے۔

۵۔ میں نے تاریخوں کے لیے Indian Ephemeris (A.D.1800 to A.D. 2000) مؤلفہ دیوان بہادر سوامی کنو پلے استعمال کی ہے (مطبوعہ مدراس ۱۹۱۵ء)

۶۔ ماہنامہ جامعہ نئی دہلی، شمارہ فروری ۱۹۸۸ء، ص ۳۶

۷۔ ابوالکلام آزاد (احوال و آثار) مرتبہ مسعود الحسن عثمانی، ص ۵۲

محمد رضا انصاری فرنگی محلی

مولانا ابوالکلام آزاد کا تحریکِ خلافت میں حصہ ●

مولانا ابوالکلام آزاد نے تحریکِ خلافت میں جو سرگرم حصہ لیا بلاشبہ وہ تحریک کی تاریخ کا وہ کبھی نہ مٹنے والا حصہ ہے۔ تحریک کو عوام تک پہنچانے اور اسے مقبولِ عام بنانے میں صف اول کے سبھی ہندو مسلمان رہنماؤں کی طرح مولانا آزاد نے بھی ملک کے طول و عرض میں ان تھک دورے کیے اور اپنی خداداد خطابت کے ذریعے عوام و خواص کے اندازِ فکر میں انقلاب پیدا کر دیا لیکن اس سلسلے میں انہوں نے اور بھی جو کچھ کیا، وہ تفصیل چاہتا ہے۔

مسئلۂ خلافت:

تحریکِ خلافت کی بنیاد "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" کے بارے میں ان وعدوں اور معاہدوں کے ایفاء و تکمیل کا مطالبہ تھی جو پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں برطانوی حکومت نے مسلمانانِ عالم اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کیے تھے۔ سلطنتِ ترکی جنگِ عظیم اول میں برطانیہ کی حریف تھی ایسی جنگ میں مسلمانوں کا برطانیہ سے تعاون کرنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ برطانیہ اور اس کے حلیفوں (فرانس و امریکہ و روس) کی فتح کی صورت میں حریف ترکی کو جو سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا نیز سلطنتِ ترکی کا حکمران "خلیفۃ المسلمین" مانا جاتا تھا۔ اور اسی کے زیرِ اقتدار جزیرۃ العرب بھی تھا جس میں مسلمانوں کے "مقدس مقامات" واقع ہیں، قوی اندیشہ تھا کہ ترکی کی شکست کے نتیجے میں "خلیفۃ المسلمین" کی سیاسی حیثیت کے ساتھ اس کی روحانی حیثیت بھی خطرے میں پڑ جائے گی اور اس کے اقتدار سے مقاماتِ مقدسہ بھی نکل جائیں گے۔ اس جنگ میں تعاون کرنے سے مسلمان بھی ترکی اور خلیفۃ المسلمین کے زوال میں حصہ دار بن جائیں گے۔

وسط ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ ترکی نومبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے خلاف میدانِ جنگ میں آ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو مذکورہ اندیشے بری طرح پریشان کرنے لگے۔ برطانیہ کی رعایا ہونے کی حیثیت سے جنگ میں عام حمایت کریں یا مسلمان ہونے کی حیثیت سے پہلے مسئلۂ خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے لیے برطانوی حکومت سے قول و قرار لیں۔

برطانوی حکومت نے مسلمانانِ ہند کی اس فکرمندی کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے جنگ کے بارے میں اپنی پالیسی کا، ہندوستان میں وائسرائے ہند کے ذریعے اور برطانیہ میں وزیرِ اعظم برطانیہ کی پارلیمنٹ میں تقریر کے ذریعے صاف و صریح الفاظ میں اعلان کیا کہ یہ جنگ مذہبی نہیں ہے اور اس کے دائرے سے مقاماتِ مقدسہ کو دور رکھا جائے گا۔ نیز خلیفہ کی مذہبی ... مجروح نہ ہونے دیا جائے گا۔ ۱۹۱۸ء میں جب برطانیہ کی فتح اور ترکی اور اس کے حلیف جرمنی کی شکست پر جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا تو حکومتِ برطانیہ کے تیور بدل گئے اور مسلمانانِ ہند سے کیے ہوئے وعدوں سے مکر جانے کے قرائن اور شواہد یکے بعد دیگرے نظر آنے لگے۔

پورے برصغیرِ ہند میں مسلمان صاف نظر آنے والے اندیشوں کے پیشِ نظر شدید ترین ہیجان میں مبتلا ہو کر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے اور اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے جب کوئی ایسا "طریقہ کار" نہ پاتے، جس کے ذریعے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہو تو اظہارِ رنج و الم اور فریاد و فغاں کے ذریعے برطانیہ کے سیاسی اغراض و مقاصد کو متاثر کرنے کی ناکام سعی کرتے۔ یہ بھی بلاشبہ واضح تھا کہ محض مسلمانانِ ہند کے کسی بھی عملی اقدام سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے تھے جو ہندو مسلمانوں کے کسی مشترکہ عملی اقدام سے برآمد ہو سکتے تھے۔

● ۹۔ فرنگی محل، چوک، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳

جنگِ عظیم اوّل کے دوران میں مسلمانانِ ہند کے صفِ اول کے اکثر رہنما قید و نظر بندی میں صبح و شام کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، رانچی (بہار) میں ۱۹۱۶ء سے نظر بند تھے۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں ان کی نظر بندی ختم ہوئی۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی ۱۹۱۵ء میں نظر بند ہو گئے تھے۔ آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں قید و بند سے آزاد ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی جو اپنے رفقاء کے ساتھ (جن میں مولانا سید حسین احمد مدنی بھی شامل تھے) جزیرۂ مالٹا میں اسیر تھے، رہا ہو کر جون ۱۹۲۰ء میں ہندوستان پہنچے۔

میدانِ عمل میں علماء میں صرف مولانا عبدالباری فرنگی محلی (وفات: ۱۹۲۶ء) اور سیاسی رہنماؤں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری (وفات: ۱۹۳۶ء) حکیم اجمل خاں (وفات ۱۹۲۷ء) اور مولانا حسرت موہانی (وفات ۱۹۵۱ء) تھے۔ مولانا حسرت ۱۹۱۸ء ہی میں نظر بندی سے رہا ہوئے تھے۔

گاندھی جی کی آمد

جنوبی افریقہ کے ہیرو موہن داس کرم چند گاندھی جنگِ عظیم کے آغاز کے وقت (۱۹۱۴ء میں) لندن میں تھے۔ ۱۹۱۵ء میں جب وہ ہندوستان واپس لوٹے تو لندن میں موجود بعض ہندوستانی مسلمانوں سے، جن میں شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹر ایٹ لا (تعلقدار ریاست گدیہ ضلع بارہ بنکی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" پر تبادلۂ خیال کر کے ایک رائے اس مسئلہ میں بنا چکے تھے۔ شیخ مشیر حسین قدوائی (وفات ۱۹۳۷ء) دورانِ جنگِ عظیم اوّل میں لندن میں مقیم ہو کر "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" پر مضامین اور مراسلے لکھ کر مسلمانانِ ہند بلکہ مسلمانانِ عالم کے نقطۂ نظر کی تبلیغ میں مصروف رہے اور ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔

اس سے قبل ۱۹۱۳ء میں جب لکھنؤ، فرنگی محل میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے "انجمن خدام کعبہ" کی تشکیل کی تو مولانا انجمن کے صدر (خادم الخدام) اور شیخ مشیر حسین قدوائی اور مولانا شوکت علی سکریٹری (معتمد خادم الخدام) ہوئے۔ شیخ صاحب نے ہی لندن سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو خط لکھ کر مسٹر ایم۔ کے۔ گاندھی سے "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" کے معاملے میں رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

۱۹۱۸ء میں جب ہندوستانی مسلمان اور ان کے رہنما "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" کے بارے میں ہیجان میں مبتلا تھے اور انہیں کوئی عملی طریقہ سوجھ نہیں رہا تھا تو مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور گاندھی جی میں دہلی میں گفتگو ہوئی۔ گاندھی جی نے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی ذمہ داری اپنی شرائط کے مطابق قبول کر لی، اس لیے کہ بقول خود ان کے مسلمانوں کا مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں "مطالبہ مبنی بر انصاف تھا"۔

مرکزی خلافت کمیٹی:

۱۹۱۹ء کے شروع میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے بعض معتقدوں نے (مارچ کے مہینے میں) "بمبئی خلافت کمیٹی" کی تشکیل کی، جس کے صدر سیٹھ میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی اور سکریٹری حاجی احمد صدیق کھتری تھے۔

۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں مسلمانانِ ہند کی جو نمائندہ کانفرنس ہوئی جس کے صدر مسٹر ابراہیم ہارون جعفر تھے اس میں مرکزی خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر سیٹھ چھوٹانی قرار پائے اور سکریٹری خلافت کمیٹی کا عہدہ ... دفتر بمبئی میں رکھا پایا۔ اس کے بعد پہلی "آل انڈیا خلافت کانفرنس" ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں ہوئی۔ جس میں گاندھی جی خاص طور پر شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں جو خاص سوال زیرِ غور آیا وہ یہی تھا کہ اگر شرائطِ صلح میں (اتحادیوں کی طرف سے) سلطنتِ ترکی کے ساتھ انصاف سے کام نہ لیا گیا تو عملی قدم کیا اٹھایا جائے۔

اتفاقِ رائے سے طے پایا کہ حکومتِ برطانیہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ کو جو جشنِ صلح منانے جا رہی ہے اس کا بائیکاٹ کیا جائے اور یہ بھی اتفاقِ رائے سے طے پا گیا کہ ایک خلافت وفد انگلستان اس غرض سے بھیجا جائے کہ برطانیہ کو "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" سے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرے۔ یہ وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں فروری ۱۹۲۰ء میں لندن گیا اور اکتوبر میں ناکام واپس آ گیا۔ اس اجلاس میں انگریزی مال کے بائیکاٹ کی تجویز بھی آئی اور حکومت سے عدم تعاون کی تجویز بھی۔ ان دونوں تجویزوں کے سلسلے میں دو کمیٹیاں بنا دی گئیں جو دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں ہونے والی دوسری آل انڈیا خلافت کانفرنس میں اپنی سفارشات پیش کریں گی۔

تحریکِ خلافت میں غیر مسلم برادرانِ وطن کی تائید حاصل کرنا از بس ضروری امر تھا۔ پہلی آل انڈیا خلافت کانفرنس (نومبر ۱۹۱۹ء) کے دوسرے ہی دن مسلمانوں نے ایک ہندو مسلم اتحاد کانفرنس بھی منعقد کی۔ گاندھی جی اس اتحاد کانفرنس میں بھی شریک ہوئے اور بعض دوسرے غیر مسلم رہنما بھی۔

دوسری آل انڈیا خلافت کانفرنس آخر دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں ہوئی جس میں طے پایا کہ وائسرائے ہند کے پاس ایک وفدِ خلافت بھیجا جائے۔ "عدم تعاون" انگریزی مال کے بائیکاٹ کی تجویزوں پر کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوا۔

مولانا آزاد میدانِ عمل میں:

جنوری ۱۹۲۰ء کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد نظر بندی سے رہا ہوئے:

اور وفد اس وقت پہنچے جب وائسرائے ہند سے وفد خلافت ملنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک توجہ نامہ تیار کر لیا گیا تھا جس پر ارکانِ وفد کے دستخط لیے جا رہے تھے۔ مولانا آزاد کی اس موقع پر گاندھی جی سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ مولانا کی اس سے قبل ہی رائے بن چکی تھی کہ "مسئلۂ خلافت و مقاماتِ مقدسہ" کے سلسلے میں عرض و معروض کا وقت گزر چکا ہے۔ براہِ راست اقدام کے لیے ملک کو تیار ہو جانا چاہیے۔ مولانا نے توجہ نامے پر دستخط تو کر دیے مگر وفد کے دیگر ارکان کے ساتھ وائسرائے سے ملنے جانے سے انکار کر دیا۔ یہ وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں وائسرائے سے ملا۔ نتیجہ وہی نکلا جو مولانا آزاد نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

اس وقت براہِ راست اقدام کی ضرورت کے پیشِ نظر گاندھی جی اپنے نظریۂ عدم تشدد (اہنسا) کو منوانے اس کے بعد عدم تعاون کا پروگرام شروع کرنے کے مسئلے پر مسلم رہنماؤں سے سرگرم تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ مولانا آزاد بھی اس تبادلۂ خیال میں شریک ہوئے اور گاندھی جی کے پیش کردہ عملی طریقۂ کار کو مولانا آزاد نے اس طرح قبول کیا کہ جیسے یہ ان ہی کے دل کی بات ہے۔

خلافت کمیٹی کی حکومت سے "عدم تعاون" کی تجویز ہنوز زیرِ غور تھی۔ اصولی طور پر اُسے مان لیا گیا تھا مگر طریقۂ کار کی تفصیلات پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ گاندھی جی بھی جانتے تھے اور خلافتی رہنما بھی کہ "عدم تعاون" اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا، جب تک برادرانِ وطن بھی اس کے ہم نوا نہیں ہو جاتے۔ برادرانِ وطن سے اس موضوع پر گاندھی جی برابر تبادلۂ خیال کرتے رہے تھے۔

مولانا آزاد کا اعلانِ جنگ :

مسئلۂ خلافت و جزیرۃ العرب کا مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑا ہیجانی مسئلہ تھا۔ مگر اس کا براہِ راست تعلق سرزمینِ ہند سے نہ تھا، اس لیے برادرانِ وطن ہی نہیں، خود خلافتی مسلمان بھی "یہ رہنما الاکیاعامۃ الناس" اس مسئلے کے پورے خط و خال سے کماحقہ واقف نہ تھے۔ مولانا آزاد پہلے مسلم رہنما تھے جنہوں نے مسئلۂ خلافت و جزیرۃ العرب کے بارے میں ایسا واضح، مفصل اور مدلل بیان دیا اور ایسے دل نشین انداز میں کہ مسئلۂ خلافت کی مذہبی اور سیاسی اہمیت ملک بھر کے سامنے آگئی۔ بلکہ برطانوی حکومت پر بھی اس کی اہمیت عیاں ہو گئی۔ ابھی تک جو مسئلہ وقتی جذبات سے وابستہ سمجھا جاتا تھا اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گا اب مسلمانوں کا ایسا مسئلہ بن کر ابھر آیا کہ اس سے انحراف قومی و ملی مقاصد سے انحراف کے مرادف قرار پایا۔

مولانا کا یہ بیان بنگال خلافت کمیٹی کی صوبہ کانفرنس کا، جو ۲۸ ر ۲۹ ر فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں منعقد ہوئی، خطبۂ صدارت کی شکل میں سامنے آیا! یہ خطبۂ صدارت، تحریکِ خلافت کے کارکنوں کے لیے جو ابھی تک وفورِ جذبات میں ایک طرح سے اندھیرے میں راستہ ٹٹول رہے تھے، چراغِ راہ ثابت ہوا۔ قرآن، حدیث و فقہ کے حوالوں سے مولانا آزاد نے ایک طرف مسئلۂ خلافت و جزیرۃ العرب کی اہمیت اور مسلمانانِ عالم کے لیے اس کی ضرورت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ دوسری طرف تحریکِ خلافت کے مخالفین (حکومت کے آلۂ کار مسلمانوں) کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا مدلل و مسکت جواب بھی دیا۔ مخالفین تحریک غیر مسلموں سے اتحاد کرنا ناجائز اور ممنوع قرار دے رہے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت لازم ٹھہرا رہے تھے۔ اس لیے کہ "رعایا پر حاکم کی اطاعت فرض ہے۔ نیز یہ کہ خلافت کا منصب قریش کے لیے ہے، ترک قریشی نہیں ہیں، اس لیے ان کی خلافت غیر شرعی اور ناقابلِ تسلیم ہے" وغیرہ وغیرہ۔

مولانا آزاد نے قرآنِ پاک کے ارشاد کے مطابق غیر مسلموں کی دو قسمیں سمجھائیں۔ ایک قسم وہ جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو اور مسلمانوں کی سرزمین سے انہیں نکالنے کی کوشش کر رہی ہو (جیسے انگریز اور فرانس وغیرہ) ان سے اتحاد ممنوع اور ناجائز ہے۔ دوسری قسم وہ جو نہ مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو نہ ان کی سرزمین سے انہیں بے دخل کر رہی ہو (جیسے برادرانِ وطن) غیر مسلموں کی اس قسم کے ساتھ اشتراک و موالات جائز ہے۔

ترکِ موالات :

اپنے خطبہ میں مولانا آزاد عہدِ رسالت کے ایک تاریخی واقعہ کے حوالے سے اس نتیجہ تک ذہن کو لے گئے کہ وہ مسلمان بھی جو مسلمانوں کے قومی و اجتماعی مسائل سے بے تعلقی کا انداز اختیار کریں نہ صرف قابلِ ملامت ہیں بلکہ اُن سے دوستی اور موالات کا ترک اسوۂ رسول کے عین مطابق ہے۔

مولانا آزاد کی "ترکِ موالات" کی یہ اصطلاح پوری تحریکِ خلافت پر چھا گئی اور اس کی شرعی حیثیت بھی مسلّم ہو گئی۔ عدم تعاون یا نان کوآپریشن کی تجویز ابھی خلافت رہنماؤں میں زیرِ غور تھی کہ مولانا آزاد نے ترکِ موالات کا بگل بجا دیا۔ ملک کی فضا پر ترکِ موالات یا نان کوآپریشن کا سوال اس طرح چھا گیا کہ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات ایک ہی تحریک کے دو رخ مانے جانے لگے۔ مولانا کے اس خطبۂ صدارت کا تحریکِ خلافت کی تاریخ میں وہی مقام ہو گیا جو کسی بھی ملک میں کسی آئین اور دستور کا ہوتا ہے۔

مولانا کا یہ خطبہ ایک برجستہ زبانی تقریر تھی، جو اُس وقت قلمبند کرلی گئی تھی۔ پھر مولانا کی نظرِ ثانی کے بعد یہ کتابی شکل میں مسئلۂ خلافت و جزیرۃ العرب کے نام سے شائع کیا گیا۔ افسوس کی بات ہے کہ اشاعت کے وقت مولانا آزاد کی برجستہ تقریر کے وہ حصے کتاب میں شامل نہیں کیے گئے جو سیاسی اور ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ یا دنیا کے مستقبل اور عالمگیر امن کا مسئلہ وغیرہ۔ جیسا کہ کتاب کے ناشر مولانا محمد اکرم خاں (آنریری سکریٹری بنگال صوبۂ خلافت کمیٹی) نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا اور وعدہ کیا کہ ان مباحث کو علیحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ حالانکہ ترکِ موالات پر عملدرآمد کے پہلو سے ہندو مسلم اتحاد و اشتراک کا معاملہ سب سے اہم تھا۔ جس کی بضرورت ترکِ موالات یا (نان کوآپریشن) کے بڑے بڑے خلافتی رہنما بھی محسوس کر رہے تھے۔ یہاں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ ترکِ موالات کی تجویز سب سے پہلے خلافتی رہنماؤں نے پیش کی تھی، جسے اصولی طور پر گاندھی جی نے مان لیا تھا اور قومی جماعت انڈین نیشنل کانگریس سے اسے منوانے کی مختلف تدبیریں کر رہے تھے، مگر کانگریسی رہنما ترکِ موالات کی موثر افادیت کے بارے میں مشکوک سے تھے۔

پے در پے اتفاقات نے بالآخر پورے ملک کی سیاسی فضا کو ترکِ موالات کے حق میں سازگار بنا دیا۔ اس کی کچھ تفصیل بیان کر دینا مناسب ہوگا:

پہلی آل انڈیا خلافت کانفرنس ۱۹۱۹ء (دہلی) میں پہلی بار عدم تعاون کی جو تجویز خلافتی رہنماؤں نے پیش کی تھی جس پر مزید غور و خوض کے بعد ایک سب کمیٹی بنا دی گئی تھی جو دوسری آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ امرتسر دسمبر ۱۹۱۹ء میں اپنی سفارشات پیش کرتی۔ امرتسر خلافت کانفرنس میں بھی عدم تعاون کا معاملہ فیصل نہیں ہوا۔ اس کے بعض پہلو ہنوز زیرِ غور رہے۔ اگرچہ خلافتیوں کا انتہا پسند گروہ عدم تعاون پر فوری عمل درآمد کا مطالبہ کر رہا تھا۔ تیسری آل انڈیا خلافت کانفرنس وسط فروری ۱۹۲۰ء میں بمبئی میں ہوئی۔ اب مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی میدانِ عمل میں تھے اور مولانا آزاد بھی۔ گاندھی جی جیسا تجربہ کار رہنما اس وقت تک تحریک شروع کرنے پر آمادہ نہ تھا جب تک تحریک کے تمام نشیب و فراز پوری طرح زیرِ غور نہ آجائیں۔ بمبئی خلافت کانفرنس میں (وسط فروری ۱۹۲۰ء) خلافتیوں کے انتہا پسند اور معتدل گروہوں میں صدرِ اجلاس مسٹر چھوٹانی کے اس مشورہ پر سمجھوتہ ہو گیا کہ کوئی بھی اقدام اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک خلافت وفد کی انگلستان میں سرگرمیوں کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آجائے۔ لیکن چند ہی روز کے اندر ایک اور واقعہ پیش آگیا۔ آرچ بشپ آف کنٹربری (انگلستان) نے ایک تقریر کر دی جس میں ترکوں سے صلیبی جنگوں — عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تقریباً ۷۰۰ برس قبل فلسطین پر قبضہ کے لیے مذہبی جنگوں — کا حساب چکانے کی بات کہہ دی۔ اس تقریر نے ہندوستانی مسلمانوں میں سخت ترین اشتعال پیدا کر دیا۔

بنگال صوبۂ خلافت کانفرنس ۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو اسی اشتعال اور ہیجان کی فضا میں زیرِ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوئی۔ جس میں بمبئی خلافت کانفرنس کا مشورہ کہ وفدِ خلافت کی انگلستان سے واپسی کا انتظار کیا جائے، برطرف ہو گیا۔ اور اسی صوبۂ خلافت کانفرنس میں جس میں گاندھی جی بھی شریک تھے، طے پا گیا کہ اگر مسئلۂ خلافت کے سلسلے میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا فیصلہ نامناسب ہوا تو ترکِ موالات کی تجویز پر فوراً عملدرآمد شروع کر دیا جائے گا۔ کسی بھی صوبائی کانفرنس کا فیصلہ از روئے آئین اس وقت تک ملک کے لیے تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک مرکز اس کی توثیق نہ کر دے۔ مگر اس صوبائی کانفرنس کا جوش و خروش دیکھ کر گاندھی جی بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ حالات اس نقطۂ عروج تک پہنچ گئے ہیں کہ اب کسی فوری اقدام سے صرفِ نظر ممکن نہیں رہا ہے۔

انہوں نے صوبہ بنگال خلافت کانفرنس کے آٹھ دس روز بعد تحریکِ خلافت کا ایک احتجاجی منشور شائع کیا جس میں ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو ملک بھر میں یومِ خلافت منانے اور ملک گیر ہڑتال کرنے کے اس فیصلے کو منظور کر لیا جو صوبہ بنگال خلافت کانفرنس نے کیا تھا۔

ترکِ موالات کے تین مراحل مقرر کیے گئے تھے: (۱) سرکاری خطابات و اعزازات کی واپسی (۲) سرکاری کونسلوں اور سرکاری ملازمتوں سے، جن میں فوج اور پولیس کی ملازمت بھی شامل تھی، استعفے (۳) سرکاری ٹیکسوں کی عدم ادائیگی۔

ترکِ موالات کی کامیابی کے لیے برادرانِ وطن کا تعاون حاصل کرنے کے لیے گاندھی جی نے مارچ ۱۹۲۰ء میں ہندو مسلم اور غیر مسلم رہنماؤں کے ساتھ ترکِ موالات کے منصوبے اور پروگرام پر تبادلۂ خیال کیا۔ غیر مسلم رہنماؤں میں لالہ لاجپت رائے (پنجاب) پنڈت مدن موہن مالویہ (یوپی) اور مہاراج تلک (مہاراشٹر) شامل تھے۔ ترکِ موالات پر مزید غور کرنے اور اس کے لیے جامع پروگرام طے کرنے کے لیے ایک طرف گاندھی جی نے ایک مشترکہ سب کمیٹی اسی ماہ (مارچ ۱۹۲۰ء) میں بنائی، جس میں گاندھی جی کے علاوہ لالہ لاجپت رائے، حکیم اجمل خاں، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد شامل تھے۔ دوسری طرف مرکزی خلافت کمیٹی نے بھی ترکِ موالات کے پروگرام کی تفصیلات طے کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنائی جس میں مرکزی خلافت کمیٹی کے صدر میاں سیٹھ چھوٹانی کے علاوہ مولانا شوکت علی

مولانا ابوالکلام آزاد اور حاجی احمد صدیق کھتری شامل تھے۔

دونوں کمیٹیاں ابھی غور و تبادلۂ خیالات کر رہی تھیں کہ اتحادیوں کی طرف سے ترکی کے ساتھ شرائطِ صلح کا اعلان ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو ہو گیا۔ یہ شرائطِ صلح ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک کاری ضرب ہیں" خلافت کمیٹی کے ترجمان اور راہبر گاندھی جی نے ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا۔ مسلمانوں کو جو اندیشے تھے وہ اب حقیقت حال بن گئے تھے۔ اور ضرب المثل کے مطابق بلی تھیلے کے باہر آ گئی۔ گاندھی جی کی ہدایت پر مرکزی خلافت کمیٹی نے ترکِ موالات (نان کوآپریشن) کے سوال پر فوراً ایک مشترک ہندو مسلم جلسہ بلایا۔ مرکزی خلافت کمیٹی نے جون ۱۹۲۰ء کی پہلی، دوسری اور تیسری تاریخ الٰہ آباد میں اپنا جلسہ طلب کر لیا جس میں سربر آوردہ غیر مسلم رہنماؤں کو بھی مدعو کیا گیا۔ الٰہ آباد کے قریب ہی بنارس میں مئی ۱۹۲۰ء کی آخری تاریخوں میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا، جس کے اختتام پر کانگریسی رہنماؤں کا الٰہ آباد پہنچنا آسان تھا۔ پھر بھی چند ہی غیر مسلم رہنماؤں نے خلافت کانفرنس میں شرکت کی۔ کانگریس کے دوسرے غیر مسلم رہنما اور بعض مسلم رہنما، ترکِ موالات کی افادیت کے قائل نہ تھے۔ وہ شرکت پر آمادہ نہ ہوئے جو غیر مسلم کانگریسی رہنما شریک بھی ہوئے وہ خلافتی رہنماؤں کی ترکِ موالات کے حق میں پُر زور تقریروں سے کچھ زیادہ متاثر نہ ہو سکے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ترکِ موالات کے سوال کو طے کرنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک خصوصی اجلاس شروع ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں منعقد ہو گی۔ اس وقت تک گاندھی جی کانگریس کے صفِ اول کے قائدین میں شمار نہیں ہوتے تھے۔ اور تحریکِ خلافت کے قائد کی حیثیت سے وہ غیر مسلم رہنماؤں سے گفتگو کرتے تھے۔

مرکزی خلافت کمیٹی نے الٰہ آباد کے اجلاس میں گاندھی جی کی موجودگی میں ترکِ موالات کا قطعی فیصلہ کر لیا اور گاندھی جی کو مطلق اختیارات دے کر ترکِ موالات کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا جس کے ممبران میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو (پنجاب) اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ تھے۔ یہ کمیٹی کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھی۔ گاندھی جی نے اپنے معمول کے مطابق تحریک شروع کرنے سے قبل افہام و تفہیم کا آخری موقع اس فریق کے لیے نکالنا ضروری سمجھا جس کے خلاف وہ تحریک شروع کرنے والے تھے۔ انہوں نے ۲۲ جون کو وائسرائے لارڈ چیمس فورڈ کو لکھا کہ وہ اپنے اثرات استعمال کر کے ترکی کے ساتھ شرائطِ صلح میں تبدیلی کرائیں۔ ورنہ خود مستعفی ہو جائیں اور یکم اگست تک ان کو مہلت دی۔

جون کی آخری تاریخوں میں خلافتی رہنماؤں کا ایک وفد اتمامِ حجت کے طور پر وائسرائے سے ملا۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مسٹر مظہر الحق بیرسٹر (بہار) اور سیٹھ یعقوب حسن (مدراس) شامل تھے۔

مظالم پنجاب:

اس بیچ ایک اتفاق اور بھی مئی ۱۹۲۰ء میں نمودار ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب حکومت نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ہندو مسلمانوں کے پُر امن احتجاج کو جس طرح کچلا تھا اور مارشل لا نافذ کر کے صوبائی سرکار نے جو مظالم ڈھائے تھے اس کی تحقیقات کے لیے انگریزی سرکار نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جو ہنٹر کمیشن کہلاتا تھا۔ ۲۸ مئی ۱۹۲۰ء کو ہنٹر کمیشن کی رپورٹ شائع ہو گئی۔ جس میں مجموعی طور پر پنجاب میں مارشل لا کے تحت کی گئی کارروائیوں کو حق بجانب اور بڑی حد تک افسران کو بے قصور قرار دیا گیا تھا۔ اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ سارا ہندوستان چیخ اٹھا۔ گاندھی جی نے ہنٹر کمیشن کی رپورٹ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا "اگر ہم ہندوستانی اپنے کو واقعی ایک قوم سمجھتے ہیں تو اب ہمیں حکومت سے ہر قسم کا تعاون ترک کر دینا اپنا فریضہ سمجھنا چاہیے"۔

تحریکِ ترکِ موالات، مطالبۂ خلافت کے سبب شروع ہونے والی تھی۔ اب "مظالم پنجاب" کا معاملہ بھی اس تحریک کا ایک قومی سبب بن گیا۔ اس قومی سبب میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ تھی۔

نئی کونسلیں:

۱۸-۱۹۱۷ء میں وزیرِ ہند مانٹیگو اور وائسرائے ہند لارڈ چیمس فورڈ نے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کی جو سفارشات کی تھیں ان میں صوبوں میں قانون ساز کونسلوں کا قیام بھی شامل تھا۔ کانگریس کمیٹی ان کونسلوں میں جانے کے حق میں تھی۔ ہنٹر کمیشن کی رپورٹ شائع ہوتے ہی پورے ملک میں جو برہمی پھیلی، اس نے کونسلوں کے بائیکاٹ کا رجحان عام کر دیا۔ مئی ۱۹۲۰ء میں نئی آئینی اصلاحات کے تحت قائم کی جانے والی نئی کونسلوں کے قواعد و ضوابط کا مسودہ حکومت نے شائع کر دیا۔ جو قومی پہلو سے اتنے ناقص نکلے کہ کانگریس کمیٹی اور خلافت کمیٹی دونوں نے کونسلوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ لے لیا۔ ان حالات میں ملک بھر کی سیاسی فضا اتنی گرم ہو گئی کہ ترکِ موالات کا متفقہ رجحان عام ہو گیا۔

ایسے سیاسی رجحان میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں ہونے والے آل انڈیا کانگریس کے خصوصی اجلاس میں ترکِ موالات کی تجویز منظور ہو جانا قطعی نظر آنے لگا۔ خصوصی اجلاس کے صدر لالہ لاجپت رائے بھی ترکِ موالات کے مؤید ہو گئے۔ ابھی تک انہیں اس تحریک کی افادیت میں شبہات تھے۔ گاندھی جی نے ترکِ موالات کی تجویز خصوصی اجلاس میں پیش کی۔ تین دن تک بحث

کمیٹی میں سرگرم مباحثے کے بعد کثرتِ رائے سے تجویز منظور ہوئی پھر کھلے اجلاس میں اسے پیش کیا گیا۔ وہاں بھی کثرتِ رائے سے اس تجویز کو منظور کر لیا گیا جو دراصل خلافت کمیٹی کی تجویز تھی۔

ترکِ موالات کے پہلے تین مرحلے رکھے گئے تھے۔ (۱) سرکاری خطابات و اعزازات کی واپسی (۲) کونسلوں کی ممبری اور سرکاری ملازمتوں سے استعفیٰ اور (۳) سرکاری ٹیکسوں کی عدم ادائگی۔ کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ کلکتہ میں ترکِ موالات کا دائرہ وسیع کیا گیا۔ گاندھی جی کی پیش کردہ تجویزیں۔ سرکاری اور امداد پانے والے تعلیمی اداروں سے طلبا، کی بے تعلقی' سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ، انگریزی مال کا بائیکاٹ اور نئی بننے والی کونسلوں کے انتخاب میں حصہ لینے سے انکار بھی اس تحریک میں شامل ہو گئیں۔

کانگریس کے خصوصی اجلاس کی تجویز ترکِ موالات ناگپور میں منعقد کانگریس کے سالانہ اجلاس نے دسمبر ۱۹۲۰ء میں متفقہ طور پر منظور کر لی۔ کانگریس کے رہنماؤں میں مسٹر جناح اور مسز اینی بسنٹ نے ترکِ موالات کی تجویز سے یکسر اختلاف کیا۔

مولانا آزاد کا تعمیری اقدام:

ترکِ موالات کے مرحلوں میں ایک مرحلہ سرکاری درس گاہوں اور سرکار سے امداد پانے والے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ اور بائیکاٹ کرنے والے طلبار کے لیے متبادل درس گاہوں کا بندوبست بھی تھا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مسلمانوں کی سب سے مشہور درس گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبار کو بائیکاٹ کی تلقین کرنے کے لیے اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی علی گڑھ گئے تو ان کے ہمراہ علی برادران کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔

خود مولانا آزاد کے گھر کلکتہ میں' ایک قدیم سرکاری درس گاہ مدرسۂ عالیہ (کلکتہ) ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے قائم تھی۔ مولانا آزاد نے اس درس گاہ کے بائیکاٹ پر اس کے طلبار کو آمادہ کیا اور بائیکاٹ کرنے والے طلبار کے لیے کلکتہ کی ناخدا مسجد میں ایک درس گاہ قائم کی " مدرسہ اسلامیہ کلکتہ" مدرسہ اسلامیہ کلکتہ کا افتتاح گاندھی جی نے ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مسجد ناخدا میں کیا۔

مولانا آزاد عربی مدارس کی اصلاح کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ بہت پہلے سے رکھتے تھے۔ انہوں نے خود ان ہی مدارس کے مقررہ نصاب" درسِ نظامی" کے مطابق تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لیے درسِ نظامی میں اصلاحات ان کا ابتدا سے منصوبہ تھا۔

مولانا آزاد کی ایک ہی معرکہ آرا تقریر سے سرکاری مدرسۂ عالیہ (کلکتہ) کے تقریباً ڈھائی سو طلبار بائیکاٹ کر کے مدرسہ اسلامیہ میں چلے آئے تھے۔ مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں بھی نصابِ تعلیم درسِ نظامی ہی تھا۔ اب مولانا کو اپنے مدرسہ مدرسۂ اسلامیہ کے لیے ایسے مدرس درکار تھے جو مولانا کے منصوبے کے مطابق درس و تدریس کا کام انجام دے سکیں۔ مولانا آزاد نے دیوبند سے مولانا سید حسین احمد مدنی کو اپنے مدرسے میں بحیثیت صدر مدرس بلایا۔ ندوے سے مولانا عبدالرحمن نگرامی اور فرنگی محل سے مولانا محمد شفیع انصاری مدرس ہو کر آئے۔ آخر الذکر کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مولانا آزاد کی خواہش و طلب پر بھیجا تھا۔ یہ مدرسۂ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے۔

مولانا آزاد نے اصلاحِ نصابِ مدارس کے اپنے منصوبے کے تحت مختلف مکاتیبِ فکر کے علمار کو اس غرض سے اکٹھا کیا تھا کہ درسِ حدیث، عربی ادب اور درسِ معقولات کے مراکز سے علمار کو اکٹھا ایک ساتھ قیام کر کے تدریس کا ایک درمیانی راستہ وہ راستہ جو مولانا آزاد کے منصوبے کا مقصود و مدعا تھا، نکال لیں گے۔ مولانا آزاد اس پہلو سے اپنے مدرسے کی خصوصی نگرانی کرتے تھے۔

مولانا محمد شفیع انصاری فرنگی محلی (وفات ۱۹۷۹ء) نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ مولانا شفیع انصاری کو ساتھ لے کر مولانا آزاد سے ملنے گئے:

> (مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے درسِ نظامی پر گفتگو کے دوران میں)....
>
> "میرے متعلق مسکراتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا " ان کا (مولانا محمد شفیع انصاری فرنگی محلی کا) آپ نے خوب انتخاب کیا ہے یہ تو سراپا " درسِ نظامی" ہیں۔ حد ہو گئی کہ ان کے متعلق ہدایۃ الصراط المستقیم" کا درس کیا گیا جس میں صرف قرآنی آیات سے عقائد بتائے گئے ہیں۔ میں نے مصر سے اس کے نسخے منگا کر داخلِ درس کیے تھے تاکہ متکلمین کے پھندوں سے نکل کر طالب علم قرآنی نقطۂ نظر سے عقائد سیکھیں۔ اتفاقاً میں ایک روز مدرسے پہنچ گیا اور یہ (مولانا شفیع) اس کتاب کا درس دے رہے تھے اور درس میں قرآنی آیتوں ہی کے الفاظ سے متکلمین والے طرز سے عقائد روشنی ڈال رہے ہیں۔ میں منغض ہوا اور گھر آ کر میں نے مولوی عبدالرزاق (ملیح آبادی) سے کہا کہ اس کتاب کا سبق ان کے پاس سے علیحدہ کر کے فلاں امروہوی مدرس کے سپرد کر دو کیوں کہ یہ اس کتاب کے درس میں

رکھنے کے منشار کے خلاف درس دیتے ہیں۔ مولوی عبدالرزاق (ملیح آبادی) نے ان سے جب جاکر کہا کہ آپ منشا کے خلاف درس دیتے ہیں تو انہوں نے بہت خندہ پیشانی سے جواب دیا کہ کس کے منشار کے خلاف؟ کتاب کے؟ یا خداوندِ عزوجل کے؟ پہلی صورت میں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مصنف کے منشا کے بھی خلاف ہے؟ دوسری صورت میں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مصنف کا منشا خداوندی منشار کے خلاف ہے۔ تیسری صورت میں خداوندی منشار کیسے معلوم ہوا؟

یہ کہتے ہوئے مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کی طرف مخاطب ہوکر اپنی دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ کیسی یہی بات ؟ یا آپ نے مولوی صاحب (مولانا محمد شفیع انصاری) کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی تھی۔ کیوں کہ مشورے کے وقت آپ نے اس کتاب کو درس میں رکھنے کی مخالفت کی تھی۔ میں بول اٹھا۔ جی نہیں، واقعہ صحیح ہے۔

مولانا (عبدالباری فرنگی محلی) یہ سن کر مسکرائے اور دریافت کیا کہ فیصلہ کس طرح ہوا؟ مولوی ابوالکلام صاحب نے فرمایا کہ میں نے فیصلہ یہ کیا کہ اس کتاب کا درس ان مولوی صاحب کے متعلق کر دیا جائے۔ ویسا ہی کیا گیا مگر طلبار کو چاٹ پڑ چکی تھی۔ انہیں مولانا اور یوں کا سپاٹ طریقۂ درس پسند نہ آیا اور ان میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ میں نے ہدایت کی کہ تفسیر بیضاوی کا سبق ان کے (مولانا محمد شفیع انصاری کے) متعلق کر دیا جائے، اسے جس طرح سے بھی چاہیں پڑھائیں۔ طلبار کی بے چینی ختم ہو گئی۔ پھر ایک دن میں مدرسے گیا تو یہ (مولانا محمد شفیع انصاری) قرآنی آیت میں "اولوالالباب" کی تشریح کر رہے تھے اور یہ بحث ہو رہی تھی کہ اس میں یورپین فلاسفر داخل ہیں یا نہیں اس سلسلے میں یورپین فلاسفر کے آرزو(؟) کا طلبار کو بتلائے جا رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے سن کر حیرت ہوئی کہ یہ سب باتیں انہیں کیسے معلوم ہوئیں۔ مولانا (عبدالباری فرنگی محلی) نے فرمایا کہ یہ سب درسِ نظامی کی برکت ہے (سلسلۂ گفتگو میں دیگر عربی درسگاہوں کے حوالے آئے اور) مولانا (عبدالباری فرنگی محلی) یہ فرماکر خاموش ہو گئے کہ کہ آپ کیا چاہتے ہیں کہ طلبار مقلد جامد ہو جائیں۔ مولوی ابوالکلام صاحب نے کہا: میں تو شاہ ولی اللہ دہلوی کے طرز کے مولوی بنانا چاہتا ہوں۔ مولانا (عبدالباری فرنگی محلی) نے فرمایا کہ یہ بات صرف درسِ نظامی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس پر سب مسکرائے"

(غیر مطبوعہ تحریر سے)

یہ "دلچسپ واقعہ" ۱۹۲۱ء کے شروع کا ہے۔ مگر مولانا آزاد کی عربی، دینی مدارس کے نصاب میں اصلاح سے دلچسپی مرکز میں انٹرم گورنمنٹ بننے تک (۱۹۴۶ء تک) بدستور رہی جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

عہدۂ صدارت:

مولانا آزاد نے مسئلۂ خلافت میں اس حد تک سرگرم حصہ لیا کہ اپنے ایک طے شدہ اصول کو بھی اس سلسلے میں قربان کر دیا۔ بقول خود ان کے:

"سنہ ۱۹۱۱ء میں جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا، ان میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصے میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت، انجمن کے عہدوں اور اس طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصبوں سے یک قلم کنارہ کش رہوں گا۔"

لیکن تحریک خلافت کی اٹھان کچھ ایسی ہنگامی تھی جیسے ہوا کے جھونکوں" اور "سمندر کی موجوں" پر اس کشتی کے مسافروں نے سفر کا رُخ کر لیا ہو۔ مجبوراً مولانا کو متوار سنبھالی کر کشتی کے ناخدا کے فرائض انجام دینے کے لیے عہدۂ صدارت قبول کرنا پڑا۔ صوبۂ بنگال کی خلافت کمیٹی کی صدارت پہلی صدارت تھی جو مولانا نے قبول کی پھر تو عہدۂ صدارت نے ان کے قدم پکڑ لیے۔ جب کبھی ملکی و ملی سیاست کسی شدید بحران میں مبتلا ہوئی ملک کی نگاہیں مولانا آزاد ہی کی طرف بے ساختہ اٹھیں۔

۱۹۲۱ء میں ترکِ موالات کی تحریک شروع ہو کر زور و شور سے چل رہی تھی۔ کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیت العلمائے ہند مشترکہ طور پر اس مہم میں شریک تھیں۔ مسلمانوں کا ایک گروہ جو ایک خاص مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس تحریک کے خلاف تھا۔ مخالفت کا ایک خاص مرکز بریلی (یو پی) تھا، جہاں مولانا احمد رضا خاں بریلوی اس تحریک کے خلاف شرع ہونے کا فتویٰ دے چکے تھے۔ جمعیت العلمائے ہند کا ایک جلسہ اس تحریک ترکِ موالات کی تبلیغ کے سلسلے میں بریلی میں منعقد کیا گیا، جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی۔

اس ہنگامہ خیز اجلاس کا چشم دید احوال، راقم نے اپنے ان بزرگوں سے سُنا جو اس کانفرنس میں شریک تھے۔ بریلی کے مسلمانوں کی غالب اکثریت مولانا

احمد رضا خاں بریلوی کی معتقد اور پیرو تھی۔ کانفرنس میں انہیں کا مجمع زیادہ تھا۔ شہر کے سربرآوردہ مسلمانوں کو اس کانفرنس میں خون خرابا ہو جانے کا شدید اندیشہ پیدا ہوا۔ اس تصادم کو ٹالنے کے لیے سنجیدہ بزرگوں کی طرف سے کوشش ہوئی۔ بالآخر طے پایا کہ بریلوی جماعت کو بھی اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

کانفرنس کے پنڈال میں بریلوی علما اور ان کے معتقدین کی اکثریت تو تھی ہی، معتقدین بڑی تعداد میں چھروں سے مسلح بھی تھے، جو ایک خاص برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا آزاد عمامہ باندھے اور عبا پہنے جلسہ گاہ میں آئے بریلوی علما کو پہلے موقع دیا کہ وہ اپنا نقطۂ نظر پیش کریں۔ مولانا سید سلیمان اشرف نے جو ایک خوش بیان مقرر تھے، زور شور سے تقریر کی اور بڑی وضاحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر خلافت اور ترکِ موالات کے بارے میں پیش کیا جو سراسر مخالفانہ تھا۔ مولانا آزاد کے ہاتھوں میں ایک انگریزی اخبار تھا۔ اسے دیکھتے بھی جاتے تھے اور حریفانہ تقریر سنتے جاتے تھے جو بڑی جامع اور مدلل تھی۔

آخر میں مولانا آزاد کھڑے ہوئے اور اپنی تقریر قرآن پاک کی اس آیت سے شروع کی

(ترجمہ) اے مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ انصاف پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے (سچی) گواہی دینے والے ہو، اگرچہ تمہیں خود اپنے خلاف یا اپنے ماں باپ یا قرابت داروں کے خلاف ہی دینا پڑے۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج ہے تو اللہ (تم سے) زیادہ ان پر مہربانی رکھنے والا ہے (تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ مال دار کی دولت کی طمع میں یا محتاج کی محتاجی پر ترس کھا کر سچی بات کہنے سے جھجکو) پس (دیکھو) ایسا نہ ہو کہ ہوائے نفس کی پیروی تمہیں انصاف سے باز رکھے اور اگر تم (گواہی دیتے ہوئے) بات کو گھما پھرا کر کہوگے (یعنی صاف صاف بات کہنا نہ چاہوگے) یا گواہی دینے سے پہلو تہی کروگے تو (یاد رکھو) تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھنے والا ہے (ترجمان القرآن - سورۂ نسا۔ آیت ۱۳۴)

اس آیت کی تشریح و تفسیر کے ساتھ اصل موضوع پر مولانا آزاد نے اپنی خداداد خطابت کے ایسے جوہر دکھائے کہ سامعین مبہوت بیٹھے رہے اور جب مولانا کی تقریر ختم ہوئی تو ایک طرف مخالف شامت کے مقلد ہو فورِ عقیدت میں مصافحہ کرنے اور ہاتھ چومنے کے لیے ٹوٹ پڑے تو دوسری طرف حریف علما نے اعلان کیا کہ مولانا آزاد کی تقریر سے ہم اتفاق کرتے ہیں اور تحریکِ خلافت کی مخالفت سے باز آتے ہیں۔"

۱۹۲۵ء میں جب تحریکِ خلافت کا زور ختم ہو چکا تھا اور مسلمانانِ ہند ایک فروعی مسئلے میں سعودی اور شریفی جھگڑوں میں دست و گریباں تھے مرکزی خلافت کمیٹی کی صدارت کا بار مولانا آزاد کے کاندھوں پر ڈالا گیا۔ اس نزاعی مسئلے کا تعلق ملک حجاز (جزیرۃ العرب) سے تھا۔ مولانا آزاد نے ہندوستان میں رہتے ہوئے بااحسن و جوہ اس سلسلے میں رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ حجاز کی صحیح صورتِ حال معلوم کرنے، پھر سلطان بن سعود کی بلائی ہوئی عالمی موتمر اسلامی (۱۹۲۶ء) میں شرکت کے لیے خلافت کمیٹی کے جو وفود گئے وہ اگرچہ ممتاز خلافتی رہنماؤں پر مشتمل تھے جیسے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی وغیرہ۔ ان وفود کی رپورٹوں سے (جو چھپ چکی ہیں) آج بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد نے بحیثیت صدر مجلسِ خلافت ان وفود کو ان کے دوران قیامِ حجاز ہر مشکل موقع پر راستہ دکھایا۔

مولانا آزاد اور عہدۂ صدارت ملکی و ملی سیاست کا ایسا عنوان ہے جو بڑی تفصیل چاہتا ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے پھر بھی مختصراً یہ ذکر ضروری ہے کہ ترکِ موالات کی تحریک کے دوران دسمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد کی گرفتاری عمل میں آئی۔ سال بھر سے کچھ زیادہ جیل میں رہ کر جب باہر آئے تو قومی سیاست ایک ایسی نزاع سے دوچار نظر آئی جس سے ترکِ موالات کی تحریک دم توڑ دیتی ـــ اور ملکی سیاست دو بڑے دھڑوں میں بٹ جاتی۔ یہ نزاع نئی کونسلوں کے بائیکاٹ کرنے نہ کرنے سے متعلق تھی۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے اور علی برادران بھی۔ ایک گروہ اب چاہتا تھا کہ کونسلوں میں جا کر حکومتِ وقت سے ٹکر لی جائے یہ گروہ تبدیلی پسند (پرو چینجرس) کہلایا۔ دوسرا گروہ قدیم روش پر قائم اور کونسلوں کے بائیکاٹ کا حامی تھا۔ سیاسی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتا تھا اسے غیر تبدیلی پسند (نو چینجرس) سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس نزاع کو حل کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس ۱۹۲۳ء کے وسط میں دہلی میں ہونا طے پایا اور اس اجلاس کے صدر بھی مولانا ابوالکلام آزاد منتخب ہوئے جنہوں نے اپنے تدبر سے دونوں کو مخالف گروہوں میں بٹنے سے بچا لیا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک) کے زمانے میں اس وقت جب جنگی امور میں حکومت سے تعاون اور عدم تعاون کا نازک ترین مسئلہ ذہنوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھا مولانا آزاد کو ۱۹۴۰ء میں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا اور لگاتار وہ پانچ برس تک کانگریس کے صدر رہے۔ ان ہی کی صدارت میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک کی تجویز ۱۹۴۲ء میں منظور ہوئی، وہی صدر کانگریس تھے جب کرپس مشن (۱۹۴۲ء) کی تجاویز کے رد و قبول کا معاملہ ملکی سیاست پر چھا گیا تھا اور مولانا آزاد ہی صدارت کے زمانے میں (۱۹۴۵ء) شملہ کانفرنس ہوئی، جس میں ہندوستان کی آزادی سے متعلق برطانوی منصوبہ زیرِ بحث آیا۔ مولانا ہی کی سیاسی بصیرت و فراست اس اہم اور نازک تاریخی موڑ پر فرائضِ قیادت ادا کر رہی تھی۔ اور جب مصطفیٰ کمال (اتاترک) کی قیادت میں تمام ترکی



سعید ملیح آبادی

آزاد — ایک باغ و بہار شخصیت

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں عام تصور یہ قائم کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک انتہائی خشک مزاج، بلند دماغ، کم آمیز اور کم گو شخص تھے۔ جن پر ہر وقت تبحر علمی کی بے پناہ سنجیدگی اور تمکنت چھائی رہتی تھی۔ عام انسانوں سے الگ تھلگ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں اونچی جگہ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ ہنسنا بولنا نہیں جانتے تھے۔ مگر مولانا ایسے نہیں تھے۔

مولانا آزاد کو قدرت نے جہاں بے حساب ذہنی صلاحیتوں سے نوازا تھا، اور ان کا دماغ ایک عجائب خانہ تھا، جس میں علم و دانش کے گوہر نایاب اپنی اپنی جگہ سجے ہوئے تھے، وہیں قدرت نے انہیں ایک شخصیت کے سانچے میں بھی ڈھالا تھا۔ بے شک مولانا لوگوں سے کم ملتے جلتے تھے۔ انہیں انسانوں کے ہجوموں سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ خلوت و تنہائی اُن کی مجلس آرائی تھی۔ مولانا نے اپنے لیے عالی شان ایوانِ علم و عرفان تعمیر کیا تھا اس میں تنہا بیٹھنا اور تصنیف و تالیف سے شغل رکھنا انہیں پسند تھا۔ مجمع عام میں مولانا بہت یے دیے، باوقار، سنجیدہ اور متین رہتے —— ان کے چہرے پر عبقریت کی دبیز نقاب بھی پڑی نظر آتی ۔ اپنی تحریروں کی روانی اور تقریروں کی طوفان خیزی میں ایسے نظر آتے جیسے کسی دوسری دنیا کی پُراسرار مخلوق "کوہ ندا" سے صدا دے رہی ہے۔ لیکن اس تمام سنجیدگی، متانت اور تمکنت کے پیچھے ایک ایسا باغ و بہار اور چنچل شخص چھپا ہوا تھا جس کا دل ہر وقت ہنستا اور طبیعت مچلتی رہتی۔ مولانا کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اپنی زندگی اور شخصیت کے جس پہلو کو کھولنا چاہتے بس اتنا ہی حصہ سامنے آتا اور باقی عام نظروں سے پوشیدہ رہتا۔ انہیں اپنے اوپر اتنا قابو تھا کہ تعلقات میں رواداری کے ساتھ جو حد بندی کر لی، اس حصار کو دوسرا

کوئی توڑ کر مولانا کے قریب نہیں بڑھ سکتا تھا۔ مولانا اپنے بعض احباب سے بے تکلف بھی ہوتے تھے اور وہ یارانِ محفل مولانا کی شوخیٔ طبع سے لطف اندوز ہوتے۔ مولانا آزاد اگر زاہدِ خشک اور روکھی سوکھی طبیعت کے ہوتے تو ان کی تحریروں اور تقریروں میں ادبِ عالیہ کی وہ دل آویزی اور چاشنی نہ ملتی جس پر زمانہ آج سر دُھنتا ہے۔ رانچی کی چار سالہ نظر بندی میں تذکرہ اور قلعہ احمد نگر کی اسیری میں "غبارِ خاطر" جیسے ادبی شاہکار تخلیق نہ ہوتے۔ نہ عہدِ شباب کا "نالۂ گرم اور آہِ سرد" سنائی دیتے۔ "وائٹ جیسمین" چینی چائے کی داستانِ رندانہ، چیتا خاں کا کردار، چڑیا چڑے کی کہانی، ڈاکٹر سید محمود کے کوّے اور دوسرے بہت سے ادبی شہ پاروں سے اردو ادب کا دامن خالی رہ جاتا۔

خوش رہو اور خوش رہنے دو:

مولانا لکھتے ہیں:

"ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بہ یک وقت سیکڑوں چہروں پر پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آئے گا تو سیکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے، وہ پورے مجموعے کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے، لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی، ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اس میں کبھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی۔ اگر ہمارے چاروں

۲۲۔ اے۔ ساگر دت لین، کلکتہ ۷۰۰۰۹۳

طرف فکرناک چہرے اکٹھے ہو جائیں، ہم خود خوش رہ کر اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں۔۔۔

"عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ سمجھدار اور سنجیدہ ہو گا اتنا ہی اُس کا چہرہ زیادہ خشک اور مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہو گا۔۔۔۔ مذہب اور روحانیت کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خشک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زندہ مزاجی اور حقائق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دین داری اور ثقالتِ طبع تقریباً مترادف لفظ بن گئے ہیں۔۔۔۔

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب، تنگ دلوں کی گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی۔ اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہوتی ہے۔۔۔۔ لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔۔۔

"ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے، جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے۔ جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں، اُس میں ایک بجھے ہوئے دل اور مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔۔۔۔"

(غبارِ خاطر)

یہ ادبی شہ پارہ اُس آدمی کی تحریر ہے جو احمد نگر کی سنگی دیواروں کے پیچھے طویل قید و بند کی زندگی گزارنے داخل ہوا تھا اور فوجی جیل کی کوٹھری میں کڑے پہرے اور جھینگروں کی گڑگڑاہٹ میں تنہا بیٹھا ہوا، رات کے پچھلے پہر، جب سارا قلعہ محوِ خواب ہوتا، اپنی قلبی واردات خودکلامی کی شکل میں خطوط کے انداز میں کاغذ پر محفوظ کرتا جاتا۔ جیل میں تنہائی کی پہاڑ جیسی راتیں اُس کی انجمنِ خیال آراستہ کرتیں:

"جس قیدخانہ میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اُسے قیدخانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟۔۔۔۔"

(غبارِ خاطر)

خلوت نشینی آزاد کی پسند تھی، تنہائی اُن کی مونس تھی۔ طبیعت کا یہی سانچہ اور تقاضا تھا۔

"میں اپنی طبیعت کی اس افتاد سے خوش نہیں ہوں۔ نہ اسے حسن و خوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو اور صحبت و اجتماع کی جگہ خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے۔۔۔ لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اُسے توڑا جا سکتا ہے مگر موڑا نہیں جا سکتا۔۔۔۔ اس افتادِ طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں اور لوگوں کو حقیقتِ حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں، میں دوسروں کو سبک سر تصور کرتا ہوں اس لیے اُن کی طرف بڑھتا نہیں۔ حالانکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔ دوسروں کی فکر میں کہاں کر سکتا ہوں۔۔۔۔"

(غبارِ خاطر)

ابوالکلام آزاد کی خلوت پسندی، زندگی بسر کرنے کا اُن کا اپنا طریقہ اور حق تھا۔ شخصی آزادی اور پرائیویسی دنیا کے ہر انسان کی طرح آزاد کا بھی حق تھا۔ طبیعت کے اس سانچے میں ڈھلنے کا سبب اُن کے خاندانی حالات تھے۔ مولانا ایک کٹر مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد مولانا خیرالدین کی سختی کا یہ عالم تھا کہ اپنی اولاد کو کسی مکتب و مدرسہ میں

سنبھالنے کے روادار نہیں ہوئے۔ بھائیوں بہنوں کی تمام تعلیم گھر میں ہوئی جس میں خود مولانا خیرالدین نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ مولانا کو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سحر خیزی کی عادت بھی مولانا کو اپنے والد سے ورثے میں ملی۔

اس سانچے میں ڈھلے ہوئے فیروز بخت محی الدین احمد نے جب ہوش سنبھالا تو سب سے پہلے اُن کے اندر ایک جبلّی شاعر جاگ اُٹھا۔ مولانا کے ادبی ذوق کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ پھر ادب کی وہ کون سی صنف ہے جس کی طرف آزاد کی طبیعت نہیں گئی اور اُنہوں نے میدان سر نہ کیا۔ شاعری کے ساتھ مولانا کو موسیقی اور گانے بجانے کا بھی شوق ہوا۔ موسیقی کے فن سے مولانا نے گہری دلچسپی لی۔ ریاض کیا۔ ستار اور بین بجانے میں کافی مشق بہم پہنچائی۔ اسی شوق میں "معارف النغمات" کے نام سے فن موسیقی پر ایک کتاب مرتب کی۔

مولانا کے عہد شباب کی داستان کافی رنگین ہے جسے بلیغ اشاروں اور رمز آمیز "معلّی" میں خود نوشت سوانح "تذکرہ" میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روش عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس حال میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقش قدم رہ نما چھوڑا۔ رندی و ہوس ناکی کا عالم رہا تو اس کو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے۔" (تذکرہ)

آزاد عہد شباب کے تقاضوں سے بہت جلد فارغ ہوئے فرماتے ہیں:

"چوبیس برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔ گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانے سے اُلٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا ؎

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے" (غبار خاطر)

قلعۂ احمد نگر کی اسیری ہے جس کی مدت لامعلوم اور باہری دنیا سے ہر رشتہ منقطع پھر بھی مولانا کی باغ و بہار شخصیت اپنے لیے کیسے کیسے سامانِ طرب مہیا کرتی اور لطف اندوز ہوتی ہے۔ مولانا اپنے کردار خود ڈھالتے ہیں اور اُن سے محظوظ ہوتے ہیں۔

چیتا خاں:

"یہاں پہنچنے کے چند دنوں تک تو صرف جیلر ہی سے سابقہ رہا۔ ایک دو مرتبہ کلکٹر اور سول سرجن بھی آئے۔ پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا اُسی دن ایک اور شخص بھی اُس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا آئی۔ ایم۔ ایس سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈنگ نام ہے اور یہاں کے لیے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے۔ میں نے جی میں کہا: یہ سینڈنگ بلینڈک کون کہے۔ کوئی اور نام ہونا چاہیے۔ جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ حافظے نے یاد دلایا کہ کہیں نظر سے گزرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتا خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے اُن حضرت کا نام چیتا خاں ہی رکھ دیا کہ اول بہ آخر نسبتے دارد۔ ابھی دو چار دن بھی نہیں گزرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر چیتا خاں تھا۔ قیدی اور وارڈر بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔ کل جیلر کہتا تھا کہ آج چیتا خاں وقت سے پہلے گھر چلا گیا۔ میں نے کہا: "چیتا خاں کون؟" کہنے لگا۔ "میجر اور کون؟"" (غبار خاطر)

چینی چائے:

چینی چائے "وائٹ جیسمین" مولانا کو بہت مرغوب تھی۔ جسے وہ پیار سے "گوری چنبیلی" بھی کہتے تھے۔ اُس کی لذت کا ذکر مولانا نے کس طرح مزے لے لے کر اور ایک اندازِ دلبری سے "غبارِ خاطر" میں کیا ہے جو خود اپنی جگہ ایک ادب پارہ ہے:

"آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیتا ہوں۔۔۔ یہ وقت میرے اوقات زندگی کا سب سے زیادہ پُر کیف وقت ہوتا ہے، لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے

کام لینا پڑتا ہے۔ میں اس وقت بادۂ کہن کے شیشے کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبا کھولتا ہوں اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز پر دہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سروسامانِ کار میں اُن کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور برگنڈی کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا جو چائے کے اس دورِ صبح گاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیا کرتا ہے۔"

چائے نوشی کے ذوق اور اس سے لذت کوشی کے بیان کو مولانا کے قلمِ سحر نگار نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اپنے ذوق و شوق اور دوسروں کی بدذوقی کا گلہ بھی مولانا کس انداز میں بیان کرتے ہیں:

"وہ چینی چائے جس کا میں عادی تھا، کئی دن ہوئے ختم ہو گئی اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گراں مایہ سے آشنا نہیں۔......
مجبوراً ہندوستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ "برعکس نہند نامِ زنگی کافور" لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں.... سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں۔ لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں......
عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان اور سیلون میں پیدا ہوتی ہے، سمجھتے ہیں چائے ہے اور پھر اس کی مختلف قسمیں کر کے ایک کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس ترجیح کے بارے میں باہم رد و کد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے سیلون کی چائے بہتر ہے، دوسرا کہتا ہے دارجلنگ کی بہتر ہے..... حالانکہ اِن خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں۔" (غبارِ خاطر)

مولانا آزاد کے رفیقِ قدیم مولانا ملیح آبادی نے ۱۹۲۰ء کے بعد اپنا دورِ رفاقت شروع ہونے کے زمانے کی بات لکھی ہے:

"صبح تین چار بجے ضرور جاگ جاتے تھے۔ اس وقت میرا ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اچھا خاصا ناشتہ کرتے تھے اور مرغ کی یخنی بھی پیتے تھے۔ سات بجے ہم چائے اور ناشتہ ہوتا تھا۔ اس موقع پر اکثر میری حاضری ضروری تھی۔ عام طور پر ٹوسٹ، مکھن اور سستے بسکٹ ہوتے تھے۔ یہ بسکٹ مولانا کی سسرال کالن اسٹریٹ میں بنتے تھے۔ بہت خستہ اور لذیذ ہوتے تھے۔ چائے کبھی لپٹن کی اور کبھی بروک بانڈ کی ہوتی تھی۔ چائے نانی کا معاملہ بہت بعد میں شروع ہوا۔" (ذکرِ آزاد)

اس دور میں بھی چائے نوشی اور چائے تیاری کے معاملے میں مولانا کا ذوق اور اہتمام بہت بلند تھا۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"نہایت لذیذ چائے بناتے تھے۔ مجھے تو کیتلی تک چھونے کی اجازت نہیں تھی۔ فرمایا کرتے تھے۔ تجھے ہاتھ ہیں۔ چائے جیسی لطیف و نازک چیز کو گوارا نہیں ہو سکتے۔ پیالیاں تک دھونے کی ممانعت تھی۔ ہنستے اور کہتے: مولوی صاحب، آپ کا ہاتھ پیالی کو لگا اور چائے دانی کے اندر کی چائے غارت ہو گئی۔" (ذکرِ آزاد)

مولانا سگریٹ بہت پیتے تھے۔ ایک لحاظ سے چین اسموکر تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں اور گاندھی جی کے سامنے صرف مولانا آزاد کش پر کش لگاتے اور راکھ جا بجا بکھر جاتی۔ پان مولانا نہیں کھاتے تھے، لیکن کبھی پان کھانے پر آ گئے تو ہر پانچ سات منٹ پر گلوری منہ میں جاتی اور تمباکو بھی ڈھیر بھر ڈالتے۔ امرتسر سے کلکتہ ایک سفر میں لالہ لاجپت رائے مولانا آزاد کے ہم سفر تھے۔ مولانا ملیح آبادی اور آزاد کو پان کھاتے دیکھ کر لالہ جی نے ٹوکا کہ یہ بڑی میلی اور مضرِ صحت عادت ہے۔ مگر جب سلیقے سے پان بنا کر لالہ جی کو پیش کیا گیا اور اصرار کر کے کھلایا گیا تو ہر گلوری کے ساتھ تمباکو کی مقدار میں اضافہ کیا جاتا رہا۔ ہوڑہ اسٹیشن پر اتر کر لالہ جی نے حسرت سے کہا کہ اب ایسے اچھے پان کہاں ملیں گے اور انہیں بتایا گیا کہ ہر جگہ ملیں گے، صرف تمباکو ڈال لیا کیجیے گا تو لالہ جی نے حیرت ظاہر کی کہ میں نے تو تمباکو چکھی تک نہیں۔ تب انہیں بتایا گیا کہ آپ راستے بھر ہر پان کے ساتھ تمباکو کھاتے آئے ہیں۔ اس پر مولانا آزاد نے لالہ جی کو مشورہ دیا

"پان بغیر تمباکو کے کھانا گناہ بے لذت ہے اور مذاقِ سلیم کی عدالت میں سنگین جرم!"

جواہر لال کی چائے اور گڑ خوری:

مولانا آزاد کو مٹھاس سے ذرا بھی رغبت نہیں تھی۔ جب کہ جواہر لال مٹھاس اور کھٹاس کے دیوانے تھے۔ چائے کے معاملے میں بھی مولانا، نہرو کو بدذوق سمجھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

"جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں۔ خواصِ یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی، لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے، شاہراہِ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔ اور لپٹن وغیرہ ہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں۔ ... شکر اور گڑ کی دنیا اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہے کہ آدمی ایک کا ہوکر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دوچار مرتبہ بھی گڑ کھالیا، شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں، اس لیے گڑ سے بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس درجہ نمایاں ہے، انہیں بھی محسوس کراؤں، لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تھک کر رہ گیا۔" (غبارِ خاطر)

ڈاکٹر محمود کے کوّے:

احمد نگر قلعہ میں ڈاکٹر سید محمود بھی نظر بند تھے۔ جیل میں اُن کے مشغلوں کے بارے میں مولانا نے کتنی بذلہ سنجی سے بیان کیا ہے:

"یہاں کمروں کی چھتوں میں گوریاؤں کے جوڑوں نے جابجا گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ دن بھر اُن کا شور و ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ چند دنوں کے بعد محمود صاحب کو خیال ہوا کہ ان کی بھی کچھ تواضع کرنی چاہیے۔ ... چھپرہ میں ایک مرتبہ انہوں نے مرغیاں پالی تھیں۔ دانہ ہاتھ میں لے کر آ، آ کرتے تو ہر طرف سے دوڑتی ہوئی چلی آتیں۔ یہی نسخہ چڑیوں پر بھی آزمانا چاہا، لیکن چند دنوں کے بعد تھک کر بیٹھ رہے۔ کہنے لگے۔ عجیب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگنے لگتی ہیں۔ گویا دانہ کی پیش کش بھی ایک جرم ہوا ؎

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

"میں نے کہا طلبِ نیاز کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشوہ و ناز کی تغافل کیشیوں کے لیے صبر و شکیب پیدا کیجیے۔ نیازِ عشق کے دعووں کے ساتھ نازِ حسن کی گلہ مندیاں زیب نہیں دیتیں۔ ...

"یہاں کبھی کبھی صبح کو جنگلی میناؤں کے بھی دو تین جوڑے آنکلتے ہیں اور اپنی غزر غزر اور چیں چیں کے شور سے کان بہرا کر دیتے ہیں۔ اب محمود صاحب نے گوریاؤں کے عشق پر تو واسوخت پڑھا، مگر اُن آہوانِ ہوائی کے لیے دامِ ضیافت بچھا دیا۔

"روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا، آ، آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی۔ البتہ شہرستانِ ہوا کے دریوزہ گرانِ ہرجائی یعنی کوّوں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کوّوں کو شہرستانِ ہوا کا دریوزہ گر اس لیے کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں۔ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے۔ ہمیشہ اسی عالم میں پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے، صدائیں لگائیں اور چل دیے۔

؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے!

"بہرحال محمود صاحب، آ، آ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے، یہ دریوزہ گرانِ کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور اپنی دراز دستیوں سے دسترخوان صاف کر کے رکھ دیتے۔ ....

"محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوّوں کی سائیں سائیں کی روش چڑیوں کی برابر بجتی رہتی تھی۔ اب

جو اُن کا دسترخوانِ کرم سمجھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑی۔
ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا۔ آخر اُن سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دستِ کرم کی بخششیں رُک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لیے ملتوی ہی کر دیجیے ورنہ ان ترکمانِ یغما دوست کی ترکتازیاں، اکروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوّوں کو خبر ملی ہے۔ اگر فیضِ عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں کہ تمام دکن کے کوّے قلعۂ احمد نگر پر حملہ بول دیں ــــ"

مولانا کی حجامت :

خلافت تحریک کا زور تھا اور پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد پر اُس کے بائیکاٹ کی مہم جاری تھی۔ مولانا آزاد، مولانا ملیح آبادی، سی۔ آر۔ داس، سبھاش چندر بوس اور بہت سے لوگ کلکتہ میں گرفتار کر کے علی پور سینٹرل جیل میں قید کر دیے گئے۔ جیل کی کال کوٹھری کے دروازے پر مولانا نے موٹا کمبل تان دیا اور گوشہ نشین ہو گئے۔ باہر نکلنا بالکل بند کر دیا۔ نہانا بھی چھوڑ دیا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔ گرمی دانوں اور خارش سے سارا جسم بھر گیا۔ آخر ملیح آبادی کے بے تکلفانہ اصرار پر راضی ہو گئے کہ جسم پر اسپرٹ کی مالش ملیح آبادی کریں۔ اسپرٹ لگائی گئی تو ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی اور ضبط کرنے کی کوشش میں مولانا کبھی کسی پرندے کی اور کبھی کسی جانور کی بولی بول کر تکلیف کو بہلانے کی کوشش کرتے۔ چند روز میں اچھے ہو گئے۔

اب ایک اور مشکل پیش آئی کہ مولانا کی حجامت بہت بڑھ گئی۔ جیل کے حجام سے کام لینا منظور نہیں تھا۔ مولانا کے سر پر بال بہت گھنے اور سخت تھے۔ جیل کے باہر کلکتہ میں ایک نائی مقرر تھا جو خود کو "کنگ آف باربرس" کہتا تھا۔ وہی مولانا کے تار جیسے سخت بال کترا کرتا تھا۔ اُس وقت حجامت کی اجرت چار آنے تھی۔ مگر مولانا اپنے نائی کو پانچ روپے دیتے تھے۔ ملیح آبادی نے تجویز رکھی کہ وہ مولانا کی حجامت بنائیں گے۔ پہلے تو مولانا نے مذاق اُڑایا مگر جب ملیح آبادی نے یقین دلایا کہ بال کاٹنے کی باقاعدہ مشق ہے تو بڑی مجبوری کے بعد راضی ہوئے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں :

"میں نے قینچی چلانا شروع کی تو دخل دینے لگے،
مولوی صاحب، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اس طرح
نہیں، اُس طرح! کبھی سر ہٹا لیا، کبھی ہاتھ پکڑ لیا۔
عرض کیا۔ یہ نہ کیجیے۔ کہیں دو ملاؤں میں مرغی حرام نہ
ہو جائے۔ مجھے اپنا کام کرنے دیجیے۔ بال تو بہرحال کٹ
ہی جائیں گے۔ بُرے کٹے تو بھی چند روز میں خود ہی
ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کو کہیں جانا تو ہے نہیں،
اسی کوٹھری میں بند رہنا ہے۔

"پھر بھی مداخلت جاری رہی۔ عرض کیا"
قینچی لگ گئی تو ذمہ داری مجھ پر نہ ہو گی۔ اب چین
سے بیٹھیے۔ میں نے کام ختم کیا اور بال جھاڑ دیے
تو بڑی ناقدانہ نگاہوں سے آئینہ دیکھا، پھر ہنسا اور
کہنے لگے۔ واہ، آپ تو چھپے رستم نکلے۔ میں تو سمجھتا تھا
بھیڑا بنا ڈالیں گے۔ مگر نہیں، واقعی آپ خوب
حجامت بناتے ہیں!" (ذکرِ آزاد)

دونوں دوست ایک دوسرے کو دیر تک بناتے رہے اور چپکے ہوتے رہے۔ آخر مولانا کچھ سمجھے۔ ملیح آبادی کہتے ہیں :

"مولانا نے بڑے غور سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے
ہی رہے پھر کہنے لگے : اب میں سمجھا۔ یہ کہیے کہ آپ
مجھے بناتے رہے ہیں۔ عرض کیا، معاذاللہ! میری
مجال کہ آپ کو بناؤں۔ فرمانے لگے : نہیں مولوی
صاحب، میں خود زندہ دلی پسند کرتا ہوں۔ اب ہم
مل کر دوسروں کو بنایا کریں گے۔ میں نے لاکھ کہا
کہ وہ بات نہیں، جس کا آپ کو شبہ ہوا ہے، مگر
ہنستے اور کہتے رہے۔ اب لوگوں کو بنانے میں مزہ آئے گا۔
اکیلا آدمی بنائے اور سمجھنے والا کوئی نہ ہو تو اس کی مثال
مور کی سی ہے جو جنگل میں اکیلا ناچ رہا ہو۔ اس دن
سے لوگوں کو بنانا میرا اور مولانا کا مشترک شغل بن گیا، مگر
اس طرح کہ بننے والا سمجھنے نہ پائے۔ جب مولانا کسی کو
بنانا چاہتے تو مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھتے اور میں
معاملہ سمجھ جاتا۔" (ذکرِ آزاد)

"میرے بھائی" :

ملیح آبادی آگے لکھتے ہیں :

"بنانے کے سلسلے میں ایک بات نہایت مضحکہ خیز ہے
اور اس مضحکے کا شکار بہت سے عقل مند" بن چکے ہیں
مولانا جب کسی کو بنانا چاہتے تھے یا اُس سے پیچھا چھڑانا

چاہتے تھے تو اکثر "میرے بھائی" کہہ کر باتیں کرتے تھے۔
یار لوگوں نے خود ہی طے کر لیا کہ مولانا کا "میرے بھائی" کہہ دینا اُن کے لیے کوئی بڑا اعزاز ہے۔ حالانکہ خود مولانا نے مجھ سے کہا "میرے بھائی" کہہ کر لوگوں کو منا تا ہوں کروں کیا، جھوٹ ٹلتے ہی نہیں۔ "میرے بھائی" کی رشوت پاکر خوش خوش چلے جاتے ہیں۔ لیکن بولتے بولتے یہ جملہ اُن کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا۔ اور آخر عمر تک زبان پر چڑھا رہا۔" (ذکرِ آزاد)

اچھے وقتوں میں ہنسنا، بولنا اور دل لگی کرنا تو آسان ہے، مگر مصیبت کے دنوں میں بھی آدمی زندہ دل، ہنس مکھ اور پُرمذاق رہے، یہ بڑا وصف ہے۔ جیل خانے کی قید و بند تو مولانا کے لیے آسان مصیبت تھی مگر مولانا جب شدید مالی پریشانیوں میں ہوتے اور نوبت فقر و فاقہ کی ہوتی تب اُن کے اندر کا بڑا انسان اور زندہ دل کھلکھلا کر ہنسنے ہنسانے لگتا تھا۔ مولانا پر تنگ دستی ہمیشہ چھائی رہی۔ کیوں کہ روپیہ پیسے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ایک وقت ہاتھ بالکل خالی ہو گیا۔ فاقوں کی نوبت آگئی۔ مولانا بہت نفاست پسند تھے۔ سخی دل تھے، دل کھول کر خرچ کرتے، صرف اپنے آپ پر نہیں دوسروں پر بھی — حاجت مندوں کی مدد بھی قرض لے کر پوری کرتے۔ خود گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پیتے، موٹا سستا لباس پہنتے اور روکھی سوکھی پر قناعت کرتے۔ معمولی کرتا، لنگی اور ٹوٹی چپل سے کام چلاتے۔ تنگ دستی کے دنوں کی داستان ملیح آبادی کی زبانی:

"مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچ ہاتھ میں تھا۔
بہت بڑے پیر کے نورِ نظر تھے۔ ہر طرف دولت بکھری ہوئی تھی۔ ایسے آدمی کے لیے تنگ دستی دوسروں سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس زمانے میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ ماتھے پر کبھی بل نہیں دیکھے۔ کبھی جھنجلاتے نہیں۔ بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ ان خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت و ظرافت عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔
"ادھر، مسور، مونگ کی آبالی دال اور تیج کے چاول بارہا یہ نوالہ نہ پیر کا کھانا ہوتا تھا۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا کھانا ہوتا تھا! اور یہی وقت ہوتا تھا جب مولانا کی بے پناہ خطابت و ذہانت ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی اور

مولانا کی زبان بے روک ٹوک چل نکلتی تھی، طوفانوں پر طوفان اٹھاتی تھی۔۔۔۔۔ آخر کھانے کو بیٹھنا ہی پڑتا تھا۔
اب مولانا کی فصاحت و بلاغت، ابالی دال اور بھات کے فضائل و مناقب کے بیان پر ایسی رواں دواں ہو جاتی کہ آدمی محوِ حیرت ہو کر رہ جائے۔ یہ دال سب دالوں سے افضل کیوں ہے۔ بگھاری نہ جائے تو تندرستی ہی کے لیے نہیں خود زندگی کے لیے بھی گارنٹی ہے۔ بگھار دینے سے دال کے خواص کس طرح بدل جاتے ہیں اور وہ کیوں تندرستی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے؟ — اس جلیل القدر انسان کی یہ تقریریں اس لیے ہوتی تھیں کہ اپنے رفیقِ طعام کو بہلائے رکھے۔ اور احساس نہ ہونے دے کہ تنگ دستی کی مجبوریاں گھیرے ہوئے ہیں۔
میں تو سب کچھ جانتا تھا، مگر انجان بنا رہتا تھا کہ مولانا کی بشاشت میں فرق نہ آئے۔" (ذکرِ آزاد)

اور آزاد ہندوستان کے وزیرِ تعلیم بن کر دس سال آزاد نے اس طرح گزارے کہ نہ کہیں گھر بنایا نہ بینک بیلنس چھوڑا۔ بعد وفات واجبات کی ادائیگی ذاتی گاڑی بیچ کر کی گئی۔ پورا زمانۂ وزارت صرف تین عدد شیروانیوں میں گزار دیا، جو پرانی پڑ کر جابجا رفو دار ہو گئی تھیں۔ آزاد اپنے پیچھے فقط علم و دانش کا خزانہ چھوڑ گئے اور اپنی زندگی کی ایسی داستان جسے زمانہ کان لگا کر شوق سے سن رہا ہے۔ یہ باغ و بہار شخص کسی کو دُکھ دیے بغیر ہنستا ہنساتا دنیا سے رخصت ہوا۔ ○
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

جمنا داس اختر

مولانا آزاد سے ایک ملاقات

یہ ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے۔
کانگریس کے رہنما طویل نظربندی کے بعد رہا ہوئے تھے۔ خبریں شائع ہوئیں۔ کہ مولانا آزاد اور مسٹر آصف علی رہا ہو کر سری نگر پہنچ گئے ہیں۔ خان عبد الغفار خاں اور جواہر لال نہرو بھی وہاں پہنچ رہے ہیں۔ کانگریس کی مجلسِ عاملہ کے غیر رسمی اجلاس میں ملک کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے گا اور اس سوال پر بھی غور کیا جائے گا کہ آزادی کے حصول کی جدّ و جہد کیوں کر جاری رکھی جائے۔

میں اُن دنوں روزنامہ ویر بھارت لاہور کا جوائنٹ ایڈیٹر تھا۔ اور پنجاب میں فری پریس جرنل بمبئی اور لالہ دیش بندھو گپتا کے اخبار روزنامہ تیج کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔ ویر بھارت کے مالکوں نے راولپنڈی کے ایک اخبار نویس کو سری نگر بھیجنے کا ارادہ کیا۔ مگر میری خواہش تھی کہ میں سری نگر جاؤں۔ کشمکش ہوئی۔ استعفٰی کی دھمکی دی تو اس شرط پر جانے کی اجازت مل گئی کہ لاہور سے راولپنڈی تک کا آنے جانے کا کرایہ دفتر سے وصول نہیں کیا جائے گا۔ دس پندرہ روپے کی بات تھی مگر وہ زمانہ اور تھا۔ اردو اخبارات کے مالکان کسی سیاسی اجتماع کی رپورٹنگ کے لیے اپنا نمائندۂ خصوصی بھیجنا فضول خرچی سمجھتے تھے۔

راولپنڈی میں میری والدہ محترمہ اور خاندان کے دوسرے افراد رہتے تھے۔ سوچا کہ راستے میں ایک دن وہاں ٹھہر کر ملاقات کر لوں گا۔ سری نگر میں میری بیوی کے چچا ماسٹر درگا سنگھ رہتے تھے۔ وہ کشمیر کے شہری تھے اور نیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔ میں جب بھی سری نگر جاتا، اُن کے مکان پر ہی ٹھہرتا۔ اس بار بھی وہاں ہی ٹھہرا۔ لاہور سے میرے دوست میاں محمد شفیع (م۔ ش) جو سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندۂ خصوصی تھے، رپورٹنگ کے لیے آئے تھے۔

مسٹر آصف علی واقعی بیمار تھے۔ انہیں خون کی قے آتی تھی۔ شیخ عبد اللہ کے مہمان کی حیثیت سے سری نگر کی ایک کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ لالہ دیش بندھو گپتا اور مسٹر آصف علی میں اس قدر دوستانہ تعلقات تھے کہ انہیں بیان کرتے ہوئے یک جان دو قالب کہہ دینا لازمی سمجھا جاتا تھا۔ ان تعلقات کے سبب تیج کے نمائندۂ خصوصی کی حیثیت سے مجھے ان سے ملاقات کی اجازت حاصل کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گفتگو کے دوران مسٹر آصف علی بستر پر لیٹے رہے۔ ان سے سیاسی صورت حال پر بات چیت ہوئی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ یہ بات چیت انٹرویو کی شکل میں شائع نہیں کروں گا۔ کیوں کہ یہ پرائیویٹ بات چیت ہے۔

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے آپ اسے شائع کر سکتے ہیں۔ اسے انٹرویو کی صورت دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ میں نے دیکھ کر کہا ہے جو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے پہلے کہہ دینا قابلِ اعتراض نہیں۔

مولانا آزاد سے ملاقات :

مولانا آزاد سے ملاقات کرنا مشکل تھا۔ اُسی دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ مولانا آزاد کو ڈاکٹروں نے ہدایت کی ہے کہ وہ لوگوں سے ملاقاتیں نہ کریں۔ مولانا آزاد سری نگر میں ٹھہرنے کے بجائے گل مرگ میں قیام کر رہے ہیں اور انہوں نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اُن سے ملاقات کے لیے ان کے پاس نہ آئیں۔

مولانا آزاد گل مرگ میں پنجاب کانگریس کے صدر میاں افتخار الدین کی کوٹھی میں قیام فرما تھے۔ بے حد پریشانی ہوئی۔ لاہور سے سری نگر پہنچ کر بھی

۱۰/۹، ساؤتھ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

مولانا آزاد سے ملاقات نہ ہو۔۔۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات افسوس ناک ہو سکتی تھی۔۔۔ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن صبح سویرے سرینگر سے مولانا آزاد کو تار کے ذریعے مطلع کیا کہ میں فری پریس جرنل کا نامہ نگار ہوں اور آج ہی آپ سے ملاقات کے لیے پہنچ رہا ہوں۔

تار پر اپنا پتہ درج نہیں کیا تھا۔

تب سونگ گیارہ بجے گل مرگ پہنچ گیا۔ سرینگر سے بس پر سوار ہو کر ٹنگ مرگ وہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں گل مرگ۔

مولانا کو تار مل گیا تھا۔

انہوں نے کہا: "عزیز، تم نے تار میں اپنا پتہ درج نہیں کیا۔ ورنہ جواب دیتا کہ ملاقات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

کیا جواب دیتا۔ خاموش رہا۔

اور مولانا نے کہا: "آ ہی گئے ہو تو اندر آ جاؤ۔ تھکے ہوئے نظر آتے ہو آرام کر لو۔"

صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور ایک لمحہ خاموش رہ کر بولے۔ "چائے پیوگے؟"

اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ امام الہند نے چائے کی دعوت دی تھی۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

پھر پوچھنے لگے۔۔۔ سیاہ چائے پسند کرتے ہو یا سبز؟

جواب کا موقع دیے بغیر فرمایا۔۔۔ میں تو سبز چائے پسند کرتا ہوں۔

میں نے سبز چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔

چائے تیار ہو کر آئی تو مولانا نے پوچھا۔ شکر اور دودھ ڈالوگے کیا خود ہی کہنے لگے۔ میں تو شکر اور دودھ کے بغیر چائے استعمال کرتا ہوں۔

میں نے مولانا کی پسند سے اتفاق کیا۔

اس کے بعد مولانا نے میری صحافتی مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا۔

میں نے فری پریس جرنل اور تیج سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں اور روزنامہ ویر بھارت کا جائنٹ ایڈیٹر ہوں تو مولانا نے پنڈت میلا رام وفا کے بارے میں دریافت کیا:

"کیا وہ اب بھی ویر بھارت سے وابستہ ہیں۔ "اے فرنگی" کے عنوان سے ان کی انقلابی نظمیں اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ "ویر بھارت" کی اشاعت کتنی ہے وغیرہ وغیرہ!"

میں نے تفصیل سے جواب دیا تو مولانا نے زمیندار اور مولانا ظفر علی خاں کے بارے میں دریافت کیا۔ کہنے لگے ظفر علی خاں کبھی انگریز کو معاف نہیں کر سکتا۔ زمیندار کے صفحۂ اول پر اس کی نظمیں شائع ہوتی ہوں گی۔ اخبار نویس اور شاعر نہ ہوتا تو انقلاب پسند ہوتا۔ بموں اور بندوقوں کا استعمال کرتا۔۔۔ میری اطلاع کے مطابق زمیندار کسی بھی دوسرے مسلم روزنامہ سے زیادہ چھپتا ہوگا۔

اس کے بعد مولانا نے تحریک خلافت کے دنوں کے زمیندار کے کچھ اداریوں کا ذکر کیا۔ مولانا نے ظفر علی خاں پر سائمن کا استقبال کرنے پر علامہ اقبال کے خلاف جو نظم لکھی تھی اور شہید اعظم سردار بھگت سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے موری گیٹ لاہور کے جلسۂ عام میں جو نظم کہی تھی، مولانا آزاد نے اُن کے چند اشعار دہرائے اور کہنے لگے۔۔۔ افسوس کہ ظفر علی خاں وہ ظفر علی خاں نہیں رہا، مگر مجھے اُمید ہے کہ ایک بار پھر وہ زندگی کا ثبوت دے گا۔

مولانا آزاد کو لاہور کے اردو اخباروں سے وابستہ تمام سرکردہ صحافیوں کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے پوچھا کہ مہاشہ کرشن کا کیا حال ہے۔ لالہ فیروز چند اور پرنسپل چھبیل داس کیا کرتے ہیں۔

فرمایا چھبیل داس ایمان دار کمیونسٹ صحافی ہے۔ غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کے سیاسی نظریات کی نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا صحافت میں انہوں نے اردو ادب کی شان دار روایات برقرار رکھی ہیں۔ شمالی ہند میں طنز و مزاح کے میدان میں سالک کا کوئی جواب نہیں۔ انہیں کہو کہ اب تک "افکار و حوادث" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اُسے کتابی صورت میں شائع کریں۔ یہ اردو ادب کا ایک شاہکار ہوگا۔

مسکرا کر کہنے لگے۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض اصحاب مہر اور سالک کے نام کے ساتھ مولانا کے لفظ کا کیوں استعمال کرتے ہیں۔

باتوں باتوں میں کہنے لگے۔۔۔ ایک سوامی پرکاشا نند ہوا کرتے تھے۔ سنیاسی، بھگوا لباس، منڈا ہوا سر مگر فارسی میں شعر و شاعری کرتے تھے۔

جب میں نے بتایا کہ کینسر کی بیماری کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا ہے تو مولانا نے کہا۔۔۔ نہایت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔

لاہور کے ادیبوں کے بارے میں مولانا نے کچھ نہیں کہا۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ مولانا یہ بھانپ گئے تھے کہ وہ جس نوجوان سے گفتگو کر رہے ہیں، وہ ادیب نہیں، محض ایک اخبار نویس ہے۔ مجھے خود بھی اس کا احساس تھا۔

باتوں باتوں میں ایک بار مولانا نے "سیاسی آب و ہوا" کے الفاظ کا استعمال کیا۔ میں چونک پڑا۔ مولانا نے مسکرا کر کہا — میں جانتا ہوں کہ تم کیوں چونک پڑے ہو۔

اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے کہنے لگے: "میں سیاسی فضا کے الفاظ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ انگریزی کے الفاظ Political Atmosphere کا یہی صحیح ترجمہ ہے۔ تم اخبار نویس ہو۔ روزانہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرتے ہو۔ میں نے سوچا — تم ٹوک دوگے مگر شاید تمہیں جرأت نہیں ہوئی۔

مولانا سگریٹ کے کش لگا رہے تھے

کہنے لگے — پنجابی اپنے لب و لہجے سے پہچان لیا جاتا ہے، مگر میں پیشگوئی کر سکتا ہوں کہ مستقبل قریب میں پنجاب کے اردو ادیب تمام مُلک کے اردو ادیبوں کی رہنمائی کریں گے۔ اور لاہور اردو ادب کا مرکز بن جائے گا۔

مُلک کی تقسیم:

سیاسی امور کا ذکر آنے پر مولانا نے فرمایا کہ ملک نہایت نازک اور خطرناک دور سے گزر رہا ہے۔ مولانا نے نہایت واضح الفاظ میں مسٹر راج گوپال آچاریہ کی مذمت کی اور کہا کہ راجہ جی نے ہماری نظر بندی کے دوران پاکستان کے مطالبہ کی حمایت کر کے کانگریس سے غداری کی ہے۔ راجہ جی نے اپنی پوزیشن کا غلط استعمال کر کے بیان جاری کر دیا تھا کہ جنگ میں برطانیہ کی حمایت کرنی چاہیے۔ اگر وہ کانگریس سے مستعفی ہو کر اس طرح کی حرکت کرتے تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ میں نے نظر بندی کے دوران اس حرکت کا سختی سے نوٹس لیا۔

مولانا آزاد پنجاب کانگریس میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر گوپی چند بھارگوا کی پارٹی بازی کو بے حد ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر ستیہ پال کی مذمت کی اور کہا کہ کانگریسی ہوتے ہوئے بھی انہوں نے فوج میں ملازمت کر لی ہے۔ ایسا کر کے انہوں نے پنجاب میں کانگریس کو نقصان پہنچایا ہے۔

مولانا نے کہا کہ فراخ دلی اور دُور اندیشی سے کام لے کر مُلک کی تقسیم کو روکا جا سکتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک فارمولہ ہے اور مناسب وقت پر میں اسے پیش کروں گا۔

مولانا سے دوسری ملاقات لاہور میں ہوئی۔ ان کے پرانے میزبان میاں افتخار الدین کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں سردار پٹیل سے میاں صاحب کی تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی تھی۔ میاں صاحب مسلم لیگ میں شامل ہوئے، مگر انہوں نے اپنے دامن کو فرقہ واریت سے آلودہ نہیں کیا۔

مولانا لاہور میں تشریف لائے تو میاں صاحب کی کوٹھی پر نہیں بلکہ فلیٹی ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں ہی پریس کانفرنس کی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ "سیاسی آب و ہوا کیسی ہے؟"

دراصل وہ طنزیہ انداز میں مجھے گل مرگ میں ہوئی بات چیت میں ان الفاظ کے استعمال کی یاد دلاتے تھے۔

مسلم لیگ عروج پر تھی مگر مولانا آزاد نے موچی گیٹ میں تقریر کی اور ماحول پر چھا گئے۔ ہر جملہ ایک شعلہ، ہر لفظ میں ترنّم، بھورے رنگ کی ریشمی چادر کندھے سے سرکتی اسے دوبارہ اوڑھتے۔ ایک ایک حرکت میں ایک عجیب ادا تھی اپنی جادو بیانی سے انہوں نے مسلم لیگ کا گڑھ مسمار کر دیا تھا۔

بقیہ: مولانا آزاد نمبر کے باب میں

گہرائی کے ساتھ مولانا کے تعلیمی نظریات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

اس نمبر کا آخری حصّہ اشاریہ پر مشتمل ہے۔ اس کا مقصد ان خدمات کا تجزیہ و احاطہ کرنا ہے جو مولانا کے تفہیم اور تعلیم کے باب میں انجام دی گئیں۔ اس کے لیے ہم ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری اور محترمہ صفیہ عارف صدیقی کے متشکر ہیں محترمہ نشاط عرفان کی مساعی بھی مشکور ہے۔

محترمہ نشاط عرفان نے مولانا: معاصرین کی نظر میں' مرتب کر کے مشاہیر کی آراء کو یکجا کر دیا ہے۔ ان سے مولانا کی آفاقیت کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کے مقالہ "مجلّہ الجامعہ، کلکتہ" اس اعتبار سے بھی خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ یہ اس موضوع پر پہلا مقالہ ہے۔ اس کی اوّلیت اور افادیت دونوں مقدم ہیں۔

آخر میں ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کی مساعی اور تعاون سے ہم اتنے کم وقت میں ایسا نمبر مرتب کر پائے۔ ان میں جناب مالک رام، جناب عبداللطیف اعظمی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے اسمائے گرامی سرِفہرست ہیں۔

توقع ہے کہ آپ آجکل کا مولانا آزاد نمبر اپنے علم و ذوق کے عین مطابق پائیں گے۔ ہمیں آپ کی رائے جاننے کا اشتیاق رہے گا۔



خلیق احمد نظامی •

مولانا آزاد پر سرسیّد کے اثرات

(۱)

مولانا آزاد کو بیدلؔ کا یہ شعر بہت پسند تھا ؎

آئینہ نقش بند طلسم خیال نیست
تصویر خود بلوحِ دگر می کشیم ما

اسی اشارے کے سہارے، مولانا آزاد پر سرسید کے اثرات کو یہاں "بہ لوحِ دگر" پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا آزاد، مولانا شبلی کی ذات کو "بو قلموں و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ" سمجھتے تھے، ان کے ذوق اور فکر کی طرازی کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ باوجود ملایانہ طلبِ علم کے ملائیت کی پرچھائیاں بھی اُن پر نہیں پڑی تھیں (کاروانِ خیال ص: ۹۳) الندوہ میں ایک بار انہوں نے لکھا تھا ——

"وہ (شبلی) ہماری زبان، ہمارے لٹریچر، اور ہمارے علوم و فنون کی ایسی گراں قدر اور عدیم النظیر خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے احسان سے تمام عالم اسلامی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔" (اپریل ۱۹۱۰ء ص: ۱۳)

۴۴-۱۹۴۳ء میں جب مولانا سیّد سلیمان ندوی کی حیاتِ شبلی مولانا آزاد کے مطالعہ میں آئی تو حاشیوں پر جگہ جگہ اپنا تبصرہ لکھ دیا۔ ایک جگہ مصنّف کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:

"یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا شبلی کی ساری دماغی تربیت سرسید کی وجہ سے ہوئی۔"

یہ جملہ سرسید کے متعلق مولانا آزاد کی رائے کا بہترین آئینہ دار ہے۔ اپنے عہد کے جس عالم کو مولانا آزاد سب سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور نابغہ روزگار میں شمار کرتے تھے، اس کا ذہنی نشو و نما سرسید کی تربیت کا مرہونِ منت تھا۔! —— یہ کتنا عظیم الشان خراجِ تحسین ہے جو انہوں نے سرسید کو پیش کیا ہے! اس کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ پیشِ نظر موضوع پر احتیاط سے قلم اٹھایا جائے اور جو نظریات اس سلسلے میں شہرت پا گئے ہیں، ان کو تحقیق کی چھلنی میں چھان لیا جائے۔

جس وقت مولانا آزاد کے قلم سے یہ جملہ نکلا تھا، مولانا شبلی کے انتقال کو تقریباً ۳۰ سال ہو چکے تھے۔ مولانا شبلی نے اپنے آخری زمانے میں سرسید کی بعض پالیسیوں سے اس حد تک اختلاف کا اظہار کیا تھا کہ کچھ لوگ اُن کو سرسید کے مخالفین میں شمار کرنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی غیر معمولی فراست اور بالغ نظری نے ان تمام حالات سے متاثر ہوئے بغیر شبلی کی ذہنی کیفیت کا احاطہ ایک جملہ میں کر لیا۔!

اگر کچھ دیر کے لیے ان تمام اختلافات سے صرفِ نظر ممکن ہو جو وقتی طور پر مولانا آزاد کو علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد سے ترکِ موالات، خلافت اور تحریکِ یونیورسٹی کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے، تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا آزاد پر سرسید کے اثرات نہ صرف گہرے تھے بلکہ ان کی ذہنی تربیت میں سب سے بڑا ہاتھ سرسید کا تھا اور وہ تمام عمر اس کے معترف رہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے میں بعض بنیادی حقائق پر نظر ہونی ضروری ہے۔

(۱) مولانا آزاد کے والد، مولانا خیر الدین کے مذہبی معتقدات کی بنیاد تقلید تھی۔ سرسید نے اجتہاد کو اپنا رہبر بنایا تھا اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھی تھی۔ دونوں کے افکار و رجحانات میں بُعد المشرقین

• نظامی ولا، سرسید روڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

تھا، لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دونوں ایک ہی مذہبی فضا کی پیداوار تھے۔ دونوں کا منبعِ فیض ایک تھا یعنی خاندانِ ولی اللہی۔ پھر مولانا منور الدین (مولانا آزاد کے والد کے نانا) اور خواجہ فریدالدین دبیرالملک (سرسید کے نانا) دونوں کا تعلق دربارِ مغلیہ سے تھا اور دونوں ایک ہی فضا میں سانس لیتے تھے۔

سرسید کی ننھیال شاہ عبدالعزیزؒ کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھی خود انہوں نے شاہ صاحبؒ کے نواسے مولانا مخصوص اللہؒ سے حدیث کا درس لیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے وعظ سنتے تھے، شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقۂ تلامذہ کے بعض مشاہیر مثلاً مفتی صدرالدین آزردہ سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ مولانا آزاد کے نانا، مولوی رشید الدین شاہ اسمٰعیل شہید وغیرہ کے ہم درس تھے۔ اُن کے خاندان کا ہر فرد شاہ عبدالعزیزؒ کے تلامذہ سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتا تھا۔ مولانا خیرالدین نے مولانا فضلِ حق کی خدمت میں معقولات کی تکمیل کی تھی۔ اور مفتی صدرالدین آزردہ نے اُن کے دستار باندھی تھی۔

مولانا آزاد کے سامنے خود ان کے والد سرسید اور اُن کے خاندان کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ سیرتِ فریدیہ میں سرسید نے اپنے نانا دبیرالدولہ خواجہ فریدالدین خاں کے حالات لکھے ہیں۔ اس کے حاشیہ پر دورانِ مطالعہ مولانا آزاد نے لکھا:

> "والد مرحوم کہتے تھے کہ خواجہ فرید کا تقرر (بہ حیثیت مدیر) اس امید سے ہوا تھا کہ انگریزوں میں ان کا رسوخ تھا، یہ پنشن کی رقم بڑھوا دیں گے ...... وہ یہ بھی کہتے تھے کہ خواجہ فرید کے تقرر میں دونوں مرتبہ ریذیڈنٹ کا ہاتھ تھا ...... تعجب ہے کہ سرسید نے دہلی مدرسہ کی سرپرستی کا حال نہیں لکھا۔ یہ من جملہ ان دو تین رؤسا دہلی کے ہیں جنہوں نے مدرسہ دہلی کی سرپرستی کی تھی اور انگریزی شاخ کے موید ہوئے تھے۔"

دہلی کی سماجی زندگی کے دو اہم مرکز تھے، جہاں سرسید اور مولانا خیرالدین دونوں جمع ہوتے تھے، ایک تیراکی کے کلب اور دوسرے دیوان خانے۔ حقیقتاً دہلی کی سماجی زندگی کے یہ دو رُخ تھے۔ جہاں سماجی روابط کی بنیاد پڑتی تھی۔ حالی نے سرسید کی تیرنے میں دلچسپیوں کا حال لکھا ہے (حیاتِ جاوید ص: ۵۰-۴۹) مولانا آزاد نے اپنی کہانی میں اپنے والد کی ان دلچسپیوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے (ص: ۶۸-۶۷) ممکن نہیں کہ ذوق و انہماک کا یہ اشتراک تعلقات کی بنیاد نہ بنا ہو۔ علاوہ ازیں یہاں کے دیوان خانے دہلی کی علمی اور ادبی زندگی کی جان تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے دیوان خانے میں سرسید اور مولانا خیرالدین دونوں شرکت کرتے تھے۔ مولانا خیرالدین دیوان خانے کی ان مجلسوں کو یاد کرکے یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے تھے ؎

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیۃ من عرار

(نجد کی بہاروں سے لطف اندوز ہو لو
شام ہونے کے بعد یہ بہاریں نہ رہیں گی) (نقشِ آزاد ص ۲۱۰، ۲۱۱)

یہی کیفیت سرسید کی ہوتی تھی۔ آزردہ کے دیوان خانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں، جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں اور کہاں وہ صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے"!
>
> (تصانیفِ احمدیہ ج ا حصہ اول ص ۱۳۰)

مولانا آزاد نے اپنے والد اور سرسید کے دیوان خانوں کی یاد کو ایک ہی سانس میں ذکر کیا ہے (نقشِ آزاد) ——— سرسید اور مولانا آزاد کے خاندانوں کا یہ پس منظر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ دونوں ایک ہی ذہنی فضا کی پیداوار تھے، اور دونوں کی عقیدت و ارادت کے سرچشمے ایک ہی جگہ تھے!!

(۲) اثرات کی نوعیت کے متعلق بھی ایک غلط فہمی عام ہو گئی ہے۔ یہ خیال کہ کسی شخص کے کسی صاحبِ فکر سے متاثر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے فکر و عمل کو اس طرح اس کے تابع کر دیا کہ اس کی فکر کا قافلہ وہیں رُک گیا اور وہ اس راہ کی ارتقائی منزلوں سے دست بردار ہو گیا، صحیح نہیں۔ اگر کوئی شخص ایسی راہ پر لگا دے جس پر چلے بغیر زندگی کی اگلی منزلوں تک پہنچنا ممکن نہ ہو، تو یہ کہا جائے گا کہ وہ اس سے متاثر ہوا اور اس کا رہینِ منت رہا۔ سرسید نے مولانا آزاد کو تقلیدِ جامد کے پنجوں سے نکالا؛ اور آزادیٔ فکر کی ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کیا۔ اس کے بعد جو منزلیں ان کو پیش آئیں، اُن کا راستہ اسی منزل سے ہو کر گزرتا تھا، جو سرسید نے اُن کو دکھا دی تھی۔ یہ کڑیاں ایک دوسرے سے مربوط تھیں، اس طرح کہ کوئی پہلی کڑی کو نکال دے تو دوسری ساری کڑیاں خود بخود ٹوٹ جاتیں۔ سرسید نے آزاد کو جو راہ دکھائی دی تھی، اس میں آئندہ کے مسائل کا حل بھی پنہاں تھا۔ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے ایک بار کہا تھا:

> "اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیے ہیں، جن کی ہم کو شکایت ہو تو بھی اُن

ڈیمکیش وہ چیز ہے جو خواہ مخواہ وکرہاً ہم کو
دے گی" (ٹیگورس کا مجموعہ ص ۱۸۹)

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے تفکر، تدبر اور اجتہاد کی راہ دکھا کر مولانا آزاد کی شخصیت کی تعمیر میں وہ بنیادی اینٹ رکھی تھی جس پر بعد کو ان کی فکر کا قصر بلند تعمیر ہوا۔ مولانا آزاد بعد کو جو کچھ بھی ہوئے وہ اسی بنیادی تاثر کے برگ و بار تھے۔ اس اثر کو مولانا آزاد کی زندگی سے نکال دیجیے تو ان کی دنیا شیخ خیرالدین خیوری کے سجادہ مشیخت کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی ہے!!

(۳) کوئی انسانی فکر، حالات گرد و پیش سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ سرسید نے اپنے عہد کے رجحانات اور اس کے تقاضوں کا جواب دیا تھا۔ مولانا آزاد نے یہی عمل اپنے عہد کے مطالبات کے ساتھ کیا — دونوں کے انداز فعال میں فرق، حالات کا نتیجہ ہے؛ کسی بنیادی اختلاف کا نہیں۔ دونوں آوازیں ایک ہی درد سے ابھریں اور انھوں نے ایک ہی احساس کی ترجمانی کی۔ یہاں پھر مولانا آزاد کا ایک پسندیدہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے ؂

من و بہدل حریف سعی بے جا نیستم واعظ
تو و قطع منازلہا، من و یک لغزش پائے

یہ صورت حال بھی تاریخ کے بعض حقائق کی روشنی ہی میں سمجھی جا سکتی ہے۔ سائنسی انقلاب نے یورپ کی سماج ... سیاست کے محور اور روز نظر کے سانچے یک قلم بدل دیے تھے۔ قدریں بدلیں تو مذہب کی اہمیت اور افادیت کے پیمانے بھی وہ نہ رہے۔ ان حالات میں مذہب اور سائنس میں معرکہ آرائی تاریخ انسانی کی ایک لازمی منزل تھی۔ وہ شروع ہوئی۔ بعض طبیعتوں نے مذہب کو سائنس کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ کچھ نے سائنس کو مذہب کے تابع کرنا چاہا، بعض نے افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی محرومیوں کو عظمت گزشتہ کے ریگزار میں چھپا لیا اور یہ سوچتے رہے کہ یہ آندھی اتر جائے تو گردن باہر نکالیں۔ اس معرکہ کی بڑی دلچسپ تصویر DRAPER نے Conflict between Religion and Science میں پیش کی ہے۔ سائنس اور مذہب کا یہ معرکہ پہلے یورپ میں پیش آیا، لیکن زیادہ عرصہ جاری نہیں رہا۔ سرسید کا زمانہ ہندوستان کی فکری تاریخ کا وہ دور ہے جب سائنس اور مذہب کا معرکہ ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ اس دور کا تقاضا تھا کہ یا تو مذہب سے بالکل دست بردار ہو جائے یا فکر کے نئے سانچے قبول کر لیے جائیں اور یہ خلیج بڑھنے نہ دی جائے۔ سرسید نے یہ تاریخی کام ایک تاریخی دور میں انجام دیا۔ اور اس معرکے کے خاتمے کی راہیں ہموار کر دیں۔ وقت نے آگے قدم بڑھایا تو ہندوستان میں بھی سائنس اور مذہب نے اپنی راہیں علیحدہ کر لیں۔ یہ مولانا آزاد کے دور کا آغاز تھا۔ انھوں نے DRAPER کی کتاب کا مطالعہ بہت غور اور فکر کے ساتھ کیا۔ اور ان تحریکوں کی روشنی میں جو یورپ میں اس معرکہ کے خاتمہ کے بعد وجود میں آئی تھیں حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ وقت کے تقاضے اب وہ نہ تھے جو سرسید کے زمانہ میں تھے۔ فضا بھی وہ نہ تھی جس میں سرسید کے روز و شب بسر ہوئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح مذہب کو انسان کی رفاہ و فلاح اور کائنات ہستی کو شان ربوبیت کا مظہر بنا کر فکر انسانی کی بنیادوں میں انقلاب لایا جائے۔ ہندوؤں میں مذہب و سائنس کا معرکہ مسلمانوں کے مقابلے میں پہلے شروع ہوا اور جلد ختم ہو گیا۔ خود بنگال میں Unitarian اثرات کام کرنے لگے، جن کی تفصیل Prof. DAVID KOPF نے The Bengal Renaissance as a Histrographical Prcblem میں بڑی عمدگی سے پیش کی ہے۔

سرسید کا پیدا کیا ہوا ذہنی انقلاب جب ان تحریکوں سے دوچار ہوا تو فکر و نظر کی نئی راہیں کھل گئیں!

(۴) مولانا آزاد نے بالکل اس طرح اپنے عہد کی روح کو اپنے اندر سمیٹ لیا جیسے سرسید نے اپنے عہد کے مطالبات کو اپنی فکر کے دامن میں لے لیا تھا۔ اگر سرسید اس بنیادی حقیقت کی طرف مولانا آزاد کی رہنمائی نہ کرتے کہ مذہب کو ہر دور میں اور ہر عہد میں وقت کے تقاضوں کا جواب دینا چاہیے۔ اور دینی فکر کو حالات گرد و پیش سے ہم آہنگ ہونا چاہیے تو مولانا آزاد ذہنی جمود، تقلیدی بندشوں اور عہد وسطیٰ کے فکری سانچوں سے باہر نہ نکل پاتے۔ بلکہ وہ سیاست کے میدان میں بھی جہاں انھوں نے سرسید سے اختلاف کیا، داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر دونوں کی زمانی حیثیتیں بدل دی جائیں تو ان کا عمل بھی اسی طرح بدل جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد کی فکر، سرسید کی فکر کی ایک ارتقائی اور یقینی منزل ہے جس سے مذہبی فکر کو گزرنا لازمی تھا۔ لیکن صرف اس صورت میں جب پہلی منزل پر فکر کو پوری طرح جھنجھوڑا جا چکا ہو۔ فکر انسانی کی تاریخ شاہد ہے کہ پہلی منزل سے گزرے بغیر اس منزل پر پہنچنا ممکن نہیں۔ مولانا آزاد کے بیدار تاریخی شعور نے اس معرکۂ دین و سائنس کا پورا جائزہ لیا تھا۔ لکھتے ہیں:

"دراصل یہ جنگ فکر انسانی کی تاریخ کا ایک

عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہوئی اور مشرقی ممالک کا اس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوستان میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور جلد ختم ہو گئی ــ مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے۔ وقت کے تقاضے فتح مند ہوئے اور قدامت پسندی کو اپنی ہار ماننی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے بلا خوف و تردد کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مرد میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشہ میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی۔ اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے۔"

(کانوکیشن ایڈریس ص ۴)

یہ ہے سرسید کا وہ رول جس نے مولانا آزاد کی زندگی کا رُخ متعین کیا۔ خود مولانا آزاد نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

"میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے جب سرسید مرحوم کی تصنیفات نے میرے دماغ پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا اور یہ میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا، بلاشبہ یہ اثر آگے چل کر دھیما پڑ گیا۔ اور مجھے فکر و نظر کی دوسری منزلیں پیش آ گئیں، تاہم میرا دماغ ان کے مصلحانہ اعمال کے تاثر سے کبھی خالی نہیں ہوا۔" (ایڈریس ص ۳)

مولانا آزاد نے ان چند جملوں میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اُن کے دماغ پر سرسید کے اثرات آخر دم تک قائم رہے، لیکن ایک مفکر کی حیثیت سے اُن کے سامنے فکر و نظر کی دوسری منزلیں آتی رہیں اور وہ نئے حالات میں نئے افکار کے روبرو پہنچ گئے۔ یہ بالکل فطری اور ارتقائی کیفیت تھی۔ اس کے پیچھے سرسید کے اثرات کا محکم قلعہ تھا۔ وہ نہ ہوتا تو ان کا کاروانِ خیال اس منزل تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

(۵) کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد، مولانا جمال الدین افغانی کے ہم خیال تھے۔ اور جمال الدین افغانی سرسید کے شدید مخالف تھے۔ اس لیے مولانا آزاد کا بھی سرسید کے مخالفین میں شمار ہونا چاہیے۔ یہ رائے بھی آسانی سے قبول نہیں کی جا سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا جمال الدین افغانی سرسید کے انتہائی شدید مخالف تھے۔ اور انہوں نے اپنے بعض مضامین میں سرسید کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اُن کے علمی منصب کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں دو حقائق نظر انداز نہیں کرنے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا آزاد نے اپنی تصانیف میں کسی جگہ ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو سرسید کی شان کے خلاف ہو۔ اختلافِ رائے اپنی جگہ تھا، لیکن احترام اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ دوسرے یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ مولانا آزاد مولانا افغانی کی فکر سے پوری طرح متفق تھے۔ اُن کے دل میں افغانی کی بڑی عزت تھی۔ اُن کے جوش اور جذبے سے بے حد متاثر تھے، لیکن انہوں نے اپنی راہ افغانی سے مختلف نکالی تھی۔ خود لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو موجودہ پستی سے نکالنے... (کے) بارے میں ابتدا سے تین مختلف مذاہب اصلاح ہیں.... پہلا مذہب وہ ہے جسے میں "اصلاح افرنجی" سے موسوم کرتا ہوں.... (یہ) یورپ کے تمدن و صنائع کے ظہور و اطلاق کا عہد تھا (ایک جماعت میں) مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ہندوستان میں سرسید احمد خاں مرحوم.... ترکی میں سلطان محمود خان۔ ..... اسی گروہ میں محسوب ہیں.... دوسرا مذہب اصلاح سیاسی کا مذہب ہے..... اس مذہبِ اصلاح کے سب سے بڑے داعی مرحوم سید جمال الدین اسدآبادی تھے.... تیسرا مذہب "اصلاحِ دینی و اسلامی" کا ہے.... اسی آخری مسلک اصلاح.... کی..... دعوت و تبلیغ کے لیے ۱۹۱۲ء میں، میں نے "الہلال" جاری کیا تھا۔"

(خطبہ صدارت جمعیۃ العلماء اجلاس لاہور)

یہاں انہوں نے صاف اپنی فکر کو سرسید اور افغانی سے علیحدہ کر لیا ہے!!!۔

(۶) مولانا آزاد نے جب اپنی طالب علمی کا دور ختم کیا تو بنگال کی انقلابی تحریکوں میں شریک ہو گئے۔ ان کا رشتہ ریشہ دار دورس کو پکارنے لگا۔ انہوں نے مسلمانوں کو بھی تحریکِ آزادی میں کود پڑنے کی دعوت دی۔ مسلمانوں کی کیفیت یہ تھی کہ جنگ بالاکوٹ اور پھر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اُن کی ہمتوں کو پست اور ارادوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے "غدر" کا جو انتقام لیا تھا، اُس سے تاریخ کا کوئی طالب علم ناواقف نہیں۔ ان حالات میں کچھ علماء ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ کچھ نے اپنے دروازے

بند کرلیے۔ غالب نے یہ کہہ کر:

چوں عکس پل بسیل بذوق بلا برقص
جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

حالات سے صلح کرلی۔ سرسید یہ شعر پڑھ کر

حریف کاوش مژگان خون ریزم نہ ناصح
بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کن

میدان میں کود پڑے۔ اُن کی بصیرت کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی ساری توجہ مغربی سائنس اور علوم کے حصول کی طرف مرکوز کر سکیں۔ شاید پنڈت جواہر لال نہرو واحد شخص تھے، جو کی تاریخی ژرف نگاہی نے سرسید کے اس فیصلہ کی اہمیت اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھا اور لکھا کہ سیاست سے علیحدہ رہ کر مغربی تعلیم کو حاصل کرنے کی تلقین "سرسید کی فکر کی صحیح انقلابی سمت کی نشاندہی کرتی ہے۔"

An Autobiography pp. 461-462

(۷) لیکن جیسا پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "سرسید کے اس فرسٹ ایڈ کو ان کے بعد آنے والوں نے خود غرضی یا نا سمجھی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمۂ صحت"۔۔۔۔ مولانا آزاد نے اس صورت حال کو جو علی گڑھ کے اس زمانے کے ارباب حل و عقد نے پیدا کر دی تھی، اپنی انقلابی فطرت سے متصادم پایا اور وہ سیاسی میدان میں سرسید کی فکر سے دور ہوتے چلے گئے۔ الہلال کے صفحات میں انہوں نے علی گڑھ کے ان ارباب اقتدار پر تنقید کی ہے جو ترک موالات، بائیکاٹ وغیرہ تحریکوں کے مخالف تھے۔

یہ تھا سرسید سے اختلاف کا وہ پہلو جسے بعض مصنفین نے بالکل دوسرے رنگ میں پیش کیا اور سرسید اور مولانا آزاد کو دو متضاد اندازِ فکر کا ترجمان بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید اور ان کی مغربی تعلیم کی تحریک نہ ہوتی تو مسلمان آزادی کی تحریک میں اس طرح شریک نہ ہو پاتے۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا محمد علی نے سرسید کی روح سے یہ کہہ کر ۔۔۔۔

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے! نواب وقار الملک بھی یہی کہتے تھے کہ اگر اس وقت سرسید زندہ ہوتے تو اپنے فیصلے کو بدل کر سیاسی میدان میں داخل ہو جاتے۔ لیکن سرسید کے زمانے میں حالات کا رنگ بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو (جب مولانا آزاد پیدا بھی نہیں ہوئے تھے) لکھنؤ میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"اس وقت ہزار ہا آدمی آئرلینڈ کا تلواروں سے جان دینے کو مستعد ہے۔ بڑے بڑے آدمی جو اس کے طرفدار ہیں نہ قید سے ڈرتے ہیں نہ پولیس کی سنگینوں سے۔ خدا مجھ کو مہربانی سے ہندوستان میں دس آدمی نکال دیجیے۔ جو سنگینوں کے سامنے آنا قبول کریں۔" (لکچروں کا مجموعہ ص ۲۹۵)

جب ایسے لوگ پیدا ہو گئے تو سید و محسن نے آزاد کو آواز دی اور وہ اس طرح میدان میں داخل ہو گئے گویا اس کے انتظار میں اپنی زندگی کے رات اور دن گزار رہے تھے!

(۸) سرسید کی فکر کا ایک اہم پہلو جو مولانا آزاد کی نظر میں سب سے زیادہ اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا تھا، وہ ان کا تصور قومیت تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو صرف ایک قوم ہی نہ سمجھتے تھے بلکہ دونوں پر "ہندو" کا اطلاق کرتے تھے اور اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی وہ تمام افکار و نظریات نہ تھے جو بعد کو اُن سے منسوب کیے گئے۔ مولانا آزاد کہتے تھے کہ "اگر ہندو مسلمانوں نے اس رائے کی روح کو سمجھا ہوتا اور اس کی پیروی کی ہوتی تو آج ملک کی تاریخ کا رُخ دوسرا ہوتا۔"
(کانوکیشن ایڈریس ص ۵)

ہندوستانی مفکروں میں مولانا آزاد کے نظریۂ قوم و وطن کی اگر کوئی تاریخی اساس ہے تو وہ صرف سرسید کے افکار ہیں!

(۹) بہر حال مولانا آزاد کو سرسید کا مخالف (بلکہ بقول مولانا آزاد "دشمن") بنا کر پیش کرنا اس وقت کے علی گڑھ کے ارباب اقتدار کا کام تھا۔ مولانا آزاد نے خود اس سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"کیا فی الحقیقت میں سرسید مرحوم اور اُن کے قائم کیے ہوئے تعلیمی ادارہ کا مخالف تھا؟ ۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ میں ان کے شاندار اصلاحی کارناموں کا معترف اور ان کی عظمت کا معتقد تھا۔ میری طرح نہیں تھی کہ سرسید مرحوم سے ملنے کی عزت حاصل کر سکتا، لیکن اُن کے دو جانشینوں اور اُن کے حلقہ کے بعض بزرگوں کا زمانہ میں نے پایا تھا اور ان کی خدمت میں مجھے نیازمندی حاصل تھی۔" (کانوکیشن ایڈریس ص ۳)

پھر مولانا آزاد اپنے اختلاف کی نوعیت بتاتے ہیں:

"میں سرسید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو اُن کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ وہ انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے اور اُنہوں نے ملک کے لیے شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔" (ص ۳)

سرسید کی عظیم الشان علمی، اصلاحی اور سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"مرحوم سرسید اور اُن کے ساتھیوں نے صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی، ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔"

(کانووکیشن ص ۷)

اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر مولانا آزاد پر سرسید کے اثرات کی تفصیلات کا پتہ لگانا مشکل نہیں۔

(۲)

مولانا آزاد کی سرسید سے ابتدائی زمانہ میں عقیدت کا حال مولانا ملیح آبادی نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اثرات کی نوعیت اور مولانا آزاد کی زندگی اور ادبی کاوشوں پر ان کے نقوش کی نشاندہی شاید بے سود نہ ہو۔

(۱) مولانا آزاد کا بیان ہے :

"ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ایسے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے ... فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں۔ .. جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔" (ص ۷)

سرسید کی صحافتی زندگی اور اس کی روایات سے مولانا آزاد نے پورا پورا اثر قبول کیا۔ لسان الصدق اور الہلال دونوں میں تہذیب الاخلاق کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سرسید نے ۹ جنوری ۱۸۹۷ء کے تہذیب میں اپنے رسالے کے جن مقاصد کی وضاحت کی ہے، بالکل اسی انداز میں اور ان ہی خطوط پر مولانا آزاد نے ۲۰ نومبر ۱۹۰۲ء کے لسان الصدق میں اپنے مقاصد کا اعلان کیا ہے۔ مولانا آزاد جب ان مقاصد کی تفصیل بیان کرتے ہیں تو ان کا ذہن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، اس کے شعبۂ اصلاح تمدن، سرسید اور اُن کے حلقہ کی طرف جاتا ہے۔ بنگال کو "زندہ دلانِ پنجاب" کی مثال دے کر ابھارتے ہیں۔

جب الہلال نکلا تو مولانا آزاد اپنے افکار کی دوسری منزل پر پہنچ چکے تھے۔ وہ سیاسی میدان میں سر بکف کھڑے تھے اور ان کا ریشہ ریشہ دارورسن کو دعوت دے رہا تھا۔ اس منزل پر سرسید کی قیادت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں بھی وہ سرسید کے جلائے ہوئے چراغ سے روشنی حاصل کرتے تھے۔ سرسید نے گزٹ کی پیشانی پر لکھا تھا :

> Liberty of the Press is a prominent duty of the Government and natural right of the subjects.

اسی اعلان کا اثر تھا کہ لالہ لاجپت رائے نے ٹریبیون میں لکھا تھا

> "From childhood, I was taught to respect the opinions and the teachings of the white-bearded Syed, of Aligarh. Your Social Reformer was constantly read to me by my fond father, who looked upon you as no less than a prophet of the nineteenth century.... It was thus that I came to know.....the contents of John Stuart Mill's book on liberty."

کون کہہ سکتا ہے کہ "الہلال" نے سرسید کے اعلان کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ آزادیٔ رائے کا تصور اور سیاسی حقوق طلبی کی پہلی آواز سرسید نے اٹھائی تھی! (ملاحظہ ہو اسبابِ بغاوتِ ہند)

(۲) مولانا آزاد نے "وکیل" کی ادارت اس لیے قبول کی تھی کہ اس کے مالک شیخ غلام محمد سرسید کے زبردست عقیدتمند تھے۔ "وکیل" کے ایک مضمون میں سرسید کے افکار و نظریات اور ممالکِ اسلامیہ پر ان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ یہ دور سرسید سے غیر معمولی شیفتگی اور عقیدت کا تھا، لیکن اہم بات یہ ہے کہ سرسید کے جن اثرات کا انہوں نے ذکر کیا ہے، وہ تمام عمر کی

کی زندگی میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعض حصے قابلِ غور ہیں:

(۱) "جو آواز اب سے تیس چالیس برس پیشتر اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبانی سرزمینِ ہند میں بلند ہوئی تھی، آج مصر، استنبول اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان پر ہے۔"

(ب) "سرسید نے بائیبل کے متعلق جو لکھا تھا۔ ایک مدت کے بعد مصر کے ایک عیسائی عالم نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور وحدت الادیان کے نام سے اخبار جاری کیا۔"

(ج) "سرسید ہی دنیا میں وہ پہلا شخص ہے، جس نے پہلے پہل یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علم کلام کی ضرورت ہے۔"

(د) "شیخ محمد عبدہ .... المنار میں درس قرآن کا اقتباس شائع کر رہے ہیں) جس میں اُس اصول پر تفسیر کی جاتی ہے جو کبھی ہندوستان میں موجب تکفیر سمجھا گیا تھا .... الغرض جو خیال اب سے تیس برس پیشتر سرسید مرحوم نے ظاہر کیا تھا، وہی خیال آج کل اسلامی دنیا کا بالعموم ہو رہا ہے۔"

(ہ) "یورپ اسلام پر بڑے زور سے معترض ہے کہ اسلام انسان کو اس کی فطری آزادی سے محروم رکھتا ہے اور غلامی کی ناپاک رسم کا حامی ہے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کا سب سے پہلے سرسید احمد کو خیال ہوا۔"

یہ سب وہ محور ہیں جن پر مولانا آزاد کی فکر عمر بھر گردش کرتی رہی۔ سرسید نے مذہبی معاملات میں جہاں تقلید کی بندشوں کو توڑا تھا، وہاں مدافعتِ دین کے لیے عالمانہ قلعے بھی تعمیر کیے تھے۔ ان کی کتاب "خطباتِ احمدیہ" تلاش و تحقیق کا شاہکار ہے۔ مولانا آزاد کی فکر پر اس کے گہرے نقوش پڑھے جا سکتے ہیں۔

(ز) وحدتِ ادیان کا تصور شاہ ولی اللہ کے ذریعہ سرسید کے یہاں آیا۔ مولانا آزاد کے ترجمان القرآن میں اُس نے ایک فکری اور سماجی شاہکار کی حیثیت اختیار کر لی۔ فکر کے منابع کا سراغ عام روایتی پیمانوں سے نہیں لگایا جا سکتا، لیکن اگر گرد و پیش کے تعصبات اور فکری عصبیت سے آزاد ہو کر فکر و عمل کے سوتوں کی تحقیق کی جائے تو صاف اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا آزاد کا کارگہِ فکر کہاں تھا!

سرسید کا اثر مولانا آزاد کے اپنے لباس ــــ ترکی ٹوپی، ترکش کوٹ میں عرصہ تک جھلکتا رہا (غالباً اس وقت تک جب تک مولانا شبلی نے ان کو مذہبی لباس میں رہنے کی تلقین نہ کی) الہلال کا لباس بھی سرسید سے لیا گیا تھا ــــ سرسید نے ٹائپ کو رواج دینے کی جو کوشش کی تھی، اس کو مولانا آزاد نے آگے بڑھایا۔!

(۳) مولانا آزاد نے سرسید سے جس طرح سیاسی جد و جہد کے مسئلہ پر اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگوں کو یہ بدگمانی پیدا ہوگئی کہ مولانا آزاد کو سرسید کے خیالات سے کوئی بنیادی اختلاف تھا یا وہ اُن کے مخالف تھے۔ ایسا خیال ان لوگوں کو پیدا ہو سکتا ہے جو مولانا آزاد کی صاف گوئی اور بے جھجک اظہارِ خیال سے ناآشنا ہیں۔ مولانا آزاد اپنی رائے کا اظہار حق و دیانت کا مطالبہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہ تھے کہ وہ اس شخص کے مخالف تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ پر جو ان کے خاندان کے استاد الاستاذ تھے، اعتراض کیے ہیں۔ اپنے والد کی تقلید پسندی پر تنقید کی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض فیصلوں سے اختلاف کیا ہے۔ مولانا شبلی سے اپنی عقیدت کے باوجود ان کی دوسری شادی کے موقع پر ان کے بیٹے حامد حسن کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کا سبب مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے صاف لکھ دیا ہے کہ "اس لیے کہ پہلے یہ رشتہ خود حامد کے لیے تجویز ہوا تھا ــــ" اگر ان تنقیدوں کو سامنے رکھ کر کوئی یہ کہنے لگے کہ مولانا آزاد، شاہ عبدالعزیزؒ کے علمی مرتبہ کے منکر، اپنے والد کے مخالف، پنڈت نہرو کے منکر اور مولانا شبلی کے کردار کے نکتہ چین تھے ــــ تو یہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہوگا۔ بالکل یہی معاملہ سرسید کے ساتھ ان کا ہے۔ ان کو سرسید کا مخالف بنا کر پیش کرنا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ ان کے کارنامے ارتقائی منازل ہیں، اس فکری انقلاب کے جس کا بیج سرسید نے بویا تھا۔ اگر شبلی کی وفات کے تیس سال بعد وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ

"مولانا شبلی کی ساری دماغی تربیت سرسید کی وجہ سے ہوئی۔"

تو آج کا مورخ بھی پوری صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد یہ سوچنے پر حق بجانب ہوگا کہ سرسید نے جو چراغ دکھایا تھا، اس سے وہ ساری راہیں روشن ہوتی چلی گئیں، جہاں مولانا آزاد نے بعد کو ذہنی سفر کیا!

غیر مطبوعہ مضامین، نظم و نثر
کی واپسی کے لیے
مناسب سائز کا ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ
ارسال کریں۔ ــــ ادارہ

سید احتشام احمد ندوی

سیّد جمال الدّین افغانی اور مولانا ابوالکلام آزاد

(ایک تقابلی مطالعہ)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں یورپی استعمار نے عالمِ اسلامی پر یلغار کر دیا تھا اور تمام اسلامی ملکوں پر ان کے پنجے گڑ چکے تھے۔ ترکی کا مردِ بیمار آخری ہچکی لے رہا تھا۔ اور اس کی وراثت ایک منصوبے کے تحت پہلے ہی تقسیم ہو چکی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست اور اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ترکوں سے ہمدردی اور جوش و جذبات اور اس کے نتیجے میں تحریکِ خلافت کا وجود اس پس منظر میں ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا منصۂ سیاست و امامت پر ظہور اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ہفتہ وار "الہلال" کا اجراء، اُدھر مصر کے افق سے ایک دوسرے مصلحِ عظیم کا ظہور یعنی سید جمال الدین افغانی کا ۸ برس قاہرہ میں قیام اور جامعہ ازہر میں آزادی اور جمہوریت کا درس، مصر سے جلا وطنی اور پیرس میں قیام اور وہاں سے العروۃ الوثقیٰ کا صدور، افغانی کے جانشین شیخ محمد عبدہ کی تفسیر المنار اور ادھر مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن جمال الدین افغانی کی انگریزوں سے دشمنی اور عالمِ اسلام سے ان کو نکالنے کے منصوبے، ادھر مولانا آزاد کا کانگریس میں شمول اور پوری طاقت سے انگریزوں کی مخالفت اور ملک کی جدوجہدِ آزادی میں بھرپور شرکت مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت غرض یہ ایسے حالات ہیں جن میں بڑی مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اسلام اور آزادی کے حسین امتزاج کے ساتھ افغانی اور آزاد کی آوازیں بلند ہوئیں۔ جن میں صورِ اسرافیل کی تاثیر تھی۔ مصر سے سید جمال الدین افغانی نے انگریزوں کے خلاف آزادی کا نعرہ لگایا، دلوں کو گرما دیا اور جذبات کو بھڑکا دیا۔ ان کے خیالات جنگل کی آگ کی طرح پورے مصر میں پھیل گئے۔ ان کو فوراً مصر سے نکال دیا گیا، مگر جو آگ انہوں نے لگائی تھی، وہ شعلہ بھڑک اُٹھا اور مصر میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہو گئی شیخ محمد عبدہ جن کے بارے میں مصر چھوڑتے وقت سید جمال الدین افغانی نے فرمایا تھا کہ "میں نے مصر میں شیخ محمد عبدہ کی شخصیت میں خیرِ کثیر چھوڑا ہے"[1] واقعی وہ اپنے استاذ کے صحیح اور طاقت ور جانشین ثابت ہوئے۔ انہوں نے فتویٰ جاری کر دیا کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنا اور بادشاہ (جو نیم آزاد تھا اس کی) بیعت توڑ دینا واجب ہے[2] لہٰذا انگریزوں نے انہیں شام جلا وطن کر دیا۔ وہاں سے جمال الدین افغانی نے ان کو سوئٹزرلینڈ بلا لیا۔ اب دونوں نے مل کر ایک عربی رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ کیا تھا ایک شعلۂ جوالہ، ایک برقِ تپاں اور ایک طاقت ور انقلاب آفریں صحیفہ تھا جس نے عرب اور اسلامی ممالک میں آگ لگا دی۔ یہ رسالہ صرف آٹھ ماہ نکل سکا، مگر اس نے اپنے دور کے دانشور طبقے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اس کے اسلوب میں جادو تھا۔ یہ جذبات اور عشق کی زبان تھی۔ اس کا اسلوب نرالا تھا اور نہایت طاقت ور۔ اس رسالے نے تہلکہ مچا دیا اور فکر و نظر کے پیمانے بدل دیے۔ اس نے عرب ملکوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ و جہاد کے لیے تیار کیا اور پُرزور آواز سے آزادی کا صور پھونکا جس میں مذہب اور سیاست کا امتزاج تھا۔ جمال الدین افغانی کی سیاست، مذہب کی راہ سے پروان چڑھی تھی۔ وہ استعمار کے کھُلے دشمن تھے۔ جمہوریت آزادی اور شوریٰ کے زبردست حامی تھے۔ وہ اسلامی ملکوں کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے، اور بادشاہت اور شخصی حکومت کے مخالف تھے۔ وہ پان اسلامزم کے مؤید، عظیم مصلح اور داعی تھے۔ وہ اپنے مشن کے لیے سب کچھ لُٹا چکے تھے۔ نہ کہیں گھر بنایا اور نہ کہیں گھر بسایا

• صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی، کیرلا۔

وہ جہاں رہے آزادی اور انقلاب کا نعرہ بلند کرتے رہے[۳۴]

یہ "العروۃ الوثقیٰ" تھا، جس نے ان کے پیغام کو عام کیا۔ چنانچہ مشہور مصری مصلح اور عالم سید رشید رضا اپنی ذات پر اور اپنی پوری زندگی پر اس رسالے کے اثرات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: "ایک شام مجھے دوستوں کی ایک محفل میں "العروۃ الوثقیٰ" کا ایک مضمون سننے کا موقع ملا۔ اس کے جادو نے مجھ کو اپنی طرف کھینچا اور میں نے اس کا مطالعہ اس اہتمام سے کیا کہ العروۃ الوثقیٰ کے پرانے فائل بھی جمع کر کے پڑھ ڈالے۔ اس نے میرے سامنے فکر و نظر کی ایک نئی راہ کھول دی[۳۵] اس کے مطالعے نے ان کی زندگی کے دھارے کو پلٹ دیا۔ اور اس طرح ان کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جس میں جہد و جہد تھی۔ تجدید و احیائے دین کا اعلیٰ نصب العین تھا اور مسلمانوں کی سیاسی و اجتماعی زندگی کو اسلامی رنگ میں ڈھالنے کا شوق تھا۔ سید رشید رضا پر "العروۃ الوثقیٰ" کا نشہ اتنا تیز تھا کہ وہ سید جمال الدین افغانی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے قسطنطنیہ روانہ ہو گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو سید جمال الدین کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس پُر عزم نوجوان نے ہمت نہیں ہاری اور ان کے صحیح جانشین شیخ محمد عبدہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی ان کی وفات تک انہیں کے ساتھ رہے۔ حکومتِ برطانیہ نے "العروۃ الوثقیٰ" پر پابندی لگا دی تھی۔ لہٰذا رشید رضا نے شیخ محمد عبدہ کی زندگی میں اسی انداز پر مصر سے ایک ہفتہ وار "المنار" نکالا۔ پھر سال بھر بعد اس کو ماہ نامہ کر دیا۔ اس رسالے نے جمال الدین افغانی کے پیغام کو عام کیا۔ اور "العروۃ الوثقیٰ" کے مشن کو جاری رکھا[۳۶]

بالکل یہی عالم "الھلال" کا تھا۔ جس نے فکر و فن کے پیمانے بدل دیے۔ ایک نئے اسلوب اور ایک نئے اندازِ نظر سے آسمانِ ادب پر یہ ہلال طلوع ہوا اور اس نے ادبی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ الہلالی اسلوب اور الہلالی اردو کا ظہور ہوا۔ نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کا اختراع کیا گیا۔ اگرچہ زبان مشکل ہو گئی مگر ذوقِ جمال کو ملحوظ رکھا گیا۔ مناسب اشعار اور آیاتِ قرآنی سے استدلال کیا گیا۔ اس رسالے نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ اس نے مسلمانوں کو للکارا۔ انگریزوں کے خلاف ایک فضا پیدا کی۔ دماغوں میں آزادی کا نشہ بھر دیا۔ مگر یہ آواز دین کی راہ سے آئی۔ مولانا آزاد نے وطن کی راہ میں جد و جہد کو اسلام کا تقاضا قرار دیا۔ انگریز دشمنی میں وہ بہت آگے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت جاری کر دی کہ وہ انگریزی مال کا بائیکاٹ کریں۔ اور کھدر کا استعمال کریں۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے جد و جہد کو ایک فرضِ دینی اور جہاد فی سبیل اللہ کہتے تھے۔ "الہلال" اگرچہ مذہبی رسالہ تھا مگر مصوّر تھا۔ اس کی روشن خیالی تو اسی کیفیت سے واضح ہے پھر مولانا نے الہلال کے صفحات پر سیاسی تجربے شروع کر دیے۔ اور اپنی مذہبی جماعت حزب اللہ کی تاسیس کا اعلان کر دیا اور لکھا کہ جو لوگ اس جماعت کے ممبر بننا چاہیں وہ اپنا نام اور پتہ لکھ کر بھیج دیں ـــ ... لوگوں نے اپنا نام اور پتہ لکھ کر مولانا کو بھیج دیا[۳۷] پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ: "اس وقت جب مولانا نے الہلال نکالا تھا مسلمان کیسی زبان سمجھ سکتے تھے؟ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج بھی مسلمان مذہبی زبان اور دینی اصطلاح ہی کو معتبر تصور کرتا ہے ـــ سیکولر لب و لہجے اور جدید اصطلاحوں کو سند نہیں مانتا۔ یہ صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہندوؤں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ اس لیے گاندھی جی نے بھی اپنی سیاسی و سماجی سرگرمیوں کے آغاز ہی سے مذہبی اصطلاحیں استعمال کیں۔ ... ... مولانا اور گاندھی جی کی زندگی میں تو مذہب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی"[۳۸] وہ مزید لکھتے ہیں کہ: "ہمارا خیال ہے کہ مولانا آزاد پر دورِ الہلال سے پہلے مصر کی سلفی تحریک کا گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ اس تحریک کا خاص منبع فیض ابن تیمیہ کی شخصیت، عقائد اور خیالات تھے۔ مولانا پر پہلے ہی سے شبلی وغیرہ کی وجہ سے ایک خاص طرح کی رومانیت چھائی ہوئی تھی۔ پھر مولانا کی ذہنی تربیت جس تعلیمی حریم و مسلک میں ہوئی تھی، اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ دین و مذہب ہی کی راہ سے ملکی اور ملی سیاست میں داخل ہوں"[۳۹]

"تحریک الہلال" کے بارے میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "ہم سب اپنا کام بھولے ہوئے تھے۔ الہلال نے یاد دلا دیا"[۴۰] وقت کے چوٹی کے علماء میں حضرت شیخ الہند کی واحد شخصیت تھی ـــ جس نے تحریک الہلال کی اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور یہ خیال کیے بغیر کہ داعی ایک ایسا نوجوان ہے جس کی عمر پچیس، چھبیس برس سے زیادہ نہیں، مولانا کی دعوت کو قبول کر لیا"[۴۱]

"ترجمان القرآن" جلد دوم میں سورۂ توبہ کی آیت ۲۹ کے حاشیہ میں مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۱۳ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی، لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ ایذن لی ولا تفتنی۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود الحسن دیوبندی کی

"الہلال" کا اجرا انہوں نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے کیا تھا۔ یہ رسالہ لگ بھگ تین برس جاری رہا۔ مگر درمیان درمیان حکومت نے اس پر قدغن بھی لگائی۔ بعد میں "البلاغ" بھی چند ماہ نکالا۔ اس کے بعد مولانا کی کانگریس میں شرکت کے باعث قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور البلاغ بند ہو گیا۔ لہٰذا مولانا نے اپنے مشن کو پھیلانے اور اپنی دعوت کو عام کرنے کے لیے ترجمان القرآن کے نام سے تفسیر لکھنی شروع کی۔ قید و بند میں یوں بھی ان کے پاس وقت تھا۔ اگرچہ مراجع کی کتابیں میسر نہ تھیں۔ تفسیر قرآن کا سلسلہ دراصل "الہلال" کے صفحات پر شروع ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب لکھتے ہیں: "مولانا ابوالکلام آزاد نے جب کلکتہ سے الہلال جاری کیا تو اس میں وہ جابجا قرآنی آیتوں سے استدلال کرتے تھے۔ دنیائے صحافت میں یہ ایک نیا طریقہ تھا۔ اور پھر وہ اتنا مقبول ہوا کہ ان کو قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ان کے سامنے اس وقت تین چیزیں پیش نظر تھیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مقدمۂ تفسیر۔"

تفسیر طرجان کے الفاظ میں یہ ہے [۱۲]

"قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے اندازِ بیان اور اپنے طریقِ خطاب، اپنے طریقِ استدلال میں ہمارے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں۔ اس میں نظری مقدمات نہیں ملیں گے اور نہ اس کا بیان ارسطو کے بنائے ہوئے منطقی اصول پر پورا اترے گا۔ اس کے برعکس وہ انسانی فطرت اور انسانی وجدان سے براہِ راست مخاطب ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خداپرستی کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس سے انکار کرنے لگتا ہے یہ اس کی غفلت ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس کو غفلت سے چونکانے کے لیے دلیلیں پیش کی جائیں، لیکن یہ دلیل ایسی ہونی چاہیے جو اس کے نہاں خانۂ دل پر دستک دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کرے۔ اگر اس کا وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثباتِ مدّعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہ ہوگی۔ خود اس کا وجدان ہی اُسے مدّعا تک پہنچا دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن خود انسان کی فطرت ہی سے انسان پر حجت لاتا ہے۔"

مولانا آزاد مزید فرماتے ہیں کہ: "انسانی فطرت اپنی بناوٹ میں ایک ایسا سانچہ لے کر آئی ہے جس میں یقین و ایمان ہی ڈھل سکتا ہے۔ شک و انکار کی اس میں سمائی نہیں ہے۔" [۱۴]

مولانا آزاد روایتی تفسیر او ریونانی افکار اور اسرائیلیات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"قرآن حکیم اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے۔ یہ اس کا بنیادی امتیاز ہے جو انبیائے علیہم السلام کے طریقِ ہدایت کے موافق ہے اور علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز ہے۔" [۱۵]

فکر و خیال میں جو مماثلت مولانا آزاد اور سید جمال الدین افغانی کے درمیان ہے اس کی پوری ترجمانی ان دونوں کے طرزِ تفسیر قرآن میں بھی موجود ہے۔ تفسیر کا سلسلہ خود "العروۃ الوثقیٰ" سے شروع ہوا۔ سید رشید رضا نے وہ تفسیر قرآن پڑھی تھی جو مذکورہ رسالہ میں شائع ہوتی تھی۔ اس طرزِ تفسیر کو انہوں نے پسند کیا اور جب ۱۳۱۵ھ میں شیخ محمد عبدہ سے درخواست کی کہ آپ اسی انداز پر تفسیر قرآن لکھیے جیسا کہ آپ "العروۃ الوثقیٰ" میں لکھا کرتے تھے۔ استاذ امام نے تفسیر خود تو اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی لیکن جامعہ ازہر میں قرآن مجید کا درس دینا شروع کر دیا۔ یہ یاد رہے کہ سید جمال الدین نے مصر کے دانشور طبقہ کے اندر جو انقلاب پیدا کیا اس کا اصلی ذریعہ یہی درسِ قرآن تھا۔ اس بنا پر دراصل یہ وراثت تھی جو شیخ محمد عبدہ کو سید جمال الدین افغانی سے ملی تھی۔ اس طرح افغانی کا پیغام اور طرزِ دعوت و تفسیر شیخ محمد عبدہ نے ان سے اخذ کیا اور ان سے یہ امانت سید رشید رضا کو عطا ہوئی۔ جو تفسیر العروۃ الوثقیٰ میں شائع ہوتی تھی۔ وہ بھی شیخ محمد عبدہ لکھتے تھے۔ اب جو نیا سلسلہ شیخ عبدہ نے ازہر میں شروع کیا تو سید رشید رضا نے اس کو قلمبند کرنا شروع کر دیا اور پھر رسالہ المنار میں شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا۔ شائع ہونے سے قبل شیخ محمد عبدہ اس پر خود نظر ثانی فرماتے تھے۔ اس میں حذف و اضافہ کر کے اس کی تہذیب و تنقیح کرتے تھے [۱۶] یہی وجہ ہے کہ جو تفسیری اجزا المنار میں شیخ محمد عبدہ کے لکھے ہوئے ہیں، اُن کا انداز اس حصے سے بالکل مختلف ہے جس کو سید رضا نے شیخ امام کی وفات کے بعد مرتب کیا ہے [۱۷] میں سمجھتا ہوں کہ شیخ محمد عبدہ نے سید جمال الدین کے فکر کی ترجمانی بہت عمدہ طریقہ سے کی ہے۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ مولانا آزاد نے کس طرح اپنی تفسیر کو مفسرین کے اقوال، یونانی فلسفہ کے تتبع اسرائیلیات کا بیان اور ضعیف روایتوں سے محفوظ رکھا ہے اور فطری انداز اختیار کیا ہے۔

بالکل یہی انداز شیخ محمد عبدہ نے بھی اختیار کیا ہے اور دراصل یہ تفسیر اپنی روح کے لحاظ سے "العروۃ الوثقیٰ" کے پیام کی تشریح اور توسیع ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیات میں سے قلتِ روایت، کثرتِ درایت، ضعیف روایتوں سے اجتناب اور اسرائیلیات کا ترک کر دینا شامل ہے۔ مصطفیٰ طبری نے لکھا ہے کہ شیخ امام خود آیاتِ قرآنی سے قرآن کی تشریح فرماتے تھے اور مستند صحابہؓ سے ثابت شدہ اقوال ہی کو اخذ کرتے تھے، اجتماعی مسائل اور شریعت کے حکم کو واضح کرتے تھے؛ بالی مؤثر استعمال کرتے تھے[۱۸]

مصطفیٰ محمد الحدیدی لکھتے ہیں کہ: "اس تفسیر کی خوبی یہ ہے کہ یہ مقتضائے حال کے مطابق ہے۔ اس میں قارئین کے ذہن و رجحان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دورِ جدید کے پیدا کردہ شبہات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں اسرائیلیات بالکل نہیں"[۱۹] اس تفسیر کا مقصد قرآن کی اس طرح تفہیم ہے کہ یہ لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے، جس میں ان کی دنیا و آخرت کی فلاح ہے۔ اس میں مفسرین کے اقوال سے پرہیز، ابہامات سے اجتناب اور اصطلاحاتِ علمیہ سے اغماض برتا گیا ہے، علمی مسائل کو نہیں اچھالا گیا، مگر مشکلاتِ قرآن کو واضح کیا گیا ہے۔ شبہات کو رفع کیا گیا ہے۔ درایت کا حق ادا کر دیا گیا ہے اور حکمِ شریعت کے مطابق انسانی سماج کے امراض کی تشخیص اور ان کا علاج پیش کیا گیا ہے[۲۰]

یہ فطری طریقہ تھا امام محمد عبدہ کا تفسیر قرآن میں۔ مگر انہوں نے تفسیر کا کچھ ہی حصہ لکھا تھا کہ اُن کا وقتِ موعود آ پہنچا۔ ان کے بعد سید رشید رضا نے یہ سلسلہ جاری کیا اور آگے لکھنا شروع کیا اب فطری و وجدانی طریقہ ختم ہو گیا اور وہی لغت کے مسائل، تفسیری اقوال، احادیث حتیٰ کہ رشید رضا نے واقعات و اسرائیلیات براہِ راست بائبل سے نقل کر دینے کا طریقہ اختیار کیا[۲۱] مگر تعجب ہے کہ الوزر الجندی جیسا ناقد اس کا ذکر مدح کے انداز میں کرتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ شیخ احمد شاکر نے محمد عبدہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ روحانی حکیم تھے، مگر ان کا علم حدیث وسیع نہ تھا[۲۲] سید رشید رضا خود فرماتے ہیں: "استاذ امام کی وفات کے بعد میں آزاد ہو گیا اور میں نے ان کی طرزِ تفسیر سے مختلف انداز اختیار کیا۔ احادیث سے زیادہ مدد لی۔ مفردات اور جملوں کی نحوی اور لغوی تشریح کی۔ علماء کے درمیان اختلافی مسائل کا ذکر کیا۔ دوسری سورتوں کی آیات سے بھی استدلال کیا، تاکہ حجت قوی ہو جائے۔ ملحدین و کفار کے خلاف اور مسائل حل ہو جائیں جس سے قلب کو اطمینان اور نفس کو سکون کی دولت حاصل ہو"[۲۳]

ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ آزاد اور افغانی کے تقابلی مطالعہ میں امام محمد عبدہ اور رشید رضا کا ذکر بے محل ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام محمد عبدہ اور رشید دونوں افغانی ہی کے مدرسۂ فکر کے ترجمان ہیں اور ان کی تصانیف درحقیقت افغانی ہی کے فکر کی توسیع ہیں خصوصاً تفسیر المنار اور خاص طور پر شیخ محمد عبدہ کی تفسیر۔ حق یہ ہے کہ جو مشن افغانی نے شروع کیا تھا، وہ امام محمد عبدہ اور ان کے بعد سید رشید رضا اور پھر ان کے بعد شیخ حسن البنا پر اپنے عروج کو پہنچا۔ سید جمال الدین افغانی نے خود بہت کم لکھا البتہ انہوں نے اپنے گرد لائق اشخاص جمع کر لیے اور ان کو تیار کیا جس طرح امام ابوحنیفہ نے کم لکھا، مگر ان کے شاگردوں نے ان کے طرز کو رواج دیا۔ امام ابویوسف، امام محمد شیبانی اور امام زفر نے ان کے مذہب کو آگے بڑھایا۔ عملی طور پر امام محمد شیبانی نے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اس لیے کہ امام ابویوسف کو قاضی القضاۃ بن جانے کے باعث لکھنے کے لیے زیادہ وقت نہ ملا۔ بالکل اسی طرح جمال الدین افغانی کی دعوتِ فکر کو محمد عبدہ اور سید رشید رضا نے عام کیا

اور عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح محمد عبدہ اور رشید رضا نے اپنی تفسیر نامکمل چھوڑ دی[۲۴] بالکل اسی طرح مولانا آزاد نے بھی اپنی تفسیر (ترجمان القرآن) نامکمل چھوڑی ہر چند کہ مصنف بعد کو بھی کافی مدت تک زندہ رہے، مگر ان کا سارا وقت حکومت اور سیاست کی نذر ہو گیا۔

مولانا آزاد کو مریدین اور شاگرد تو ملے، مگر ان میں سے کسی نے یہ جرأت نہ کی کہ وہ ترجمان القرآن کی تکمیل کر سکے۔ مولانا آزاد کے معنوی شاگردوں میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور شورش کاشمیری علمی دنیا میں شہرت کے مالک ہیں اور انہوں نے کام بھی کافی کیا ہے۔ لیکن ان حضرات کا انداز دعوتِ فکر اور دعوتِ دین کا نہ تھا۔ ایک تو مولانا آزاد خود دحیات تھے، دوسرے ان میں سے کسی کو علم دین تفسیر اور اسلوب بیان میں مولانا آزاد کی ترجمانی کی جرأت مشکل ہی سے ہو سکتی تھی۔

اس تقابلی مطالعے میں دراصل یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں نے فکر و نظر کی جو وادیاں طے کیں اور دعوتِ فکر کے لیے جو راہیں اختیار کیں اور جس طرح سے اپنے عہد اور اپنے ماحول کو متاثر کیا اور جیسے اپنے بلند نظریات سے ایک انقلاب پیدا کر دیا، اس کا منبع قرآن تھا، مگر ان کی دعوت میں مذہب و سیاست کا امتزاج تھا۔ مولانا آزاد اور افغانی دونوں نے مذہبی اور سیاسی زندگی گزاری۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سید جمال الدین کی جد و جہد اور اندازِ فکر کو اسلام کے سیاسی فکر سے تعبیر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

• ان کے مخصوص مزاج نے (جس میں ان کی ذہانت، غیر معمولی

اسلامی حمیت اور افغانی خودداری اور جوش کو بڑا دخل تھا) انہیں عالم اسلام کی سیاسی اور تنظیمی ترقی اور اس کی آزادی، خودداری اور وحدت و ہم آہنگی اور غیر ملکی اقتدار اور برطانوی حکومت کے خاتمہ کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ کی مہلت نہ دی اور ان کی ساری جد و جہد اور سرگرمیوں پر سیاسی رنگ غالب رہا۔ [۲۵]

بالکل یہی کیفیت مذہبی اور سیاسی اندازِ فکر چند بنیادی اختلافات کے ساتھ مولانا آزاد کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ مولانا زبردست انانیت پسند تھے جب کہ انانیت سید جمال الدین افغانی کے یہاں نظر نہیں آتی۔ مولانا ایک بڑے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ سید جمال الدین اگرچہ دل کش اسلوب اور اعلیٰ اندازِ بیان کے باوجود مولانا آزاد کی ادبی عظمت کو نہیں پہنچے پھر بھی وہ ایک طاقت ور اسلوب کے مالک ہیں۔ دونوں مذہب اور سیاست میں عظمت کے حامل ہیں۔ دونوں نے تکبیدِ دیں در دنیا کشادہ کا نعرہ لگایا۔ دونوں کے مدرسۂ فکر کے تفسیری نکات اور اندازِ فکر یکساں ہیں۔

مولانا آزاد اور سید جمال الدین دونوں بطلِ حریت ہیں۔ ان کے یہاں فکر و نظر کی روشنی نمایاں ہے۔ دونوں مفکر ہیں۔ دونوں نے اسلام کی شمع جلائی ہے۔ ایک نے "العروۃ الوثقیٰ" کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کو پکارا۔ دوسرے نے "الہلال" کے منبر سے للکارا۔ دونوں نے طاقت ور اسلوبِ تحریر اختیار کیا۔ دونوں کی جد و جہد کا محور انگریز دشمنی تھا۔ مگر مقصد آزادی، جمہوریت اور اسلام تھا۔ یہ دونوں عبقری عصر، تقلید جامد کے مخالف عبقری اور اجتہاد اور آزادیٔ رائے کے علمبردار تھے۔ دونوں نے مغلوب و مقہور قوموں کو خوابِ غفلت سے جگایا — اور استعماری طاقت سے نبرد آزما ہونے کا سبق سکھایا اور آزادی اور بیداری کا پیام دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے افکار و نظریات کے لیے تفسیر قرآن کو ذریعہ بنایا۔ مولانا آزاد نے خود تفسیر لکھی۔ سید جمال الدین نے اپنے شاگردوں کے ذریعے یہ پیغام عام کیا۔ اسلام اور سیاست کی راہ سے دونوں نے انسانیت کو آزادی اور سربلندی کا پیام عطا کیا اور یورپی استعمار پر ضرب کاری لگائی۔ عالمِ اسلام کی بیداری، اور آزادیٔ فکر و نظر میں ان دونوں نے روشن خیال اور صاحبِ پیام مفکرین کا غیر معمولی حصہ ہے۔ اور بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

مراجع

۱۔ تاریخ الادب العربی از احمد حسن زیات ص ۴۲۵ - ۴۲۱

۲۔ فیض الخاطر از احمد امین (قاہرہ) ج ص ۲۶۶ تا ۳۱۰

۳۔ جمال الدین افغانی، حیاتہ و فلسفتہ از ڈاکٹر محمد قاسم قاہرہ ص ۱۳۲

۴۔ عصر جدید کی اسلامی تحریکیں از احتشام احمد ندوی علی گڑھ ص ۱۶۲

۵۔ ایضاً ص ۱۶۵

۶۔ الہلال: ج ۱ شمارہ ۲۳) ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء ص ۱۱

۷ ایضاً

۸۔ ماہ نامہ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۷۳ء ص ۱۷۱

۹۔ ایضاً ص ۱۷۴

۱۰۔ قومی زبان کراچی۔ مقالہ ترجمان القرآن از ڈاکٹر ریاض الحسن ج۔ ۲۱، شمارہ ۴۵ ص ۱۰

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ترجمان القرآن ج دوم سورۂ توبہ آیت ۱۹

۱۳۔ قومی زبان کراچی، ج۔ ۲۱ شمارہ ۴۵ ص ۱۰

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ انقلاب پسند مولانا مقالہ از پروفیسر محمد حبیب ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۸۵ء

۱۶۔ اتجاہ التفسیر فی العصر الحدیث از مصطفیٰ احمدی طبری ص ۲۴۲

۱۷۔ اعلام و اصحاب الاقلام از انور الجندی ص ۱۵۲ تا ۱۵۶

۱۸۔ التفسیر والمفسرون از ڈاکٹر محمد حسین ذہبی ص ۲۴۵

۱۹۔ اتجاہ التفسیر فی العصر الحدیث ص ۲۴۳

۲۰۔ ایضاً " " " "

۲۱۔ اعلام از انور الجندی ص ۱۵۲

۲۲۔ ایضاً

۲۳ التفسیر والمفسرون ص ۲۴۵ - ۲۴۶

۲۴۔ تفسیر المنار شیخ محمد عبدہ نے شروع کی تھی پھر سید رشید رضا نے اس کو سورۂ یوسف تک لکھا۔ ان کے انتقال کے بعد ایک دوسرے عالم نے مکمل کیا۔

۲۵۔ مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش (طبع اول۔ لکھنؤ) ص ۱۰۹

مشیرالحق •

ترجمان القرآن : ایک تعارف

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب ترجمان القرآن لکھنے کا ارادہ کیا تو دوسروں کے پوچھنے سے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ مختلف زبانوں میں قرآن کے ترجمہ اور تفسیروں کی موجودگی میں کسی نئے ترجمے یا تفسیر کی کیا ضرورت ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ قرآن کی عام تعلیم و اشاعت کے بغیر مسلمانوں کی مذہبی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن فہمی کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کیا جائے کیوں کہ جب تک یہ مشکلات دور نہیں ہوتیں محض قرآن کا ترجمہ کر دینا یا کوئی نئی تفسیر لکھ دینا کچھ خاص سودمند نہیں ہے۔ قرآن فہمی مولانا کے خیال میں یہ نہیں ہے کہ جوں جوں ہمارے علم میں اضافہ ہوتا جائے اور نئی نئی سائنسی تحقیقات ہمارے سامنے آتی جائیں ہم ان تحقیقات کی تصدیق قرآنی آیات سے کرنے کی کوشش میں لگ جائیں۔ کیوں کہ اس طرح قرآن معما و چیستاں کی ایک کتاب بن کر رہ جائے گا اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ مستقبل کے ممکنہ انکشافات کو قرآن نے ایک ایسی چیستانی زبان میں بیان کر دیا تھا جسے اس کے اوّلین مخاطب سمجھنے سے قاصر تھے۔ مولانا آزاد کے مطابق قرآن کے نزول کا یہ مقصد ہی نہیں ہے بلکہ قرآن اس لیے نازل کیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کو ان کی متاعِ گم گشتہ کی تلاش پر ابھارے۔

انسان کی متاعِ گم گشتہ کیا ہے؟ مولانا کے خیال میں یہ متاعِ گم گشتہ خدا اور انسان کے باہمی تعلق کی صحیح بازیافت اور اس تعلق کو اپنانے اور اس کو مضبوط تر کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی نکتہ کو قرآن نے مختلف انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں تفصیل ہے کہیں ایجاز۔ کہیں ماضی کے واقعات کو مثالوں کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور کہیں سامنے کی چیزوں کو شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

"ترجمان القرآن مکمل شکل میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ اگرچہ مولانا کی تحریروں سے بظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پورے قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کو ایک سے زائد بار مکمل کیا، لیکن ہر بار مسودہ وقت کی سیاست کی نذر ہو گیا — برسہا برس تک انگریزی حکومت اور مولانا کے درمیان یہ آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ مولانا لکھتے رہے اور حکومت کے کارندے اسے عداوت یا لاعلمی کے باعث ضائع کرنے کا سبب بنتے رہے۔ بہر حال جیت ایک طرح سے حکومت کی ہوئی کہ ... ترجمان القرآن مکمل شکل میں ہمارے سامنے نہ آسکا۔ مولانا اپنی زندگی میں ترجمان القرآن کی صرف دو جلدیں شائع کر سکے۔ جلد اوّل میں سورۂ فاتحہ کی تفصیلی تفسیر کے ساتھ ساتھ قرآن کی چھٹی سورت (سورۃ الانعام) کا ترجمہ اور مختصر تشریح تھی۔ دوسری جلد ۲۳ ویں سورت (سورۃ المومنون) تک کے ترجمہ اور تفسیری نوٹ پر مبنی تھی۔ پروگرام کے مطابق بقیہ سورتیں تیسری جلد میں ہوتیں جو بدنصیبی سے شائع نہ ہو سکیں۔ مولانا کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات میں ۲۴ ویں سورت (سورۃ النور) کا تشریحی ترجمہ بھی مل گیا جسے ترجمان القرآن کے اس نئے ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا جو ساہتیہ اکاڈمی کے اہتمام سے ۱۹۶۴ء میں تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ مولانا کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے ایک عقیدت مند مرحوم غلام رسول مہر نے بقیہ پاروں کی ان آیات کی تشریح و ترجمہ کو جمع کر کے مرتب کیا جو مولانا کی مختلف تحریروں میں بکھری ہوئی تھیں اور انہیں ۱۹۶۲ء میں باقیاتِ ترجمان القرآن کے نام سے شائع کر دیا۔

سورۂ فاتحہ کو مولانا قرآن کا دیباچہ کہتے ہیں۔ ان کے بقول اس سورت کے مطالب پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے بقیہ حصوں میں اجمال اور تفصیل کا تعلق ہے۔ اگر ایک شخص قرآن سے اور کچھ نہ پڑھ سکے اور صرف اسی سورت کے مطالب کو ذہن نشین کر لے جب بھی وہ

• وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی سری نگر (کشمیر)

دینِ حق اور خدا پرستی کے ان بنیادی مقاصد سے واقف ہوسکیں گے جیسے پورے قرآن میں مجملاً اور تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ دینِ حق تک رسائی، مولانا کے خیال میں، اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے ذہن میں خدا کی صحیح صحیح صفات کا تصور موجود ہو اور ہم اس بات پر ایمان لے آئیں کہ انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ زندگی میں ایک تسلسل ہے اور ہم اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ جزا کا معاملہ ایک نہ ایک دن پیش آکر رہے گا اور اس دن اچھے کام کا اچھا اجر ملے گا اور برے کام کا برا۔

اس کے بعد آیئے سورۂ فاتحہ اور اس کے ترجمہ پر ایک نظر ڈالیں:

۱۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	ہر طرح کی ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے۔
۲۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	جو رحمت والا ہے، مہربان ہے۔
۳۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ	جو اس دن کا مالک ہے جس دن کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصے میں آئے گا۔
۴۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ	(خدایا) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تو ہی ہے جس سے مدد مانگتے ہیں۔
۵۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ	(خدایا) ہم پر سیدھی راہ کھول دے
۶۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ	وہ راہ جو ان لوگوں کی راہ ہوئی جن پر تو نے انعام کیا
۷۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ	ان کی نہیں جو پھٹکارے گئے اور نہ اُن کی جو راہ سے بھٹک گئے۔

گویا یہ سورۃ تین بنیادی باتوں کی طرف ہمیں دعوت دیتی ہے:

۱۔ خدا پر اس کی تمام صفات کے ساتھ ایمان۔
۲۔ اعمال کی جزا و سزا کا صحیح تصور
۳۔ صحیح راستے کی تلاش۔

دنیا کے مذاہب کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ گمراہی کی طرف انسان کا پہلا قدم اس وقت اٹھا جب وہ خدا کو اور اس کی صفات کو سمجھنے میں ناکام ہوا۔ اس نے جب بھی خدا کی ایک صفت کو اپنے حسبِ منشا پاکر اسے عین خدا تسلیم کیا تو پھر خدا جو تمام عالم کا خالق اور رب تھا، اس کے اپنے گروہ میں محدود ہو کر رہ گیا۔ اب صداقت اس کے حلقے کے باہر نہیں رہی۔ صرف وہی صحیح راہ پر تھا اور باقی تمام دنیا غلطی پر تھی اور غلطیوں کی اصلاح کے جوش میں ایک انسان نے دوسرے انسان کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مولانا آزاد خدا کو کسی خاص طبقے یا مذہب کی جاگیر نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا سب کا ہے۔ اور سب اس کے ہیں۔ اسی لیے اُس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اُسے رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی تمام جہانوں کا پالن ہار کہہ کر مخاطب کریں۔ اگر وہ سب کا پالن ہار ہے تو پھر نہ وہ مسلمانوں کی ملکیت ہے نہ ہندوؤں کی نہ عیسائیوں کی ملک ہے نہ یہودیوں کی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف اور قطعی لفظوں میں اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ وہ کسی نئی مذہبی گروہ بندی کی دعوت لے کر نہیں آیا ہے۔ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ تمام مذہبی گروہ بندیوں سے دنیا کو نجات دلا دے اور سب کو اس دینِ حق پر جمع کر دے جو سب کا مشترکہ دین ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں وحدتِ دین کا لفظ استعمال کرکے وحدتِ ادیان کے تصور کی ایک طرح سے نفی کی ہے۔ وحدتِ ادیان کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم پہلے یہ تسلیم کر لیں کہ دین بہت سارے ہیں اور اس کے بعد ان میں ایک نقطۂ اشتراک تلاش کریں۔ مولانا اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے اور ایک ہی رہے گا۔ اختلافات جو ہمیں نظر آتے ہیں، وہ دین کے نہیں بلکہ شریعتوں اور طریقوں کے ہیں۔ یعنی اختلاف اصل میں نہیں، فرع میں ہے۔ حقیقت میں نہیں، ظواہر میں ہے۔ روح میں نہیں، صورت میں ہے اور یہ اختلاف ضروری بھی تھا۔ مذہب کا بنیادی مقصد انسانوں کی سعادت و فلاح ہے، لیکن انسانی سماج کے احوال ہر عہد اور ہر ملک میں یکساں نہیں رہے ہیں اور نہ ہی وہ یکساں رہ سکتے تھے۔ پس جس مذہب کا ظہور جیسے زمانے میں اور جیسی استعداد و طبیعت کے لوگوں میں ہوا، اسی کے مطابق ان کے لیے شریعت بھی مقرر کی گئی۔ مولانا اس بات پر زور دیتے ہیں کہ چونکہ جس عہد اور جس ملک میں جو صورت اختیار کی گئی وہی موزوں ترین تھی، اس لیے ہر صورت اپنی جگہ بہتر اور حق ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شرع و منہاج بذاتہٖ دین نہیں بلکہ اصل دین تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شرعی قوانین پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا اس نتیجے پر پہنچے کہ "بلاشبہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا تھا لیکن اس لیے نہیں کہ تعزیر و عقوبت فی نفسہٖ کوئی مستحسن عمل ہے۔ بلکہ اس لیے کہ معیشتِ انسانی کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے یہ ایک ناگزیر علاج ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کم درجے کی برائی تھی جو اس لیے گوارا کر لی گئی کہ بڑے درجے کی برائیاں روکی جا سکیں۔ لیکن دنیا نے اُسے علاج کی جگہ ایک دل پسند مشغلہ بنا لیا۔"

مولانا کے بقول دین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک شخص نے عبادت کے وقت پچھم کی طرف منہ کر لیا یا پورب کی طرف۔ اصل دین تو یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ خدا پرستی اور نیک عملی کے لحاظ سے ایک انسان کا کیا حال ہے۔ لیکن جب لوگوں نے اصل دین سے رشتہ توڑ کر طریقوں اور راستوں کو اصل دین

بنالیا تو پھر خدا کی عبادت گاہیں تک بٹ گئیں۔ قرآن کی دوسری سورت کی ۱۱۴ویں آیت وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ.... کی تشریح کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ "مذہبی گروہ بندی کی گمراہی کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں۔ باوجودیکہ تمام پیروانِ مذاہب ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں، لیکن ممکن نہیں کہ ایک مذہب کا پیرو دوسرے مذہب کی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں جاکر خدا کا نام لے سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر گروہ اپنی عبادت گاہ کو خدا کی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ دوسرے گروہ کی عبادت گاہ اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ بسا اوقات وہ مذہب کے نام پر اُٹھتا ہے اور دوسروں کی عبادت گاہیں منہدم کر ڈالتا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان کا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ خدا کے بندوں کو خدا کی یاد سے روکا جائے اور صرف اس لیے روکا جائے کہ وہ ایک دوسرے مذہبی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا کوئی عبادت گاہ اس لیے ڈھا دی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے، دوسروں کی بنائی ہوئی ہے"۔

دنیا کا ایک دوسرا المیہ یہ بھی رہا ہے کہ اہلِ مذاہب نے اپنے ہادیوں اور رہبروں کے احترام میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ ایک طرف تو انہیں خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا اور دوسری طرف دوسروں کے رہنماؤں کے وجود کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں اس ذہنیت پر شدت سے اعتراض کیا ہے اور قرآن کی بنیاد پر اصرار کیا ہے کہ کوئی بھی شخص اصل دین تک پہنچ ہی نہیں سکتا، جب تک کہ وہ تمام رسولوں اور مذہبی رہنماؤں پر ایمان نہ لائے۔ اور انہیں یکساں احترام کے قابل نہ سمجھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خدا اور بندے کے بنیادی فرق کو ذہن میں رکھے اور رسولوں اور نبیوں کو انسانیت کی سطح سے اُٹھا کر خدائی کے درجہ تک نہ پہنچا دے۔

قرآن کی دعوت یہ ہے کہ تمام بانیانِ مذاہب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے۔ قرآن رسولوں کے درمیان امتیاز برتنے کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ مولانا آزاد کے خیال میں ہر راست باز انسان کا، جو خدا کی پیروی کرنا چاہتا ہے، فرض ہے کہ وہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام مذہبی پیشواؤں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ قرآن کہتا ہے کہ "خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے۔ لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے۔ پھر اگر تم کسی ایک پیغامبر کی تصدیق کرتے ہو اور دوسرے کا انکار کر دیتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو اور دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو۔ یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو اور اسی کو رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا ماننا نہیں ہے بلکہ ایک زیادہ بری قسم کا انکار ہے"۔

مولانا آزاد کو اس بات پر اصرار ہے کہ قرآن دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ کوئی نیا دین قبول کریں بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے مذاہب کی حقیقی تعلیم پر سچائی کے ساتھ کاربند ہو جائیں۔ اگر لوگوں نے ایسا کر لیا تو قرآن کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ کیوں کہ جوں ہی لوگ اپنے صحیح مذہب کی طرف لوٹیں گے، وہی حقیقت ان کے سامنے آ موجود ہو گی، جس کی طرف قرآن انہیں بلا رہا ہے۔ اسی باعث قرآن نے ان نیک انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے۔ اور جنہوں نے اپنے مذہب کی حقیقی روح کو ضائع نہیں کیا تھا۔ البتہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ غالب تعداد انہیں لوگوں کی ہے جنہوں نے دینِ الٰہی کی اعتقادی اور عملی حقیقت کو یک قلم ضائع کر دیا ہے۔

اُردو ترجمہ کی مثالیں:

ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو میانہ رو ہیں
لیکن بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں
بُرائی کرتے ہیں۔

"ترجمان القرآن" میں مولانا آزاد کے مخاطب صرف ان کے اپنے ہم مذہب ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے بلا امتیازِ مذہب و ملت سب کو مخاطب کیا تھا۔ لوگوں نے کس حد تک ان کے پیغام پر کان دھرا، یہ بالکل ہی دوسرا موضوع ہے بہرحال کسی نہ کسی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کا پیغام ایک محدود حلقے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ ترجمان القرآن کو ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ترجمان القرآن کی زبان اردو تھی، اگرچہ الہلال اور البلاغ کے مقابلے میں بہت آسان، لیکن بہرحال اردو، جس سے ہندوستان کی اکثریت نابلد تھی۔ دوسری طرف اردو خواں مسلمانوں میں سے بہتوں نے "ترجمان" کی دعوت کو شاید اس لیے قابلِ اعتنا نہ سمجھا کہ داعی ابوالکلام آزاد تھے جو ایک خاص سیاسی فکر رکھتے تھے، وہ سیاسی فکر جس سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس وقت تک اختلاف کرتی رہی، جب تک کہ حالات نے اس کی صداقت ان پر واضح نہ کر دی۔

●●

ریاض الرحمٰن شروانی

انّہا لتذکرۃ

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف میں تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر قدرِ اوّل کی تصانیف ہیں۔ تذکرہ کا موضوع دعوت و اصلاح ہے، ترجمان کا تفسیرِ قرآن اور غبارِ خاطر کا ادب و انشار۔ تذکرہ مولانا آزاد کی زورِ جوانی کی تصنیف ہے۔ ترجمان القرآن پختہ عمری اور غبارِ خاطر بڑھاپے کے آغاز کی۔ ان تینوں تصانیف کے اسلوب پر ایک طرف موضوع کے اختلاف اور دوسری طرف مصنف کی زندگی کے مختلف ادوار کی چھاپ بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ دعوت و اصلاح کا تقاضا ہے جوش و خروش، قوت اور بلند آہنگی اور جوانی بھی اسی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مذہبی موضوعات پر لکھنے کے لیے سنجیدگی، گہرائی اور بلندیٔ فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پختہ عمر کا داعیہ بھی یہی ہوتا ہے۔ ادب و انشا، رعنائی خیال، دھیمے لہجے اور وسعتِ مطالعہ کے خواہش مند ہوتے ہیں اور ساری عمر کا تجربہ انسان میں یہ اوصاف پوری طرح پیدا کر دیتا ہے۔ تاہم کوئی موضوع ہو اور عمر کی کوئی منزل، مصنف کی اپنی شخصیت ان پردوں کو ہٹا کر اپنا رخ زیبا برابر دکھاتی رہتی ہے اور یہی صورت حال ہمیں تذکرہ، ترجمان القرآن اور غبارِ خاطر میں نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد کی انفرادیت، ان کی انانیت، ان کی نظر کی بلندی اور فکر کی گہرائی کا عکس ان تینوں تصانیف پر پڑتا محسوس ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کی فکر کا بنیادی سرچشمہ تعلیماتِ اسلامی تھیں۔ اور انہوں نے قرآن کا مطالعہ ڈوب کر کیا تھا۔ اس لیے ان تینوں تصانیف میں ان تعلیمات اور اس مطالعے کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ خیر ترجمان القرآن تو خالص دینی موضوع سے متعلق ہے اور تذکرہ کا رشتہ بھی دین ہی سے جڑا ہوا ہے لیکن غبارِ خاطر جیسی ادبی تصنیف بھی اس سے مبرا نہیں ہے ـــــ غبارِ خاطر کے بعض خطوط میں وجودِ الٰہی کا اثبات اور دین کے احتیاج کا اقرار مولانا آزاد نے جس انداز میں کیا ہے وہ بہت سی دینی تصانیف پر بھاری ہے۔ قرآن کی مکی اور مدنی سورتوں میں اسلوب کا اختلاف جس موضوعاتی اور زمانی فرق کی نشان دہی کرتا ہے مولانا آزاد کی مختلف موضوعات اور مختلف زمانوں سے تعلق رکھنے والی تصانیف بھی اسی کا نمونہ ہیں۔ تاہم یہ سب تصانیف مولانا آزاد کی اپنی شخصیت کے دھاگے سے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزا نظر آتی ہیں۔ اس سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا آزاد کی بنیادی فکر از اوّل تا آخر ایک ہی رہی اور اس میں کہیں کوئی جھول کبھی پیدا نہیں ہوا۔ مولانا نے تذکرہ تیس سال کی عمر میں لکھا تھا اور غبارِ خاطر ۵۴، ۵۵ سال کی عمر میں اور جیسا کہ عرض کیا گیا، دونوں کا موضوع ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے، تاہم اگر ان دونوں کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کیا جائے تو ان میں نہ صرف فکر کی یکسانیت بلکہ رجحانِ طبع کی ہم آہنگی کا بڑا خوش گوار اور حیران کن تجربہ ہوتا ہے۔ عرفانِ ذات، حق و صداقت پر اصرار اور خدا پر اعتماد کے علاوہ شعروں کے انتخاب میں بھی یہ یکسانیت صاف دکھائی دیتی ہے۔

تذکرہ مولانا آزاد نے اپنے ایک دوست مرزا فضل الدین احمد کی فرمائش پر اپنی رانچی کی نظر بندی (۱۹۱۶ء–۲۰) کے دوران لکھا تھا۔ دراصل مرزا فضل الدین احمد ان سے خود ان کی اپنی زندگی کے حالات لکھوانا چاہتے تھے لیکن مولانا نے اس کا آغاز اپنے بزرگوں کے حالات سے کیا اور آخر میں خود اپنے حالات کی طرف بعض اشارے شاعرانہ انداز میں کرنے پر اکتفا کی۔

مولانا نے اپنے جن بزرگوں کے حالات قلم بند کیے وہ شیخ جمال الدین دہلوی، انکے بیٹے شیخ محمد، مولانا کے پردادا شاہ محمد افضل اور مولانا کے والد مولانا خیر الدین کے نانا مولانا منور الدین تھے۔ چونکہ کتاب بہت ضخیم ہو گئی تھی اسلئے مرزا فضل الدین احمد نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصہ، جو صرف شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات پر مشتمل تھا اور جسکے آخر میں خود

● حبیب منزل۔ میرس روڈ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مولانا آزاد کے حالات شامل کر دیئے گئے، شائع ہو گیا؛ دوسرے حصے کی اشاعت اس وقت ملتوی کر دی گئی اور پھر وہ حصہ کبھی شائع نہیں ہو سکا، افسوس ہے کہ یہ معاملہ مولانا کی اکثر تصانیف کے ساتھ پیش آیا اور دنیا انکے مطالعے سے محروم ہی رہی۔ خود تذکرہ میں مولانا نے اپنی متعدد تصانیف کی نشان دہی کی ہے جو کبھی شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکیں۔ مولانا نے اپنے لئے عزیمت عمل کی جو راہ منتخب کی تھی اس کو دیکھتے ہوئے ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ تذکرہ کا موضوع دعوت و اصلاح ہے اور یہ بھی عرض کیا ہے کہ وہ شیخ جمال الدین دہلوی کے حالات پر مشتمل ہے لیکن یہ باتیں جزوی طور ہی پر درست ہیں، ورنہ تذکرہ میں ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ مالک رام صاحب نے اسکے ساہتیہ اکادمی ایڈیشن کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے: "پوری کتاب کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو ان اکابر (جنکا ذکر کتاب میں آیا ہے) کا جانشین خیال کرتے ہیں" اور یہ بھی "خیال ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں"۔ مجھے تذکرہ پڑھتے ہوئے ایسا کوئی خدشہ محسوس نہیں ہوا اور میں اس بات کو اس طرح کہنا پسند کرونگا کہ تذکرہ دراصل اظہار ذات سے عبارت ہے اور جن اکابر کا ذکر اس میں انہوں نے کیا ہے وہ ایک رمز اور علامت کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ رمز ہیں حق و صداقت کے اور خود مولانا کی پوری زندگی حق و صداقت ہی کی عملی تفسیر ہے۔ انگریزی کی مثل ہے کہ آدمی کی پہچان اسکے ساتھیوں سے ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساتھیوں سے بھی زیادہ کسی آدمی کے ہیرو اسکی شناخت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد نے تذکرہ میں اپنے جن ہیروؤں کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے انکا مشترک وصف حق و صداقت ہے۔ شیخ جمال الدین دہلوی کے علاوہ جن اکابر کے حالات ضمناً تذکرہ میں ملتے ہیں ان میں نمایاں نام احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کے ہیں۔ ان سب سے مولانا کی عقیدت کا بنیادی سبب ان کا حق و صداقت پر اصرار اور اس کی خاطر کڑی سے کڑی آزمائش میں پورا اترنا ہے۔ اگر آپ خود مولانا کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو اسکا امتیازی وصف بھی آپ کو یہی نظر آئے گا کہ چاہے مذہب کا میدان ہو یا سیاست کا، علم کی دنیا ہو یا ادب کی، صحافت کی بساط ہو یا خطابت کی، مولانا نے حق و صداقت سے کبھی انحراف نہیں کیا اور اس کی خاطر ہر طرح کی کٹھنائیاں سہنے پر ہمیشہ آمادہ رہے۔ اسی طرح کے ایک اور بزرگ شیخ داؤد تھے، جنہیں سید محمد جون پوری سے عقیدت تھی اور جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی بنا پر شیخ داؤد کو مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں مولانا آزاد کی شخصیت کا ایک اور پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہ ہے افراط و تفریط سے انکار اور عدل و توازن پر ثبات۔ مولانا کا کہنا ہے کہ شیخ داؤد سید محمد جون پوری کی بزرگی کے قائل ضرور تھے لیکن مہدویہ عقائد کا بطلان کرتے تھے اور خود مولانا کا رویہ بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔ حق و صداقت کی مانند عدل و توازن بھی مولانا آزاد کے کردار کا ہمیشہ روشن پہلو رہا ہے اور اسکے مظاہر بھی ان کی زندگی کے ہر گوشے میں ملتے ہیں۔

جن لوگوں کے حالات تذکرہ میں مرقوم ہوئے وہ طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا آزاد نے ان کیلئے علماء حق کی اصطلاح استعمال کی ہے اور انکے مقابلے میں علماء سو یا علمائے دنیا دار کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ علماء حق کے مصائب اور پریشانیوں کا سبب اکثر علماء سو کی دنیاداری اور ہوس پرستی ہوتی تھی۔ گویا ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ حق پرستی کی خاطر فقر و فاقہ قید و حبس اور رنج و محن کی زندگی اختیار کئے ہوئے تھا اور دوسرے کی دنیاداری، اقتدار پسندی اور ہوس پرستی اسے شاہان وقت کی رضاجوئی پر اسطرح ابھارتی تھی کہ وہ خود اپنی ہی برادری کے بے نیاز و خود دار لوگوں کیلئے آفات و آلام کے اسباب مہیا کرتا تھا۔ اس اعتبار سے تذکرہ علماء کے دو گروہوں کی باہمی آویزش کی داستان بن جاتا ہے۔ یہ آویزش کسی خاص زمانے اور کسی خاص مقام تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر دور میں اور ہر جگہ مختلف عنوانوں سے دہرائی جاتی رہی ہے، اس آویزش میں خود مولانا آزاد کا مقام واضح اور نمایاں ہے۔ وہ علمائے حق کے اس سلسلۃ الذہب کی کڑی ہیں جس کی نقش آرائی انہوں نے تذکرہ میں شیخ جمال الدین دہلوی کو سر عنوان بنا کر کی ہے اور جن نقوش کو مزید تابانی احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، شیخ داؤد، شیخ نیاز مالک بن انس، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ جیسے اکابر کے تذکرے نے عطا کی ہے۔ شیخ علائی کے احوال اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کسی حق پرست کے قریب آنے پر کس طرح تمرد و شیخت کی زندگی عجز و شکستگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بشروع میں شیخ علائی شیخ نیازی کی راہ سے بالکل مختلف راہ پر گامزن تھے، لیکن جب ان سے مڈبھیڑ ہوئی تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئے اور اپنی زندگی کا طور و طریق بدل دیا۔

مولانا آزاد نے علمائے سو کی جن برائیوں کی نشان دہی کی ہے ان میں تقلید، بدعت، افراط و تفریط، تاویل باطل، غرور علم، عقائد و نسیان عمل، ترک امر بالمعروف، فتنۂ حیل و احتیال، قیاس غیر صالح، کلام بالرائے اور حب دنیا جیسی برائیوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور ان کی بھرپور مذمت کی ہے۔ اس بارے میں مولانا آزاد کا رویہ اتنا شدید ہے کہ وہ ایک دنیا پرست عالم کو ایک دنیادار و فاسق سے بھی برا سمجھتے ہیں کیونکہ ثانی الذکر کی برائی اپنے تک محدود رہتی ہے، جبکہ اول الذکر کی برائی بہت سے دوسر

لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کی برائی میں اسکا غرورِ نفس بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "ایک دنیادار فاسق اور ایک دنیا پرست عالم میں یہی فرق ہے کہ پہلا اپنی ہوا پرستیوں کو اعترافِ فسق کے ساتھ انجام دیتا ہے اور دوسرا دین داری اور احتسابِ شرعی کے ظاہری فریب سے۔

تابغایت ما ہنر پنداشتیم۔ عاشقی ہم ننگ دعارے بردہ است

نفس و شیطان کے فدرع و فریب کے کاروبار بہت وسیع ہیں۔ لوگوں نے ہمیشہ اس کو مے کدوں ہی میں ڈھونڈھا، مدرسوں اور خانقاہوں میں ڈھونڈھتے تو شاید جلد پتا لگ جاتا۔

یارب بازسیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ بود
بت خانہ کہ خانقہیش نام کردہ اند"

خود مولانا آزاد کی زندگی پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی زبان اپنے قلم اور اپنی ذاتی مثال سے اِن میں سے بیشتر برائیوں کے خلاف برابر مصروفِ جہاد رہے۔

علمائے سو کے مقابل علمائے حق کے جن اوصافِ حمیدہ کو مولانا آزاد نے اجاگر کیا ہے وہ توسط و اقتصاد، ثبات فی سبیل الحق، عزیمتِ دعوت مرتبۂ صدیقیت، پیروی طریقِ سنت، حکمتِ بالغہ، تجدید و احیائے ملت، طمع و خوف سے بے نیازی، جستجوئے حقیقت، وراثت کا طرۂ نبوت ہیں اور ان کیلئے مولانا نے مجموعی طور پر صراطِ مستقیم کی اصطلاح استعمال کی ہے انہوں نے دعوت اور عزیمتِ دعوت میں فرق اور عزیمتِ دعوت پر اصرار کیا ہے، اور اسکا سب سے اعلیٰ نمونہ امام حسین کو بتایا ہے۔ انکے نزدیک طریقِ سنت کی پیروی ساری روحانی بیماریوں کا بے خطا علاج ہے۔ تذکرہ کے مطالعے سے پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مولانا آزاد کی مثالی عقیدت و محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عشق عالمگیر جذبہ ہے لیکن اسکی بلندی محبوب کی شخصیت کی رفعت کے ساتھ وابستہ ہے۔ مولانا کی محبت کی آماجگاہ پیغمبر اسلامؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ عشق و محبت کے مظاہر مختلف ہوتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا مظہر محبوب کی مثال کی پیروی ہوتا ہے۔ مولانا نے پیغمبر اسلامؐ کی اسی پیروی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ وہ ختمِ نبوت کے دل سے قائل ہیں اور اسکے بغیر ایمان کو نامکمل قرار دیتے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کو قرآن کی عملی تفسیر سمجھتے ہیں، اور سیرتِ نبوی کو قرآن کی روشنی میں ترتیب دینے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ انکا کہنا ہے "صاحبِ قرآن کی سیرت و حیاتِ مقدس کے مطالعے سے بڑھ کر نوعِ انسانی کے تمام امراضِ قلوب و عللِ ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔۔۔۔ قرآن اور حیاتِ نبوی معناً ایک ہی ہیں؛ قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح، قرآن علم ہے اور سیرت اسکا عمل۔۔۔۔ دنیا والوں کی ہدایت کیلئے اگر کسی انسان کے آگے جھک سکتی ہے تو اس انسانیتِ کبریٰ و عبدیتِ اعلیٰ و بشریتِ واحدہ کے سوا اور کون انسان ہے جس پر آنکھوں سے دیکھنے والوں کی طرح ہمیشہ یقین کیا جاسکتا ہے اور جس پر ایمان لانے کیلئے پچھلی امتیں اور نسلیں بھی پہلوں کی طرح قطعی و یقینی روشنی رکھتی ہیں؟۔۔۔۔ دنیا میں جس قدر بھی ہدایت و تعلیم کی لوحیں تھیں سب کیلئے تغیر و تبدل ہوا حتیٰ کہ آج کوئی بھی محفوظ نہیں، لیکن الله اکبر مقامِ محمدی کی محفوظیت و معصومیت کہ اس کی سیرتِ طیبہ اور حیاتِ جیتہ و قائمہ کی لوحِ محفوظ کا ایک نقطہ بھی محو نہ ہو سکا۔۔۔ دائرۂ حقیقتِ محمدیہ سیر قدمی کی آخری حد ہے۔۔۔۔ روح و حیات کا آخری نقطہ و سرچشمہ" اس طویل اقتباس سے ایک اور نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ مولانا آزاد پیغمبر اسلامؐ سے والہانہ عقیدت کے باوجود حدِ اعتدال سے کہیں تجاوز نہیں کرتے ہیں اور آپ کی رفعتِ شان کی بنیاد آپ کی انسانیت عبدیت اور بشریت ہی کو مانتے ہیں اگرچہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ یہ انسانیت انسانیتِ کبریٰ، یہ عبدیت عبدیتِ اعلیٰ اور یہ بشریت بشریتِ واحدہ تھی۔ اس نکتے کی نافہمی نے کتنوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیا ہے۔ قرآن تفریق بین الرسل کی اجازت نہیں دیتا ہے، لیکن مولانا نے یہاں بھی یہ قابلِ قدر نکتہ بیان فرمایا ہے کہ "تفریق بین الرسل کو مسئلۂ تفضیل سے کوئی تعلق نہیں" وہ ایک طرف کہتے ہیں کہ "تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا وجود اصلاً ایک ہی اصل و حقیقت پر مبنی" ہے لیکن دوسری طرف اسکے بھی قائل ہیں کہ "اس سلسلے کی آخری کڑی یعنی وجودِ مقدس حضرت خاتم الادیان و مکمل شرائع و متمم النعم ساری پچھلی کڑیوں کا جامع" ہے، یعنی تفریق بین الرسل سے احتراز لیکن تفضیلِ خاتم الادیان پر اصرار۔

مولانا آزاد نسبی افتخار کے قائل نہیں تھے بلکہ جوہرِ ذاتی کو وجہِ عزّ و شرف گردانتے تھے۔ تاہم بزرگوں کی حق پرستی، صداقت شعاری، بے نیازی، خودداری اور خدمتِ علم پر ضرور فخر کرتے تھے اور ان اوصاف کو اپنے لیے لائقِ تقلید سمجھتے تھے۔ انہوں نے تذکرہ کے آغاز ہی میں اپنا یہ مسلک واضح کر دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے: "ایک لمحے کیلئے بھی طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ نسب فروشی کی دوکان آراستہ کرکے نقدِ عزّ و شرف کی جستجو کی جائے۔۔۔۔ انسان کیلئے معیارِ شرف جوہرِ ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے، نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کیلئے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں۔ اربابِ ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور اپنی عظمت و رفعت کی

تعمیر صرف اُسی سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔" دراصل مولانا کا اصرار علم سے بھی زیادہ عمل پر ہے اور ان کا ارشاد ہے کہ "عمل کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے"۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلامی تاریخ کے صدر اوّل سے حضرت بلال حبشیؓ، حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کی مثالیں دے کر اپنی بات واضح کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے عزّ و شرف کیلئے باپ دادا کی عظمتِ رفتہ کے محتاج بے علم اور بے عمل لوگ ہی ہوتے ہیں۔ مولانا آزاد جیسا عالم متبحر اور صاحب عزیمت عمل ان جھوٹے بتوں کی پرستش کا کیوں کر محتاج ہو سکتا تھا؟ دنیا نے دیکھا کہ جس تیس سال کے جوان نے لکھا تھا کہ "ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں"، جب وہ ستر سال کی عمر میں اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا تو اسکا علم و عمل کس طرح اسکے خاندان کی پہچان بن چکا تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، کتاب کے آخر میں مولانا آزاد نے اپنے شخصی احوال کی طرف بعض اشارے کیئے ہیں۔ انکا اندازِ بیان اگرچہ شاعرانہ ہے، تاہم مولانا کی نجی زندگی سے متعلق بعض مفید معلومات ان سے حاصل ہوتی ہیں گو قاری کی تشنگی رفع نہیں ہوتی ہے۔ غالباً مولانا اس کی تشنگی رفع کرنا چاہتے بھی نہیں ہیں بلکہ اس کی آتشِ شوق کو تیز تر کرنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت محسوس ہوتی ہے وہ مولانا کے عشقِ مجازی کی نشان دہی ہے، اگرچہ یہ نشان دہی محض کنایتہً کی گئی ہے۔ اس کی اہمیت اس نقطۂ نظر سے ہے کہ ابتدائے عمر کی ناکامیٔ عشق نے مولانا کی آئندہ زندگی کی تشکیل میں بہت اہم حصّہ لیا ہے۔ عشق میں ناکامی کا ردِّ عمل مختلف طبائع پر مختلف ہوتا ہے۔ کمتر درجے کے لوگ عشق میں ناکام ہو کر مایوسی، پژمردگی اور بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسکے برعکس بلند پایہ طبائع میں یہ ناکامی خوب سے خوب تر کی جستجو کا جذبہ اور غمِ دوراں کے درماں کی تلاش کا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ مولانا آزاد کی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی شک و شبہے سے بالاتر ہے اور اسی لیئے ان کی ناکامیٔ عشق نے انھیں مایوسی اور بے عملی کی تاریکی میں کھو جانے کے بجائے جادۂ عمل پر گامزن ہونے اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا تلاش کرنے پر آمادہ کیا۔

ان اوراق کے مطالعے سے مولانا آزاد کے ذہنی سفر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تیس سال کی نسبتاً مختصر عمر میں مولانا اس سفر کی کتنی مسافت سے گزر چکے تھے، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے اپنی بدعقیدگی اور بدعملی کی ت حیات دجو بہت مختصر تھی، کی نقاب کشائی میں بھی اپنی فطری صداقت ری کی بنا پر تامل نہیں کیا ہے۔ لکھتے ہیں "گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو۔" مولانا کی فطرتِ سلیم انھیں ان تاریک راہوں سے جلدی ہی دور نکال لائی، خود مولانا نے راہِ صواب کی بازیافت کا سہرا عشقِ مجازی کے سر باندھا ہے۔ کہتے ہیں "ناگہاں جذبۂ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجازی میں نمودار ہوئی اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے تو دبخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہونچا دیا۔ بلاشبہہ یہ لغزش تھی لیکن اس لغزش کو کیا کہو گے جو محبوبِ قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہونچنا ہے۔ اگر لغزش وسیلہ ہی رہنما بن جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں ہشیاریاں اس پر نچھاور" مولانا نے وارداتِ محبت و عشق کے بہت سے رازہائے سربستہ ان صفحات میں آشکار کیئے ہیں۔ وہ عشق کی ہمہ گیری و جہاں بانی کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے اوّل و آخر جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اسکے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے تو اسی کے دم سے جبقدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن ہے اسکے سوا کچھ نہیں"۔ پھر وہ انجام کار وحدتِ عشق کے قائل ہیں، کثرت کے نہیں۔ کثرت کو لوگوں کی کم نگاہی کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے: "یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہِ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کتنے ہی پردے ہیں جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقتِ یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں"

یہ عشق کی اعلیٰ ترین منزل ہے لیکن یہاں تک پہنچنے میں راہی کو بہت سی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے، اور مولانا بھی گذرے۔ وہ ان منزلوں کی نشان دہی اپنے مخصوص پیرایۂ اظہار میں کرتے ہیں۔ "ہر قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد ہی میں سے ہو کر نکلتی ہے یعنی ایک سے ملنے کے لیے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جڑنے کیلئے سب سے کٹنا۔ اس دروازے کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں جو پہلے کھول لیئے گئے تھے"۔ حقیقتِ اعلیٰ ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور اس تک پہنچنا مقصودِ حقیقی۔ اس مقصودِ حقیقی تک پہنچنے کے راستے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مولانا آزاد کے نزدیک سب سے یقینی راستہ جذب و عشق کی وادی سے ہو کر نکلتا ہے "اسی لیئے انکے بقول" عرفائے طریقت نے کہا: عشق کی بُری سے بُری گرفتاری بھی بے دردی و بے سوزی کی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے اور اس راہ کی ناکامی بھی کامرانی و فیروزمندی نہیں"۔ خود مولانا منزلِ مقصود سے ہمکنار اسی راہ پر چل کر ہوئے اور راستے میں انھیں بہت سے تجربات سے آشنا ہونا پڑا۔ مولانا راہ میں رک بیٹھنے کو راہی کی سب سے بڑی محرومی اور ضلالت بتلاتے رہے ہیں اور کہتے

ہوئے قدم منزل پر پہنچ کر ہی رُکنے چاہئیں ورنہ ساری جد و جہد بےکار ہو جاتی ہے۔ دیکھئے اس بات کو کس طرح کہتے ہیں: "سفر کی کامیابی نہ تو منزلوں پر موقوف ہے، نہ مختلف راہوں پر۔ راہ کوئی ہو قدم میں حرکت اور ہمت میں اقدام ہو تو کبھی نہ کبھی منزل مقصود تک پہنچ ہی جاؤ گے ۔۔۔۔ ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے، کوئی درمیانی منزل ہو، اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے تو پھر وہی منزل بت ہے اور وہ ر دا سکا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو، من شغلك عن الله فهو صنمك۔ کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے ۔۔۔۔ اور نامرادی یہیں ہے کہ اٹکنے اور رہ جانے میں۔" راہ عشق کے "رسم و آئین" میں سے رہ رو کو "یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش" اختیار کرنی پڑتی ہے "یا شمع کی خاموشی و سوزش" مولانا نے "تجربہ کارانِ طریق" کے حوالے سے دوسری راہ کو پہلے سے "کہیں زیادہ نازک اور کٹھن" بتایا ہے کیونکہ "اس میں بے قیدی و بے وضعی کی آزادی ہے، اِس میں ضبط و احتیاط کی پابندی ۔۔۔۔۔ اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔" مولانا کی مشکل جو اور دشوار پسند طبیعت نے عرفائے طریق کی پیروی میں دوسرا مسلک اپنے لئے چنا اور اس سے سرفراز نکلے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آخر عمر میں مولانا بھڑکتے ہوئے شعلوں سے زیادہ سلگتا ہوا تنور بن کر رہ گئے تھے۔

مولانا آزاد ہر معاملے میں "نقص و ناتمامی" سے گریزاں اور "کمال و اتمام کار" کے جویا رہے۔ یہ ان کا زندگی بھر کا شعار تھا اور اس سے مذہب سیاست، ادب، صحافت، حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ مبرا نہیں تھا۔ مولانا کی اِس روش کا سراغ بھی ان کی زندگی کی اِس ابتدائی واردات میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں: "جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روشِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں اور جس رنگ میں رہے کبھی دوسروں کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کیلئے اپنا نقشِ قدم رہ نما چھوڑا۔ رندی و ہوس ناکی کا عالم رہا تو اسکو بھی ناتمام نہ چھوڑا۔ عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم ناآشنا نہ رہے ۔۔۔ اب جس حال و رنگ میں ہیں تو یہاں بھی کمال ہی کی آرزو ہے اور اتمام کار کیلئے بے قراری۔" مولانا آزاد کی یہ آزادی پسندی و آزادہ روی ان کی زندگی کی بہت سی دشواریوں اور مشکلات کا سبب بنی لیکن اسی میں انکی یکتائی اور عظمت کا راز پنہاں ہے۔

بقیہ: مولانا آزاد پر منتخب مضامین کی وضاحتی فہرست

مولانا آزاد سے میری ملاقاتیں ــــ جامعہ، ۸۵ (۲)، فروری ۱۹۸۸ء

۱۵ــ ۱۷،

لوئی میسیوں ایک فرانسیسی مستشرق تھے اور تصوف کے بلند پایہ استاد تھے۔ اس مضمون میں انھوں نے مولانا سے اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے اور مولانا کی شخصیت کے پہلو اجاگر کیے ہیں۔

۴۴۔ مظہر حسن

مولانا ابوالکلام آزاد ــــ آواز، ۴۷ (۲۲)، ۱۶ نومبر ۸۶ء: ۱۱

مولانا آزاد کی ملی اتحاد کے لیے کوششوں کا ذکر ہے۔ مصنف نے مولانا کی زندگی کے اہم مقاصد بیان کیے ہیں نیز ان کے تعلیمی فلسفہ پر بھی نظر ڈالی ہے۔

۴۵۔ معین شاکر

غبارِ خاطر میں مولانا آزاد کی شخصیت ــ آواز، ۴۸ (۱۲)، ۱۶ جون ۸۳ء: ۱۱ــ۱۳

مولانا کی مشہور تصنیف "غبارِ خاطر" کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۴۶۔ مہر (غلام رسول)

مولانا ابوالکلام آزاد: مہر کے خطوط شیروانی کے نام ــــ جامعہ ۸۵ (۲) فروری ۸۸ء: ۲۳ ــ ۲۴،

ان خطوط پر مشتمل ہے جو غلام رسول مہر نے ریاض الرحمٰن شیروانی کو لکھے اور جن میں کسی نہ کسی طور سے مولانا آزاد کا ذکر آیا ہے۔

۴۷۔ ناصر الدین مسعود

مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری ــــ قومی آواز، ۸ (۱۰۶)، ۱۷ اپریل ۱۹۸۸ء: ۱۲،

یہ مولانا کے سکریٹری ناصر الدین مسعود صاحب کا وہ انٹرویو ہے جو آزاد صدی کی تقریبات پر ڈاکومنٹری بنانے کے لیے لیا گیا۔

۴۸۔ نشید (دیپتی)

مولانا آزاد کا مطالعہ کلمات الشعراء ــــ ہماری دنیا، ۲۵ (۳) یکم اپریل ۸۶ء: ۷

مولانا کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا کے بے مثال حافظہ کا ذکر "کلمات الشعراء" کے حوالے سے کیا ہے۔

عبداللہ ولی بخش قادری



مولانا آزاد: قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کے پیش رو مفکر

ہماری جد و جہد آزادی کے سرکردہ مجاہدین میں مولانا آزاد کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں آزاد ہندوستان کے ایک جلیل القدر معمار کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اور وہ اس کے پہلے وزیر تعلیم بنے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء) تعلیمی نظام کی راہیں استوار کرنے اور اسے قومی رنگ و آہنگ عطا کرنے میں صرف کیے۔ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں بہ یک وقت مذہبی رہنما، سیاست داں، مصنف، خطیب، عالم، صحافی اور مفکر گردانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز دانشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ مقلد قطعی نہیں تھے، لیکن روایات کا واجب احترام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے تہذیبی ورثے سے جدا نہیں کیا، لیکن نئے خیالات اور نئی طرزِ نظر کی طرف متوجہ بھی ہوتے رہے۔ وہ اپنے آپ سے مخلص تھے اور اپنا نقطۂ نظر رکھتے تھے انہیں نہ خوشنودی درکار تھی اور نہ سستی شہرت۔ وہ اعلانِ حق کے قائل تھے خواہ حکومت خفا ہو یا اکثریت۔ مگر وہ ایک کشادہ ذہن اور وسیع القلب انسان تھے۔ ان کے یہاں نہ تنگ نظری پائی جاتی ہے اور نہ مجنونانہ عقیدت۔ وہ حب وطن سے سرشار ہونے کے باوجود وطنیت کے حصار میں محدود رہنے پر خود کو رضامند نہ کر سکے اور پوری انسانی میراث سے فیضان حاصل کرنے کے ہمیشہ خواہاں رہے بالخصوص اسلامی فکر و تمدن سے۔ دراصل وہ مسلکِ انسانیت کے پیرو تھے — اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے تصورات میں آفاقی معتقدات جھلکتے ہیں۔ انہوں نے تعلیم کو قومی حالات و روایات کے تناظر میں دیکھا اور ملک کے مفادات و مقصودات کے تحت اس کی اہمیت اور اس کے عصری تقاضوں کو سمجھا۔ وہ تعلیم کے اندر گیرائی اور گہرائی دونوں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے عہدِ وزارت میں تعلیمی منصوبہ بندی کا آغاز ہوا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ وہ تعلیم کا ایک جامع اور ارفع تصور رکھتے تھے۔ اُن کی رہنمائی اور دلچسپی کی بنا پر اعلیٰ تعلیم میں سائنسی اور تہذیبی ترقی کی طرف رجوع کیا گیا۔ کونسل برائے سائنسی و صنعتی تحقیق (کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ) کے زیر اہتمام بہت سی قومی تجربہ گاہیں (نیشنل لیبارٹریز) قائم کی گئیں۔ نیز سائنس اور سائنسی تحقیق کو خصوصی طور پر فروغ حاصل ہوا۔ وہ کسی نظامِ تعلیم کو فنونِ لطیفہ کے بغیر مکمل ماننے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے فنونِ لطیفہ کی کل ہند کانفرنس (منعقدہ: ۱۹ اگست ۱۹۴۹ء) میں خطبۂ افتتاحیہ پڑھتے ہوئے فرمایا تھا کہ ایک سماج کی صحت مندی اور اعتدال پسندی کا اظہار اس کے افراد میں ذوقِ لطیف کی ترویج سے ہوا کرتا ہے۔ وہ شخصیت کی تعمیر میں مصوری، موسیقی، رقاصی، سنگ تراشی، ڈراما، غرض کہ سب ہی فنونِ لطیفہ کو اہم خیال کرتے تھے انہوں نے متعدد موقعوں پر اپنے تعلیمی خطبات میں اس بات کا اعادہ کیا ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ کے شیدائی تھے اور شعر و نغمہ کا تو شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کے اس احترام و اشتیاقِ ادب و فن کی ایک درخشاں مثال "ساہتیہ اکادمی" "للت کلا اکادمی" اور "سنگیت ناٹک اکادمی" کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

ایک وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کی اصلی اہمیت اُن احکامات اور اقدامات پر مبنی نہیں ہے جو اُن کے وزارتِ تعلیم کی مسند پر فائز ہونے کے دوران سرزد ہوئے، جن کی بنا پر تعلیم کی تنظیم نو اور توسیع وجود میں آئی۔ اس دوربینی اور بالغ نظری کی بنا پر ہے جس سے انہوں نے

● 44-A ، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی ترجمانی کی ہے اور جس پس منظر میں انہوں نے قومی تعلیم کی آبیاری کی۔ انہوں نے قدیم و جدید افکار کا خوشگوار امتزاج پیدا کرنے کی سعی اُس وقت کی جب کہ انتہا پسندی اور بے اعتمادی کی شورش اپنے عروج پر تھی۔ ایک طرف انہوں نے سائنسی نقطۂ نظر اور منطقی زاویۂ نگاہ سے عصری مسائل کا جائزہ لیا اور دوسری طرف اُن اقدارِ عالیہ کو عزیز رکھا جو کہ ہندوستانی اور اسلامی ورثے سے انہیں نصیب ہوئی تھیں۔ ان کا اصل عطیہ وہی متوازن مطمحِ نظر اور غیر متشدد و بے تعصب یعنی 'لبرل' قیادت ہے۔ جو اُن کے فکر و عمل سے ہمیں نصیب ہوئی۔

مولانا آزاد نے اسلامی فکر اور مشرق و مغرب کے فلسفے سے اپنا فلسفۂ حیات اختیار کیا تھا، جس سے اُن کی اخلاقی اقدار کا تعین ہوتا ہے۔ یوں تو انہوں نے اپنے ضابطۂ اخلاق کے بارے میں جابجا اظہار کیا ہے لیکن 'مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور فلسفۂ تعلیم کے عنوان پر یونسکو' کی طرف سے ۱۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو دہلی میں منعقد ہونے والے سیمینار کے افتتاحی خطبے میں اُن کے تاثرات بخوبی یکجا بیان ہوئے ہیں۔ وہ 'رواداری' کی تعلیم و ترغیب پر زور دیتے ہیں اور اسے مذہب کی ایک بنیادی قدر گردانتے ہیں۔ اُن کا اصرار ہے کہ مذہب کا مقصد آپس کا نفاق نہیں، اتفاق ہے۔ وہ فصل نہیں وصل کی تعلیم دیتا ہے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ ہمارے دل میں تمام مذاہب کا احترام ہونا چاہیے اور ہمیں انسان کی عظمت کا پاس رہنا چاہیے۔ انہوں نے 'رواداری' کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے بدی اور بد کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی طرف دھیان دلایا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ برائی کو دُور کیا جائے، لیکن برائی کرنے والے سے بَیر نہ ہو۔ جیسے مرض کا علاج کیا جاتا ہے اور مریض سے ہمدردی۔ اُن کے نزدیک اُستاد کا منصب یہی ہے کہ وہ شاگردوں کی زندگی سے برائیوں کو دور کرے، لیکن انہیں عزیز بھی رکھے۔ اس رویّے کو وہ عین مذہبی فعل مانتے ہیں اور ایک اچھے انسان یا مردِ مومن کا تصور بھی کچھ ایسا ہی رکھتے ہیں۔

مولانا آزاد کو اپنی منصبی حیثیت سے مذہبی تعلیم کی نوعیت اور اہمیت پر بھی غور کرنا پڑا تھا اور ایک عالمِ دین کا مرتبہ رکھنے کے باوجود انہوں نے سرکاری مدارس کے نصاب میں 'مذہبی تعلیم' کو داخل ہونے سے باز رکھا۔ کیوں کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک سیکولر ریاست میں جہاں رنگارنگ اور مخلوط سماج ہو، نہ یہ مناسب ہے اور نہ ممکن کہ کسی قسم کی فرقہ وارانہ مذہبی تعلیم کو روا رکھا جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں نہایت محتاط رویّہ اختیار کرنے کی ہدایت کی تاکہ بے جا مذہبیت کا زور نہ بڑھ جائے۔ اگرچہ وہ زندگی اور تعلیم دونوں میں مذہبی اقدار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ قومی تعلیم میں اخلاقی اقدار کی آبیاری چاہتے تھے اور سیرت سازی کے لیے انہیں ضروری خیال کرتے تھے۔

انہوں نے وشوا بھارتی کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیے جانے کے موقع پر اپنے ان خیالات کا واضح طور پر اظہار کیا ہے اور ٹیگور کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بین الاقوامی مفاہمت اور مسلکِ انسانیت کی پُرزور تائید کی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دے اور تمام ادیان عالم کی آگاہی و احترام سکھلائے۔ انہیں تعلیم کا جوہر 'قومی ذہن کی تشکیل' نظر آتا ہے، جو اپنی روایات کا حامل، اپنے ورثے کا امین، عصری حسیت کا مالک اور عہدِ نو کا نقیب ہو۔

اقدارِ عالیہ کی پرستاری، حبِ وطن سے سرشاری اور مسلکِ انسانیت کی پیروی ہی مولانا آزاد کے فلسفۂ تعلیم کے نمایاں عناصر ہیں لیکن ان کی وفات کے بعد وہ تہی داماں آ گئے اور ہماری تعلیم گاہیں ان صالح اثرات سے یکسر محروم ہوتی چلی گئیں۔

قومی نظامِ تعلیم کی تشکیل کو مکمل کرنے اور مستحکم بنانے کے لیے دورِ آزادی کی داغ بیل پر ملک کی تعلیمی پالیسی کو ۱۹۶۸ء میں مرتب کیا گیا، لیکن اس کے لیے نہ خاطر خواہ وسائل مہیا ہوئے اور نہ اسے عملی شکل دینے کے لیے پورے انہماک کے ساتھ اقدامات ہی کیے گئے۔ اس کیفیت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ نظامِ تعلیم اُن توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا، جنہیں قوم نے بجا طور پر اس سے وابستہ کر رکھا تھا۔ مادی اور خارجی ترقی کی سست رفتاری کے ماسوا، سماجی انحطاط اور اخلاقی پستی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر جنوری ۱۹۸۵ء میں ایک نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ یہ دستاویز 'تعلیم کی چنوتی ـــــ ایک حکمتِ عملی تناظر' کے نام سے پیش ہوئی۔ اس میں تقریباً چالیس سال کی تعلیمی پیش رفت کا ایک دیانت دارانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے جو کہ ایک حقیقت پسندانہ پالیسی مرتب کرنے کے لیے 'پس منظر' کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے 'اعترافِ عجز' یا 'اقبالِ جرم' سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ آزاد ہندوستان میں تعلیم کی کمیت و کیفیت کی رفتارِ ترقی کے اس بیان میں اپنی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس احتساب کے بعد اُس حکمتِ عملی پر روشنی ڈالی گئی ہے جو کہ نئی تعلیمی پالیسی کو متعین کرنے کا باعث ہوئی۔ یہ حق گوئی و بے باکی بلاشبہ ملک کی قیادت کی بالغ نظری کی دلیل ہے اور اس سے تعلیم کے خوش آئند مستقبل کی بشارت بھی ملتی ہے۔ مگر یہ نوبت آئی ہی کیوں؟ اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہی ہے کہ ہم قومی تعلیم کے اس تخیل سے غافل ہو گئے جو آزاد ہندوستان کی تعلیم کے معمارِ اول نے ہمیں دیا تھا۔ اُن کی سرکردگی میں جو تعلیمی ڈھانچہ تیار ہوا تھا، اس کی صورت گری نہ ہو سکی۔

کیوں کہ ان کے بعد مرکزی وزارتِ تعلیم کی سربراہی کے لیے اُن جیسا بلند قامت قومی رہنما اور دیدہ ور عالم میسّر نہ ہوا۔

مذکورہ بالا اعلان کے مطابق قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء ملک کے سامنے پیش ہوئی۔ اس میں 'قومی تعلیمی نظام' کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے موثر اقدامات کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس نظام سے مراد ہے کہ "ایک مقررہ سطح تک بلالحاظ ذات، مذہب، مقام اور جنس تمام طلبا کو ہم رتبہ نوعیت کی تعلیم تک رسائی ہو۔" اس کا ۱۰+۲+۳ سال کا تعلیمی ڈھانچہ ملک کے تمام حصول کے لیے ہے۔ جس کے پہلے دس برسوں کی مزید تقسیم اس طور کی گئی ہے کہ پانچ سالہ ابتدائی تعلیم اور تین سالہ ثانوی ابتدائی تعلیم پورے طور پر اعتبار سے عام لازمی اور مفت تعلیم کے آٹھ سال پورے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دو سال ہائی اسکول کی تعلیم کے ہیں۔ ان دس برس کے بعد دو سال کی مدت اعلیٰ ثانوی تعلیم کی ہے اور سہ تین سالہ 'ڈگری نصاب' ترتیب ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ پہلے دس سال کا نصاب ایک مشترک مرکزی جزو بھی رکھتا ہے جو کہ "ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ، آئینی فرائض اور دیگر ایسے مواد پر مشتمل ہوگا جو قومی شناخت کو پروان چڑھانے کے لیے لازمی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مساوات کو بھی فروغ دیا جائے گا۔" اور "ضروری ہوگا کہ سبھی کو نہ صرف رسائی کے اعتبار سے بلکہ کامیابی کے شرائط کے اعتبار سے بھی مساوی موقع فراہم کیا جائے۔" صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ مساوات اور سماجی انصاف کو مدِنظر رکھتے ہوئے خواتین، درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل، اقلیتوں، معذور افراد، بالغان اور تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ دیگر طبقوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

یہ تمام کوششیں سماجی انصاف کی فضا کو تقویت بہم پہنچانے کے علاوہ ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے اور قومی یک جہتی کو بڑھانے کا بھی نہایت کارگر وسیلہ ثابت ہوں گی۔ ایسی ہی مصالح کے باعث ایک قومی ذہن کی تشکیل کا خواب مولانا آزاد نے بھی دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریر (ص ۲۰۸) میں صاف طور پر کہا تھا کہ ہماری قومی تعلیم کی تشکیلِ نو میں ہمارا مقصد تمام لوگوں میں 'اتحاد فکر' ہے جو اپنے اندر تاریخی، لسانی، تہذیبی اور دیگر اختلافات کو سموئے اور کثرت میں وحدت کی جلوہ نمائی کرے۔ اُن کا زور ایک 'نئے ذہن' کی تعمیر پر تھا۔ وہ مستقبل کے ہندوستان میں فکرِ بلند، جرأتِ کردار اور خلوصِ کار رکھنے والے انسان چاہتے تھے۔ وہ پورے طور پر "قومی تشخص" کے حامی اور علمبردار تھے۔ اس نئی پالیسی میں استاد کی حیثیت اور اہلیت دونوں کی طرف خاطر خواہ توجہ کی گئی ہے تاکہ وہ جلد سماج میں اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کر سکے کیونکہ کوئی بھی معاشرہ اپنے اساتذہ کے مقام سے بالاتر نہیں ہو سکتا اور اُن کے مرتبے سے ہی کسی ملک کے مستقبل کی ضمانت ملتی ہے۔ اس پالیسی میں اساتذہ کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے پوری سعی کی گئی ہے اور ان کی علمی استعداد میں اضافے کے لیے بیشتر ممکن تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ استادوں کی ملازمت سے قبل اور دورانِ ملازمت تربیت کا ایک جامع پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ اداراتی منصوبہ بندی سے لے کر قومی تعلیمی منصوبہ بندی تک ہر جگہ اُن کی نمائندگی کو ضروری تسلیم کیا گیا ہے۔ نیز داخلہ، نصاب، امتحان جیسے امور طے کرنے میں اُن کی شرکت لازم قرار دی گئی ہے۔ ان تمام تجاویز کی غرض و غایت بھی تعلیمی نظام کو موثر بنانا ہے۔ مولانا آزاد اپنے عہدِ وزارت میں اس طرف بھی رجوع ہوئے تھے۔ اور اساتذہ کی سربلندی کے لیے اُن کا دستِ تعاون سب سے پہلے اُٹھا تھا۔ جب کہ تعلیم اور تعلیمی کارکن دونوں کی طرف سے ایک عام بے حسی اور بے رخی کا دور جاری تھا۔ انہوں نے اپنی متعدد تقاریر میں اور بڑے بڑے اہم مواقع پر قوم کی تعلیم کی طرف سے غفلت شعاری کا شکوہ کیا ہے اور اپنی بے اطمینانی کا اظہار فرمایا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں خلاقیت، تحقیق اور تکمیلیت پر بہت کچھ زور دیا گیا ہے۔ کیوں کہ تعلیم کے وقار اور فروغ کے لیے طالبانِ علم کو ان صفات کا اہل ہونا ضروری ہے اور یہی وہ صفات ہیں جو ایک معلم اپنے اندر اور اپنے طالب علموں کے اندر پروان چڑھانے سے حقیقی معنوں میں اپنی منصبی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ مولانا آزاد ان اوصاف کے پرستار، خواستگار اور مظہر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تعلیم کے عام فروغ اور خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اپنے آغازِ کار سے ہی مصر نظر آتے ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کا طرۂ امتیاز اقدار رخ تعلیم کو گردانا جا سکتا ہے۔ 'تعلیم کی چنوتی' میں معاشرے کے اندر اقدار کی بڑھتی ہوئی ناقدری کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا جا چکا تھا اور تاریک خیالی، تعصب، تشدد، استحصال، ضعیف الاعتقادی اور تقدیر پرستی جیسے منفی رجحانات سے نوخیز ذہنوں کو پاک رکھنے کی ذمہ داری تعلیم پر ڈالی گئی تھی نیز ان کے بجائے سیکولرازم، سوشلزم، جمہوریت، سائنسی مزاج، قومی یک جہتی، حب الوطنی اور بین الاقوامی مفاہمت جیسے دستوری مقاصد کے حصول کو پیشِ نظر رکھنے کی تاکید بھی ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس پالیسی میں واضح کر دیا گیا کہ اقدارِ عالیہ کے علاوہ سماجی اور تہذیبی اقدار کو بھی پورے طور پر دل کے اندر اتارا جائے اور سماج میں اقدار کے فروغ سے ہی تعلیمی عمل کی کامیابی کا اندازہ لگایا جائے گا۔

مولانا آزاد کی قیادت میں جس طور ہمارے نظامِ تعلیم کا خاکہ تیار ہوا

اور اس کے خطوط ابھرنا شروع ہوئے، وہ روش غالباً کوئی بھی اختیار کرتا جسے اس سلسلے میں شرفِ اوّلیت حاصل ہوتا۔ لیکن تعلیم کی اقدار اور اس کے جمالیاتی پہلو کی طرف مولانا متوجہ ہوئے، وہ ان کی شخصیت اور انفرادیت کا ہی فیض گردانا جاسکتا ہے۔ وہ حقیقی معنی میں ایک مذہبی انسان تھے۔ اور اقدارِ عالیہ کے علمبردار۔ اس ضمن میں ان کے یونسکو سیمینار کے خطبۂ صدارت کا ذکر آچکا ہے۔ ان کی ایک اور معرکہ آرا تقریر (ص۱۵۱) بھی یاد آتی ہے، جس میں انہوں نے ملک کے مورخوں کو کشادگیٔ فکر و نظر کی دعوت دیتے ہوئے معروضی رویّہ اختیار کرنے، تیز علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصب سے باز رہنے کی ترغیب دی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ تاریخ اپنی تہذیب اور تمدن کی داستان ہوتی جا رہی ہے۔ جس میں اس کا فلسفہ، مذہب، اور انسان دوستی کا پیغام جھلکتا ہو۔ اس تعلیمی پالیسی میں تاریخ کی تصنیف و تدریس کے سلسلے میں مولانا آزاد کے افکار کی بازگشت پورے آہنگ کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ مولانا آزاد نہایت پختہ ذوقِ جمال بھی رکھتے تھے۔ وہ فنونِ لطیفہ کے شیدائی اور مظاہرِ فطرت کے گرویدہ تھے۔ ان کے نزدیک انسان کی فن کاری ہو یا قدرت کی کاری گری، حسن بہرصورت اپنا جلوہ دکھاتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ وہ جمالیات کی تعلیم کو اہمیت دیتے تھے۔ اسے وہ لطیف جذبات، فروغِ صلاحیت اور عالمی اتحاد کا وسیلہ تصور کرتے ہیں (تقریر ص۱۱۲) آج پھر فنونِ لطیفہ کی افادیت کو ہماری اس نئی پالیسی میں سراہا گیا ہے۔ جس سے مولانا کے حسنِ نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مولانا نفاست پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کا مذاقِ سلیم بے حد رچا بسا تھا اور آدابِ زندگی انتہائی شائستہ و پیراستہ۔ ان کے اقوال سے بڑھ کر ان کے افعال اس معاملے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے ملک کے آثارِ قدیمہ، صنائی کے نمونوں، نوادرات، علمی اور ادبی کارناموں، چرند پرند اور شجر و حجر وغیرہ کے بارے میں احترام و افتخار کے جذبات رکھنے کے سلسلے میں بھی جو کچھ تلقین کی ہے، اس سے زیادہ اُن کی زندگی سے شہادت ملی ہے۔ آج ہماری تعلیمی پالیسی بھی اس طرف دعوت دے رہی ہے۔

ہرکیف قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء کے ہر پہلو پر "فکرِ آزاد" کا پرتو بالکل صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ البتہ لسانی پالیسی کے سلسلے میں اس سے کچھ بھی استفادہ نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں بھی "سہ لسانی فارمولا" اپنی مسخ شدہ شکل میں ہی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ آزادی کے چالیس سال بھی آزاد کی زبان کو تہمت سے بری الذمہ نہیں کرسکے ہیں اور وہ بدستور ناکردہ گناہی کے عتاب کا شکار رہتی ہوئی ہے۔ اس ایک بے اتفاقی سے قطع نظر "قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶" کی فلسفیانہ اساس بالعموم اور اس کا اقدار رخ تعلیم فراہم کرنے کا عزم بالخصوص اپنے وطنِ عزیز کے آزاد نظامِ تعلیم کے صفحے پر مولانا آزاد کے ثبت کردہ "نقشِ اول" کی اصابت اور افادیت پر بجزنی دلالت کرتا ہے۔

کتابیات

1. Speeches Of Maulana Azad
Publications Division, Govt. of India
Ministry of Education, New Delhi- 1956

2. The Humanist Tradition in Indian
Educational Thought by K.G. Saiyidain
Asia Publishing House, Bombay-1966

3. National Policy on Education 1986—
Programme of Action
Govt. of India, Ministry of Human Resource
Development, Department of Education,
New Delhi-1986

4. Inservice Teacher Education Package,
Vol. II-
For Upper Primary and Sec. School Teachers.
N.C.E.R.T., New Delhi-1988

۵۔ تعلیم کی چنوتی۔ ایک حکمتِ عملی تناظر
وزارتِ تعلیم، حکومتِ ہند نئی دہلی ۱۹۸۵ء

۶۔ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند محکمۂ تعلیم نئی دہلی ۱۹۸۶ء

۷۔ اساتذہ کی تربیتی پیکج۔ جلد اوّل، برائے پرائمری اسکول اساتذہ
اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، سری نگر۔ ۱۹۸۸ء

۸۔ تعلیمی افکار و مسائل
عبداللہ ولی بخش قادری
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۸۱ء

مالک رام •

مولانا آزاد بحیثیت صحافی



مولانا ابوالکلام آزاد کی مادری زبان اردو نہیں، عربی تھی۔ اُن کی والدہ عرب تھیں۔ مدینہ منورہ کے مفتی محمد بن ظاہر کی بھانجی۔ اس لیے لامحالہ مولانا آزاد کی اُن سے بات چیت عربی میں ہوتی ہوگی ۔۔ بچپن میں اُن کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور زبان سیکھنے کا امکان بھی نہ تھا۔ کیوں کہ خاندان حجاز میں مقیم تھا۔ جہاں اردو کی تعلیم و تدریس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بعد کو جب تعلیم شروع ہوئی تو وہ بھی عربی اور فارسی تک محدود رہی! اور چونکہ اُن کا خاندان اپنے علم و فضل اور مذہبی تقدس کے باعث برگزیدہ رہا تھا، اس لیے جب تعلیم کا آغاز ہوا تو دینیات پر خاص توجہ رہی۔ اُنہوں نے پندرہ برس کی عمر میں درسِ نظامی مکمل کر لیا تھا۔

لیکن وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اس سے پہلے داخل ہو چکے تھے انہوں نے ۱۸۹۹ء میں جب اُن کی عمر ہنوز ۱۱ برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، شعرگوئی شروع کی۔ عام حالات میں گیارہ برس کا بچہ کوئی علمی بات تو درکنار اپنے خیالات اور مافی الضمیر کو بھی مسلسل اور قابلِ لحاظ پیرائے میں بیان کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ چہ جائے کہ شاعری۔ مولانا آزاد نے اس عمر میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تو اب دستورِ زمانہ کے مطابق استاد کی ضرورت پیش آئی۔ اس دور میں امیر مینائی اور داغ دہلوی کا ملک بھر میں طوطی بولتا تھا۔ بلا مبالغہ سیکڑوں شاگرد اُن کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھے۔ قدرتاً مولانا آزاد کی نگاہ بھی اُنہیں پر پڑی۔ پہلے انہوں نے داغ سے تعلق قائم کیا۔ ممکن ہے اس فیصلے میں اُن کی دہلویت بھی کسی حد تک اثرانداز رہی ہو۔ کیوں کہ مولانا آزاد کا اپنا خاندان بھی دہلوی تھا۔ اگرچہ وہ خود مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن اُن کے والد مولانا خیرالدین پشتینی دہلوی تھے۔ مشہور کوچہ پنڈت کے رہنے والے۔ وہیں ان کا اپنا مکان تھا۔ غرض انہوں نے شروع میں داغ سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا، لیکن معلوم نہیں کیوں، یہ تعلق دو تین غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا اور وہ اسے منقطع کر کے امیر مینائی سے مشورہ کرنے لگے۔ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی۔ دو چار غزلوں کے بعد دل اُچاٹ ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ محض زبان اور اصلاح کا نہیں بلکہ نظریہ اور مقصدِ شاعری کا تھا۔ داغ اور امیر دونوں کی شاعری میں زبان پر زیادہ توجہ رہی۔ گہرائی اس میں بہت کم بلکہ برائے نام ہے۔ داغ کی بہ نسبت امیر میں صلاحیت کہیں زیادہ تھی۔ اور ان کی خاندانی روایت اور پس منظر بھی داغ سے بہتر تھا۔ لیکن داغ کی شہرت اور مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے اُنہیں بہکا یا اور وہ بھی اسی سطح پر باتیں کرنے لگے، جو داغ کا طرۂ امتیاز تھیں۔ نتیجہ معلوم! خیر یہ دوسرا موضوع ہے، اس کے بارے میں کبھی ...

امیر کے بعد مولانا آزاد نے چندے مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی سے اصلاح لی۔ یہ تعلق نسبتاً طویل ثابت ہوا۔ لیکن نتیجے کے لحاظ سے اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیوں کہ جلد ہی مولانا آزاد نے سرے سے شاعری ترک کر کے اپنی پوری توجہ نثر نگاری پر مرکوز کر دی۔ اُن کا سارا شعری سرمایہ جو دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے، ڈھائی تین سو شعر سے زیادہ نہیں۔

غرض جیسا کہ کہا گیا مولانا آزاد نے دس گیارہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی، لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں؛ بعض اور اصحاب بھی اتنی کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی فضیلت کی بات یہ ہے کہ اُنہیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ شاعری کے ساتھ ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے، تاکہ ہر مہینے "طرح" پر ملک کے مختلف شعرا سے غزلیں منگا کر اس میں شائع کی جائیں۔ اس سے جہاں ایک مشغلہ ہاتھ آجائے گا،

• سی۔ ۴-۵۰۔ ڈیفنس کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

وہیں مقابلے میں غزلیں کہنے سے مشق اور مزاولت میں بھی مدد ملے گی اور کلام میں ترقی کا موقع بھی ملے گا۔ ایک گیارہ برس کے لڑکے کا اس انداز سے سوچنا واقعی حیرت انگیز ہے۔ بغرض انہوں نے غالباً نومبر ۱۸۹۹ء میں "نیرنگِ عالم" کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ کلکتہ سے جاری کیا۔ میری نظر سے اس کا کوئی شمارہ نہیں گزرا۔ اگرچہ اس کے ایک شمارے کی موجودگی میرے علم میں ہے۔ اس پرچے میں صرف شعری کلام چھپتا تھا۔ نثر بالکل نہیں تھی۔

"نیرنگِ عالم" پورا ایک برس بھی نہیں چلا۔ اس سے پہلے ہی بند ہوگیا۔ اس کے بعد انہوں نے کلکتہ ہی سے ایک اور ماہانہ "المصباح" نام کا جاری کیا۔ یہ بھی زیادہ دن نہ جیا۔ اس کے کسی پرچے کی موجودگی میرے علم میں نہیں ہے۔

"نیرنگِ عالم" اور "المصباح" دونوں مشق کی ذیل میں آتے ہیں۔ آپ نے بڑے بڑے خطاطوں اور خوشنویسوں کی مشق کے نمونے ملاحظہ کیے ہوں گے۔ جب کوئی خوشنویس وصلی لکھنے کا عزم کرتا ہے تو اس سے پہلے حروف اور دوائر سے کسی ترتیب اور نظام کے بغیر کاغذ بھرتا رہتا ہے۔ بعض ایسی مشقیں جو مرورِ زمانہ کے باوجود محفوظ رہ گئی ہیں، اُن کی عجیب شان ہے۔ حرف پر حرف اور دائرے پر دائرہ لکھا اور بنا ہوا ہے۔ استاد کا مقصد اس سے یہ ہوتا تھا کہ ہاتھ ذرا بیٹھ جائے تاکہ اصلی وصلی لکھتے وقت لغزش نہ پیدا ہو۔ یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کے لیے گویا مشق کا حکم رکھتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۹۰۳ء میں کلکتے سے ایک ماہنامہ "لسان الصدق" کے نام سے جاری کیا۔ یہ پہلے دونوں پرچوں سے الگ نوعیت کا تھا ——

"نیرنگِ عالم" تو صرف شعری گلدستہ تھا، جس میں کوئی نثری حصہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ "المصباح" کا کوئی شمارہ نظر سے نہیں گزرا، اس لیے اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا محال ہے، لیکن اس کے نام سے شبہ گزرتا ہے کہ شاید یہ پرچہ مذہبی نوعیت کا ہو۔ اب "لسان الصدق" جو جاری ہوا تو اس میں نظم بالکل نہیں تھی، اس کا پورا فائل میری نظر سے گزرا ہے۔

"لسان الصدق" کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا۔ اس کے پہلے شمارے میں اس کے جو مقاصد چھپے ہیں وہ یہ تھے:

۱۔ سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
۲۔ ترقیِ اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
۳۔ علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگال میں۔
۴۔ تنقید یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو۔

جب یہ ماہنامہ جاری ہوا ہے تو مدیر محترم کی عمر پندرہ برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یہ عمر اور پرچے کے یہ بھاری بھرکم سنجیدہ مقاصد۔ پھر یہ محض دعاوی ہی نہیں رہے۔ انہوں نے واقعی "لسان الصدق" کو اسم بامسمّیٰ بنا دیا۔ اس کے مضامین کا معیار اتنا معتبر اور بلند تھا اور تحریر کا انداز ایسا دلکش کہ اس نے فوراً صفِ اوّل کے پرچوں میں جگہ حاصل کر لی۔ بستا رہا۔ جمشید و ماہِ کامل شد۔ اس پر اس دور کے بعض پرانے اور مشہور جرائد میں بہت اچھے تبصرے شائع ہوئے۔ اس کے مضامین میں لہجے کی متانت اور اسلوب کی ثقاہت سے بیشتر پڑھنے والوں کو خیال ہوا کہ مدیر کوئی معمّر، سالخوردہ اور تجربہ کار بزرگ ہیں۔ اس رسالے نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ انجمنِ حمایتِ اسلام، لاہور اس دور کا مشہور ادارہ تھا؛ آج بھی ہے۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ انجمن کے اربابِ حل و عقد باہر کے اصحابِ علم حضرات کو خاص دعوت دے کر اس میں تقریر کرنے کو بلاتے تھے ——

"لسان الصدق" کے مضامین کے معیار اور خطیبانہ انداز نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے اصحابِ مجاز کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے اپنے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے لیے انہیں لاہور آنے اور اجلاس کو خطاب کرنے کی دعوت دی۔ یقیناً انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ حضرت مدیر کوئی عمر رسیدہ عالمِ دین بزرگ ہیں۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ جب ابوالکلام آزاد کی شکل میں ایک ۱۵-۱۶ سال کا بے ریش و بروت لڑکا اُن کے سامنے پیش ہوا تو اُن پر کیا گزری ہوگی۔ بارے، اگلے دن مولانا آزاد کی تقریر سے انہیں مایوسی نہیں ہوئی کیوں کہ اُس سے اگلے دن اُن سے پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن کی تقریر کا موضوع تھا "تبلیغِ اسلام کا طریقِ کار"۔ یہ اجلاس یکم اپریل ۱۹۰۴ء تک ہوتے تھے۔

اس موقع پر مولانا آزاد کی پہلی ملاقات مولانا حالی مرحوم سے ہوئی۔ اس کا قصہ بھی بڑا پُرلطف ہے۔

مولانا آزاد انجمن کے اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسی دن وہاں ان کی ملاقات مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی سے ہوئی۔ سلیم کو جب معلوم ہوا کہ یہی "لسان الصدق" کے مدیر شہیر ہیں تو انہوں نے بجا طور پر اسے عجائبِ عالم میں سے خیال کیا۔ وہ انہیں مولانا حالی کے پاس لے گئے، جو جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے اور دوسری جگہ کسی دوست کے ہاں مقیم تھے۔ جب سلیم، مولانا آزاد کو ساتھ لیے پہنچے، تو تعارف سے پہلے انہوں نے حالی سے پوچھا: آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہوگی؟ حالی کی طبیعت کا حزم و احتیاط معلوم ہی ہے۔ انہوں نے تامّل سے جواب دیا۔ ابھی بہت کم سن ہیں۔ اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ نہیں، فرمائیے، آپ کے خیال میں کیا عمر ہوگی؟ بالآخر مولانا حالی نے کہا: "یہی پندرہ سولہ سال کی ہوگی"۔ اب سلیم نے انہیں بتایا یہی "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ پرچہ مولانا حالی کی نظر سے بھی گزرتا تھا۔ اور وہ اس کے مضامین کے مدّاح تھے۔ ساری

دنیا کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار عالم صحافی ہوں گے۔ یہ معلوم کر کے انہیں بہت تعجب ہوا کہ یہ نوعمر صاحبزادے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ اُس دن جو تعلقات دونوں میں قائم ہوئے، امتدادِ زمانہ سے اُن میں استواری آئی اور ایک دوسرے سے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا گیا۔

افسوس کہ "لسان الصدق" نے بھی کوئی اٹھارہ مہینے میں دم توڑ دیا۔ مولانا آزاد کی سیمابی فطرت انہیں کوئی کام جم کر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس پر اُن کا اکثر سفر میں رہنا! لازماً اس کا پرچے کی باقاعدہ اشاعت پر اثر پڑا۔ بعض اوقات دو دو مہینوں کے بعد صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوگا کہ نومبر ۱۹۰۳ء کے بعد دسمبر کا پرچہ شائع ہوا تو اس پر پہلی جلد کی تکمیل کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء کے پورے سال میں صرف نو شمارے شائع ہوئے؛ اور اس سال کا آخری پرچہ بھی اگست اور ستمبر (۱۹۰۴ء) کا مشترکہ شمارہ تھا؛ اسی پر دوسری جلد ختم ہو گئی، ۱۹۰۴ء میں اور کوئی پرچہ نہیں نکلا۔ ۱۹۰۵ء میں صرف ایک پرچہ شائع ہوا۔ جو اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد "لسان الصدق" بند ہو گیا۔

۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نے انہیں دعوت دی کہ وہ لکھنؤ آئیں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالے "الندوہ" کی ترتیب و تدوین میں اُن کا ہاتھ بٹائیں۔ "الندوہ" کا فائل آج بھی ملتا ہے۔ یہ خالص علمی اور تحقیقاتی پرچہ تھا اور ندوۃ العلماء کا آرگن ہونے کی وجہ سے اس کی ایڈیٹری بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی خود اس کے ایڈیٹر تھے اور وہی مجلسِ ندوۃ العلماء کے سامنے اس کے لیے جوابدہ بھی تھے۔ مولانا شبلی جس پائے کے مصنف اور نقاد ہیں، اُس کے متعلق کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اسے مدِنظر رکھتے ہوئے ان کا سترہ سالہ نوجوان آزاد کو "الندوہ" کی ادارت میں شرکت کی دعوت دینا، حیرت ناک تو ہے ہی، لیکن اس سے بڑھ کر یہ مولانا آزاد کے علم و فضل کی، اُن کی تحریر کے معیار اور پختگی کی، اُن کی ذاتی متانت اور رکھ رکھاؤ کی عادت کی بھی، اتنی بڑی سند ہے کہ مشکل سے اس کی مثال کہیں اور ملے گی۔

مولانا آزاد اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک چھ مہینے "الندوہ" سے وابستہ رہے اور اس کے بعد انہوں نے کسی وجہ سے خود یہ تعلق قطع کر لیا۔

"لسان الصدق" کی ادارت کے زمانے میں مولانا آزاد کی شہرت دُور تک پہنچ گئی تھی اور بہت لوگ ان کے مدّاح بن گئے تھے۔ انہیں میں ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے۔ وہ اُس زمانے کے مشہور سہ روزہ اخبار "وکیل" کے مالک تھے جو امرتسر ہی سے شائع ہوتا تھا۔

جب مولانا آزاد "الندوہ" کے ادارہ تحریر سے الگ ہوئے، تو شیخ غلام محمد نے انہیں امرتسر آنے اور "وکیل" کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ اس پر مولانا امرتسر چلے گئے۔ انہوں نے اپنے زمانۂ ادارت میں "وکیل" میں بہت خوش گوار تبدیلیاں کیں جس سے پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ لیکن ایک نجی حادثہ ایسا پیش آگیا کہ انہیں بادلِ ناخواستہ جلد ہی امرتسر سے واپس جانا پڑا۔

مولانا آزاد کے ایک بڑے بھائی تھے۔ مولانا ابوالنصر غلام یٰسین آہ، دونوں بھائیوں کی تعلیم ایک ہی نہج اور معیار پر ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا خیر الدین کا پیری مریدی کا سلسلہ بھی تھا۔ کلکتے اور بمبئی کے اطراف میں اُن کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ وہ بڑے بیٹے غلام یٰسین آہ کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ آہ بھی خود بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر تھے، لیکن خدا کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آہ تفریحاً عراق کے سفر پر گئے اور وہاں بیمار ہو گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہو گئی تو واپس بمبئی آئے تاکہ یہاں مناسب علاج ہو سکے۔ حالت سدھرنے کی جگہ اور بگڑ گئی۔ والد کلکتے سے بمبئی پہنچے اور انہیں ساتھ لے گئے، لیکن اُن کا وقتِ اخیر آپہنچا تھا۔ کلکتے پہنچنے کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ وسط ۱۹۰۶ء کی بات ہے، جب مولانا آزاد امرتسر میں "وکیل" سے وابستہ تھے۔ مولانا خیر الدین نے انہیں لکھا کہ اب تم گھر آجاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ یہ ابھی جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر ۱۹۰۶ء میں والد نے ایک آدمی امرتسر بھیج دیا کہ انہیں اپنے ساتھ کلکتے لے آئے۔ اب کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا تھا۔ یہ کلکتے چلے گئے۔ امرتسر کا زمانۂ قیام اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک صرف آٹھ مہینے رہا۔ وہ والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتے چلے تو گئے، لیکن سچ یہ ہے کہ وہاں جو کام ان کے سپرد کیا گیا، وہ کسی عنوان ان کی پسند کا نہیں تھا۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت، پند و وعظ وغیرہ سے وہ کوسوں دُور تھے۔ اُدھر اخبار نویسی کا مشغلہ ان کا دل پسند کام تھا۔ شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ قصہ کوتاہ چند دن بعد انہوں نے اپنے والد سے کھل کر کہہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کاروبار کو جاری نہیں رکھ سکتا، نہ مجھے یہ پسند ہے کہ لوگ آئیں اور میرے ہاتھ پاؤں کو فرطِ عقیدت سے بوسہ دیں۔ والد آدمی سمجھدار تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں، ان کی مرضی کے خلاف انہیں کسی کام پر مجبور کرنے سے فائدہ! انہوں نے اجازت دے دی کہ اچھا اگر یوں ہے، تو تم واپس امرتسر جا سکتے ہو۔ اس پر یہ اگست ۱۹۰۷ء میں امرتسر چلے گئے اور دوبارہ "وکیل" کی ادارت کی باگ ڈور ان کے سپرد کر دی گئی، لیکن اب کے ان کی صحت جواب دے گئی؛ وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر بمشکل سے وہاں رہے، اور جولائی/اگست ۱۹۰۸ء

میں "وکیل" سے الگ ہو گئے۔

اب ان کی عمر ۲۰ سال کے لگ بھگ تھی، اس دوران میں انہوں نے کئی پرچوں میں کام کیا۔ ان میں سے بعض ان کی ذاتی ملکیت تھے، بعض دوسروں کے، جہاں وہ تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن وہ کہیں بھی رہے ہوں، ان کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ صحافت کو ملک و ملت کی بہتری اور بہبودی، خدمت گزاری اور خیر خواہی کا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ اخبار اور رسالے گویا ان کی تجربہ گاہ تھے، جہاں وہ اس تلاش میں رہے کہ ان کے اخبار کا مطمحِ نظر کیا ہونا چاہیے۔ اور آخر کار انہیں معلوم ہوا تو یہ کہ جس منزلِ مقصود کی تلاش میں وہ اتنے دن سے بھٹک رہے ہیں، وہ کہیں باہر نہیں، بلکہ خود ان کے پاس تھی۔ ان کے نصب العین کو ان کے جاری کردہ ہفتہ وار "الہلال" نے پورا کیا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا

اور سب باتوں کو چھوڑ کر "الہلال" کے صرف ادارۂ تحریر ہی کو لیجیے، تو حیرت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کے علاوہ اس میں مختلف اوقات میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ضیاء اللہ عمادی، مولانا عبد السلام ندوی اور بعض دوسرے اصحاب کام کرتے رہے اور سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہفتہ وار تو در کنار، کیا آج تک کسی اردو ماہنامے کو بھی اتنا وسیع اور شاندار ادارۂ تحریر نصیب ہوا ہے۔ پھر ان مستقل معاونین کے علاوہ جو اسٹاف میں کام کرتے تھے، اس کے مضمون نگاروں میں ملک کے صفِ اوّل کے ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ مولانا شبلی کی بعض معرکے کی نظمیں پہلی مرتبہ "الہلال" ہی میں شائع ہوئیں۔ غرض "الہلال" صحیح معنوں میں ہماری سیاسی اور صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔

اس کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے شروع سے بار بار اعلان کیا "الہلال" ایک "دعوت" تھا، جس کا مقصد اس دینِ الٰہی کی تجدید اور اس کے اصولِ بنیادی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو زندہ کرنا" تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات دیکھتے، بیباکانہ اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ اس میں حکومت اور عمالِ حکومت پر خاص طور سے سخت لب و لہجہ میں نکتہ چینی ہونے لگی۔ حکومت بھلا اسے کیوں برداشت کرنے لگی تھی۔ "الہلال" کو جاری ہوئے مشکل سے سال بھر ہوا ہوگا کہ حکومت نے ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو اس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی، جو فوراً ادا کر دی گئی۔

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں سے استصواب کیے بغیر ہندوستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ مولانا آزاد ہر ہفتے حکومت کی بد عنوانیوں پر تو پہلے ہی سے لکھتے آ رہے تھے، اب انہیں جنگ کی وجہ سے اور وسیع میدان ہاتھ آ گیا۔ یورپ میں جنگ کا پلڑا ابھی اس وقت تک جرمنی کے حق میں تھا۔ "الہلال" کے مضامین نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ اس کے ۱۴ اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے دو شمارے (۱۶ - ۱۷) مشترک شائع ہوئے تھے۔ اس میں دو مضمون تھے، "حدیث الجنود" اور "سقوطِ انٹورپ" نیز بیلجیم کے فوجیوں کی ایک تصویر، جس کے نیچے یہ قرآنی آیت چھپی تھی: وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں! ۳، ۱۱۷) حکومت آج تک "الہلال" کے خلاف سخت اقدام سے اس لیے گریز کرتی رہی تھی کہ یہ ایک نیم مذہبی جریدہ ہے، لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھی جب "الہلال" میں مندرجہ صدر مضمون شائع ہوئے تو حکومت کے نفسِ ناطقہ روزنامہ "پانیر" الٰہ آباد نے اس کے خلاف ایک بہت سخت مضمون لکھا،* جس کا عنوان تھا:

Pro-Germanism in Calcutta

اس میں منجملہ اور باتوں کے آخر میں لکھا تھا کہ جو حکومت:

"برطانوی فوج اور بحریہ کے خلاف ایسے نفرت انگیز اور کینہ پرور الزامات لگانے کی کھلی چھٹی دیتی ہے، وہ سخت، غیر ضروری رواداری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔"

اس کے بعد حکومت بنگال نے "الہلال" کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی؛ مشترکہ شمارہ بھی ضبط کر لیا گیا؛ اور اس سے مزید دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ یہ ان کی استطاعت سے کہیں زیادہ مطالبہ تھا؛ انہوں نے پرچہ بند کر دیا۔ اس کے آخری پرچہ پر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کی تاریخ ثبت ہے۔

کوئی سال بھر کے التوا کے بعد انہوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو دوسرا پرچہ "البلاغ" جاری کر دیا۔ صرف نام کا فرق تھا ورنہ دونوں کی صوری یا معنوی حیثیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن "البلاغ" نے بہت کم عمر پائی۔ یہی تقریباً پانچ مہینے۔ اوائل مارچ ۱۹۱۶ء میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا آرڈی نینس (قانون) کے تحت ان کے صوبے سے اخراج کا حکم جاری کر دیا۔ اسی کے ساتھ "البلاغ" بند ہو گیا۔ چونکہ بیشتر دوسرے صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ پہلے سے ممنوع قرار دے چکی تھیں، اب صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے، جہاں وہ جا سکتے تھے۔ بہار میں یہ سہولت تھی کہ کلکتے سے قریب تھا، لوگوں کو وہاں سے آنے جانے میں کم وقت اور خرچ پر ملاقات کا موقع مل سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے

---

* عام خیال ہے کہ پانیر نے یہ مضمون یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر کے ایماء پر شائع کیا ہے۔

قیام کے لیے رانچی کا انتخاب کیا۔ ابھی اس حکم پر اور ان کے رانچی میں قیام پر پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو حکومتِ ہند نے ان کی رانچی ہی میں نظربندی کا حکم جاری کر دیا۔ وہ چار سال بعد یکم دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔

"الہلال" کئی لحاظ سے عہد آفریں ثابت ہوا۔ اس شان کا کوئی ہفتہ وار پرچہ اردو میں شائع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد بھی جو پرچے نکلے، ان کے سامنے نمونہ "الہلال" ہی کا رہا۔ ہر ایک کی یہی خواہش رہی کہ وہ شکل و صورت، مضامین کی ترتیب، اداریے، تصاویر وغیرہ میں "الہلال" کا تتبع کریں۔

لیکن ظاہری حسن اور طباعتی خوبیوں سے قطع نظر "الہلال" کا اصلی کارنامہ اس کے مدیر شہیر کی طرزِ تحریر کی بداہت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں کو، اربابِ حکومت کو، اکابرِ قوم کو، علمائے دین کو، یوں للکارا ہوگا۔ مولانا آزاد نے کسی کو نہیں بخشا۔ اور کوئی ان کی نگاہِ احتساب کی زد سے باہر نہیں رہا۔ جہاں بھی کوئی غلط بات ان کے سامنے آئی، انہوں نے اس پر بے خوف اور عواقب سے بے پروا ہو کر گرفت کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوش نصیبی سے ان کی بے لاگ تنقید کا اثر ہوا، اور اس سے حسبِ دلخواہ نتائج پیدا ہوئے۔

بدیسی حکومت پران کی گرفت اور بھی شدید تھی اور جب یہ خیال میں رہے کہ "الہلال" جولائی ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ اور "البلاغ" سمیت اپریل ۱۹۱۶ء میں بند ہو گیا یعنی اس نے کے ساڑھے تین برس، تو اس کے نتائج سے حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ہماری قومی تحریک اس مرحلے پر تھی کہ دوسروں کا تو کیا ذکر، کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلی قرارداد حضور قیصرِ ہند ملک معظم سے ملک و قوم کی وفاداری کی منظور کی جاتی تھی۔ مہاتما گاندھی ہنوز جنوبی افریقہ سے ہندوستان نہیں پہنچے تھے۔ اور پوری سیاسی تحریک بہت ہی نرم رو اور نرم گفتار تھی۔ حکومت پر اس کے اعمال و اقوال پر کڑی نکتہ چینی کی ابتدا "الہلال" ہی سے ہوئی۔

صحافت کو بوجوہ ادب میں شمار نہیں کیا جاتا، لیکن "الہلال" کے کئی مضمون ادب میں بھی بلند مقام پانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے جو مقالے مسلم یونیورسٹی سے متعلق لکھے تھے، اور جن میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے، وہ ادبی لحاظ سے بھی بہت قیمتی اور اہم ہیں۔ "الہلال" کی ادبی خدمات اپنی جگہ، لیکن اس رسالے کا جو اثر اپنے زمانے کے اور بعد کے لکھنے والوں نے قبول کیا، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ہمارے بعض مشہور ادیب "الہلال" اور مولانا آزاد کے اسلوبِ تحریر کے متتبع اور خوشہ چیں رہے تھے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری اور غلام رسول مہر کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ "الہلال"

میں ان کی شعلہ نوائی اور اس کی پاداش میں ان کی چار سالہ نظربندی نے انہیں ملک کے تمام حلقوں کا منظورِ نظر بنا دیا تھا۔ جب جنوری ۱۹۲۰ء میں وہ رانچی سے رہا ہو کر واپس آئے تو ہر کوئی اُن کے استقبال کے لیے بے قرار اور چشم براہ تھا۔ لوگوں نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اہلِ وطن کے اس کلی اعتماد اور اشتیاق اور عقیدت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے آپ کو ملک کی سیاست کے لیے وقف کر دیا۔

یہ زمانہ انتہائی مصروفیت کا رہا۔ کانگریس اور خلافت نے ملک کے طول و عرض میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ مجلسِ خلافت کا ایک شاخسانہ جمعیۃ العلمائے ہند کی شکل میں وجود میں آچکا تھا۔ مولانا آزاد ان سب تنظیموں کے بے حد سرگرم اور فعّال کارکن تھے، وہ ان کی مجالسِ عاملہ کے رکن تھے اور بعض کے صدر بھی۔ لہٰذا ان کے لیے سکون سے کسی ایک جگہ قیام کرنا محال ہو گیا۔ صبح کہیں شام کہیں۔ درمیان میں اگر کچھ وقت فرصت کا مل گیا تو وہ رفقائے کار اور ہم خیال احباب سے صلاح مشورے کی نذر ہو جاتا۔

لیکن وہ کبھی نہیں بھولے کہ جب تک ایک اچھا اخبار پاس نہ ہو، اپنا مافی الضمیر عوام تک پہنچانا ممکن نہیں ہے۔ بالآخر انہوں نے ایک اور ہفتہ وار کی اشاعت کا انتظام کیا۔ اس کا نام "پیغام" تھا۔ اس کا پہلا پرچہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ اگرچہ اس کی نگرانی تو انہوں نے اپنے ہاتھ ہی میں رکھی، لیکن ترتیب و تدوین کا سارا کام مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سپرد کر دیا۔

"پیغام" میں مولانا آزاد کے بعض بڑے معرکے کے مضامین شائع ہوئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ ملکی اور سیاسی ذمہ داریوں نے انہیں اتنی اجازت اور فرصت نہ دی کہ وہ اس میں کچھ زیادہ لکھ سکتے۔

اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ شہزادے ویلز کی ہندوستان میں آمد اور اس کا ملک گیر بائیکاٹ ہے۔ وہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو یہاں پہنچے تھے۔ "پیغام" نے بھی اپنی بساط بھر اس بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا۔ حکومت بھلا اسے کیوں کر معاف کر سکتی تھی۔ پہلے عبدالرزاق ملیح آبادی بحیثیت ایڈیٹر گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور انہیں دو سال کی سزا ہو گئی۔ ان کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو خود مولانا آزاد گرفتار ہوئے۔ اور انہیں ایک سال کی قیدِ بامشقت کی سزا ہوئی۔ ان کے مقدمے کی آخری پیشی ۹ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوئی تھی۔ اسی دن انہوں نے اپنا وہ مشہور بیان عدالت کے سامنے پڑھا تھا، جو بعد کو "قولِ فیصل" کے عنوان سے شائع ہوا۔

ملیح آبادی اور مولانا آزاد دونوں کے جیل چلے جانے سے "پیغام" بند ہو گیا۔ اس کے آخری شمارے پر ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کی تاریخ ثبت ہے۔ گویا اس کی ساری تین مہینے کی عمر ہوئی۔ اس کے کل تیرہ شمارے شائع ہوئے تھے۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تجربہ بھی بہت کامیاب رہا۔ اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اگرچہ اس کی قیمت صرف دو آنہ فی شمارہ تھی۔ لیکن بعض اوقات یہ ایک ایک روپے میں بکا اور ناشر پبلک کا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر رہے۔

خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود

یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد ایک مذہبی اور صوفی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی اسی نہج پہ ہوئی تھی۔ لامحالہ عمر بھر مذہب ان کے غور و فکر کا محور رہا۔ انہوں نے جو تحریری ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا، وہ بھی بیشتر مذہب اور مذہبی موضوعات ہی سے متعلق ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عملی زندگی اور معنوی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ بنیادی طور پر صحافی اور انشا پرداز تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں آنکھیں کھولی تھیں، اور نشر و تبلیغ کے ذرائع اور وسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ پریس اور اخبار کا مقام تہذیبِ جدید میں کتنا اہم ہے، اور اس کی قوت کتنی اور کیسی دور رس ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ساری عمر کسی نہ کسی حیثیت سے رسائل و جرائد سے وابستہ رہے۔ اور جب بھی انہیں موقع ملا، انہوں نے اپنا ذاتی پرچہ جاری کرنے سے گریز نہیں کیا۔

"پیغام" کے بند ہو جانے کے بعد سیاسی سرگرمیوں نے انہیں کسی اور موضوع کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں دی، لیکن وہ صحافت سے بے خبر نہیں رہے۔ کچھ دن تک تو وہ ایک روزنامہ جاری کرنے کے منصوبے پر بھی غور کرتے رہے۔ لیکن اس کے لیے جتنے سرمائے اور اہتمام اور لاؤ لشکر کی ضرورت ہے، اس کا انتظام آسان نہیں تھا۔ آخر کار انہوں نے روزنامہ کا خیال چھوڑ دیا اور "الہلال" ہی کو دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ لوگ اس نام سے مانوس تھے اور دنیائے صحافت میں اس کی ساکھ بھی بہت بلند تھی۔

چنانچہ "الہلال" ثانی کا پہلا شمارہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو دلی سے شائع ہوا۔ اس کی ترتیب و تدوین کی نگہداشت بھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سپرد رہی۔ مولانا آزاد کی اپنی مصروفیتیں ایسی تھیں کہ وہ اس دور میں اس کے لیے بہت کم لکھ سکے۔ قارئین جو ان کی تحریروں کے لیے بے صبری سے چشم براہ تھے، اس سے بہت مایوس ہوئے۔ لیکن مولانا آزاد بھی مجبور تھے۔ انہوں نے اتنے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے اور ہر روز ملک کے طول و عرض سے اتنے مطالبے ان کے پاس پہنچتے تھے کہ وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں وہ لکھنے کے لیے کہاں کر وقت نکال سکتے تھے۔

"الہلال" ثانی چھ مہینے یعنی ۱۰ جون ۱۹۲۷ء سے ۹ دسمبر ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ اس دور میں اس کے صرف ۲۰ شمارے شائع ہو سکے۔ تاہم یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب ہو۔

"الہلال" کے دورِ ثانی میں ایک مسلسل مضمون "انسانیت موت کے دروازے پر" شائع ہوتا رہا تھا جسب معمول اس پر بھی مضمون نگار کا نام نہیں تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ مضمون مولانا آزاد کا ہے۔ چنانچہ بعد کو کسی ناشر نے اسے ان کے نام سے کتابی صورت میں شائع بھی کر دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ مضمون مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف ہے۔ اور اس کا مولانا آزاد سے انتساب غلط ہے۔ یہ بات مجھے خود ملیح آبادی مرحوم نے بتائی تھی۔

مولانا آزاد کی تعلیم سراسر عربی اور فارسی زبانوں کے ذخیرے تک محدود رہی تھی۔ اس کے بعد ان کا مطالعہ بھی انہیں علوم تک محدود رہا۔ تقریر اور خطابت کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ جیسا کہ ان کی بڑی ہمشیرہ فاطمہ بیگم المتخلص بہ آرزو کی شہادت سے ظاہر ہے۔ فرماتی ہیں۔

"بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا، جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں۔ ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں بھی عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو: ہٹو، ہٹو، راستہ دو، دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی، یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے۔ ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔ تم سمجھو، بہت لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔ پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے۔ جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی کہ بھائی، سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے، ہم کیسے سمجھیں کہ یہاں ہزاروں آدمی کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے

کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

خطابت کا یہ شوق عمر کے ساتھ اور بڑھا۔ بلکہ اب یہ شوق ان کی تحریر میں بھی در آیا۔ لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے باوجود ان کی تحریر عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب سے گرانبار رہتی۔ نہ اس کی روانی میں کمی آئی نہ اس کی شگفتگی اور دلکشی میں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فقرے ایسے ترشے ترشائے ہوتے تھے۔ جیسے کسی نے ہیرے کو کانٹ چھانٹ کر اسے اور بھی حسین بنا دیا ہو۔

کئی لوگوں نے ان کی تحریر کی ثقالت اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ کی کثرت پر اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے اور اسے تسلیم کرنا پڑے گا لیکن اس کی توجیہہ بڑی آسان ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ "الہلال" میں ان کے مخاطب اہلِ علم بلکہ طبقۂ علماء کے لوگ تھے۔ بیشتر موضوعات بھی انہیں اصحاب کی دلچسپی کے تھے۔ ایک طرف ان کی اپنی تعلیم کا پس منظر پیشِ نظر رکھیے، اور دوسری طرف ان کے مخاطبوں کا علم و فضل کا معیار، تو آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان مقالات میں انہوں نے جو زبان اور لب و لہجہ اختیار کیا، وہی ناگزیر تھا۔ وہ اس سے آسان زبان لکھنے پر قادر تھے۔ ترجمان القرآن میں (تفسیر سورۂ فاتحہ کے بعض حصوں کو چھوڑ کر) ان کی تحریر بہت سلیس اور آسان ہے، خاص کر اس کا ترجمہ اور حواشی والا حصہ۔ چونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بیشتر پڑھنے والے عوام اور تھوڑی استعداد کے لوگ ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے تکلموا الناس علی قدر عقولہم کے مصداق یہاں اسی سطح پر بات کی، جو قاری کے علم و فہم کے مطابق تھی۔ ترجمان القرآن کی بات آ گئی۔

اگرچہ ان کی تعلیم اپنی خاندانی روایات کے مطابق دینی علوم سے متعلق ہوئی تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے۔ انہوں نے وسیع اور گوناگوں مطالعے سے اس پر اضافہ کیا اور دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کر لی۔ بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا محور و مرکز رہا تھا۔ "الہلال" میں انہوں نے قرآن کو ایسے البیلے اور دل نشین انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق سے اتار کر روزمرہ کے استعمال کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکر اور تدبر کے نتائج انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف ترجمان القرآن میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی! وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ قبضہ جما لیا۔ اور وہ باقی حصے کی تفسیر قلمبند نہ کر سکے۔ بلاشبہ یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان رہا۔ لیکن اگر مسئلے کو اس پہلو سے دیکھا جائے کہ دین کے بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اوّل میں ہیں اور ان کے بارے میں انہوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں محفوظ کر دیے ہیں تو اس نقصان کا غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے کہ ان کا اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان۔ اگر واقعی پوری توجہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا جائے تو ناممکن ہے کہ قاری ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہو۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ کس ڈھنگ سے قرآن کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر آپ خود بقیہ پاروں کی تعبیر و تفسیر کر سکتے ہیں۔ گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ اور تفسیر ہی نہیں بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔

میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے کاملاً اجتناب کیا اور علوم و دعوتِ قرآن کو دوبارہ اپنی اصلی اور اساسی شکل میں پیش کر دیا، جو شارع کا مقصود اور صدرِ اوّل کا اعتقاد تھا۔

چونکہ ترجمان القرآن میں قرآن کا ترجمہ اور حواشی ہیں، اس لیے اس کی ادبی اہمیت پر کماحقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ اس پہلو سے بھی یہ کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہے۔

قرآن کے اردو ترجمے بہت ہیں۔ زیادہ نہیں تو آٹھ دس تو یقیناً خود میری نظر سے بھی گزرے ہوں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو لطفِ زبان و بیان اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ہے، وہ اِلّا ماشاء اللہ، ان کے کسی پیشرو یا پیرو کے یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں کہ مترجم کو عربی و اردو دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہو، اور اس کا ادبی ذوق بھی اتنا بلند ہو کہ وہ محض معنی ہی کا خیال نہ رکھے بلکہ موزونیت، مقام اور اردو زبان کے مزاج سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ عربی تو ان کی مادری زبان تھی ہی، ذاتی مطالعے اور مشق سے انہوں نے اردو میں بھی اہلِ زبان کی سی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اس پر مستزاد، قدرت کی طرف سے انہیں طبعِ موزوں اور شعر و ادب کا قابلِ رشک ذوق ودیعت ہوا تھا۔ ان سب باتوں نے مل کر ترجمان القرآن کو تخلیقی کارنامہ بنا دیا ہے۔

"الہلال" کے خالص ادبی مضامین کی طرف اشارہ کر چکا ہوں لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انہیں اس کوچے سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہو چکی تھی۔ اب ادب بھی مجبوراً چھوٹ گیا۔ حسنِ اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انہوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالۂ قلم کیے، جو بعد کو "غبارِ خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ "الہلال" ان کے عہدِ شباب کی یادگار ہے۔ "غبارِ خاطر" عہدِ کہولت بلکہ بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے۔

ابوسلمان شاہجہانپوری

مجلّہ الجامعہ کلکتّہ

۱۹۱۶ء میں شریف مکہ حسین بن علی نے انگریزوں کی شہ اور ایما سے ترکی خلافت سے بغاوت کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بعد عرب حجاز کے حالات نے نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی خلافت کے ساتھ تھیں، لیکن شریف حسین کے قبضہ و قیام حکومت کے بعد کچھ لوگوں نے ذہنی طور پر اگرچہ اسے قبول کر لیا تھا لیکن حالات میں جو الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا اس سے وہ بھی پریشان تھے۔ دیوبندی اور اہل حدیث مکتبۂ فکر کے علماء اور مجلس خلافت کے رہنما خاص طور پر فکرمند تھے اور حالات کی اصلاح و درستگی کے لیے کوشاں تھے۔ ان کی بہترین توقعات امیر عبدالعزیز ابن سعود آل فیصل کی تحریک اصلاح و انقلاب سے وابستہ تھیں۔ ان رہنماؤں نے اصلاح و تطہیر حجاز کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے امراء عرب و حجاز سے براہ راست رابطہ پیدا کیا، حالات کے جائزہ و مشورہ کے لیے متعدد وفود روانہ کیے اور ہندوستان میں تحریک اصلاح و انقلاب کو متعارف کرانے اور اسے مقبول بنانے کے لیے وقت کے اخبارات و رسائل کے صفحات کو مستقل طور پر اس کے لیے وقف کر دیا۔ خصوصاً اہل حدیث اور دیوبندی خیال کے رسائل نے اس باب میں شاندار خدمات انجام دیں۔ ان دونوں جماعتوں کے بیشتر حضرات ملک کی آزادی کی جدوجہد، قومی و ملی تحریکات اور اسلامی ممالک کی سیاست میں عام طور پر ہم خیال اور ہم فکر رہے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات کا پیمانہ یہاں بھی بلند و ارجمند رہا۔ انہیں اپنی علمی و ادبی زندگی کے اوائل ہی میں عربی رسائل و جرائد کے ذریعے مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاست سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اسے ان کے سفر (۹-۱۹۰۸ء) اور وہاں کے اہل علم اور اصحاب نظر و تدبر سے ملاقاتوں نے مستحکم کر دیا تھا اور تاریخ و سیاست اور تحریکات وطنی و ملی کے مشاہدے نے ان کے نقوش کو گہرا اور مزین کر دیا تھا۔ اس کا بہترین اظہار الہلال (۱۴-۱۹۱۲ء) البلاغ (۱۶-۱۹۱۵ء) پیغام (۱۹۲۱ء) الجامعہ (۲۴-۱۹۲۳ء) [illegible] الہلال (۱۹۲۷ء) میں ہوا۔ اس سلسلے میں دو اخباروں کا ذکر اور کر دینا چاہیے جن سے مولانا کا خاص تعلق تھا اور جو مولانا کے ذوق علم اور نظر و تدبر کے آئینہ دار تھے اور مولانا کا ان سے بھی نگرانی و سرپرستی کا تعلق تھا۔ ۱۔ روزانہ اقدام کلکتہ زیرادارت مولوی محی الدین قصوری (۱۹۱۶ء) ۲۔ روزانہ پیام کلکتہ زیرادارت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (۱۹۲۵ء آخری سہ ماہی)[1]۔ ان اخبارات و رسائل کے بعد بھی وہ خلافت بمبئی اور زمیندار اور انقلاب لاہور کے ذریعے اسلامی ممالک کی خدمت انجام دیتے رہے۔ یہ ایک الگ اور نہایت اہم موضوع اور مولانا آزاد کی خدمات کا عظیم الشان میدان ہے جس کی طرف اہل علم اور اصحاب قلم کو توجہ دینی چاہیے۔

یہاں ہم مولانا آزاد کی ان خدمات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے "الجامعہ" کے ذریعے تحریک تطہیر حجاز کے سلسلے میں امیر عبدالعزیز ابن سعود کی سعی و اقدام کے بعد انجام دی تھیں۔

الجامعہ کے اجرا کا منصوبہ کہاں اور کن حالات میں بنا تھا اور اس کے کیا مقاصد قرار پائے تھے؟ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (ایڈیٹر الجامعہ) نے "ذکر آزاد" میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مولانا آزاد اور ملیح آبادی علی پور جیل (کلکتہ) میں قید تھے (۱۹۲۲ء)

---

[1] آخرالذکر دونوں اخباروں کے بارے میں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کسی کی نظر سے گزرے بھی ہیں۔

آزاد نیشنل کمیٹی، علی گڑھ کالونی، کراچی ۱۴ (پاکستان)

مولانا ملیح آبادی فرماتے ہیں:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ شریف حسین کے ذریعے حجاز اور حرمین شریفین پہ انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ شریف کی بغاوت کا شباب تھا کہ میں مصر سے حج کرنے گیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ انگریز فوجی افسر اپنی وردیوں پہ عربی جبے پہنے مکہ میں بلکہ خود حرم میں آزادی سے پھر رہے ہیں۔ ترکوں کی مکمل شکست کے بعد حجاز انگریزوں کا ہو چکا تھا۔ اگرچہ دکھانے کو بادشاہ شریف حسین بن علی تھا۔

جیل میں مولانا اس صورت حال سے بہت پریشان تھے اور حجاز کی آزادی کے لئے بے قرار۔ بہت سوچ بچار کے بعد [illegible] طے پائی کہ ہندوستان سے ایک عربی [illegible] جائے۔ وہ اسلامی دنیا کو حقیقت حال سے آگاہ کرے اور تدارک کی راہ دکھائے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلم ممالک از حد مرعوب تھے۔ نفسی نفسی کا عالم تھا ہر ملک کو صرف اپنی پڑی تھی اور دوسرے ملکوں سے حتیٰ کہ مرکز اسلام حجاز سے بھی اسلامی دنیا بے پروا ہو چکی تھی۔ عرب ممالک یا تو برطانیہ اور فرانس کے قبضے میں آ چکے تھے یا ان کے اثر میں تھے۔ لیکن عام رائے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ضرورت تھی کہ اسلامی ممالک میں عام رائے پر اثر ڈالا جائے۔ انگریزوں اور شریف حسین کے خلاف اسے ابھارا جائے۔ یقین تھا کہ عام رائے ہموار ہو گئی تو انگریزوں کے چنگل سے حجاز کو نجات مل جائے گی۔

عرب میں صرف ایک ہی طاقت ایسی تھی جو شریف مکہ سے ٹکر لے سکتی تھی۔ یہ طاقت نجد کے سلطان ابن سعود کی تھی۔ ابن سعود بھی انگریزوں کے اثر میں تھا اور بظاہر شریف حسین کے پاسنگ برابر بھی نہ تھا، مگر میں عرب ملکوں کے حالات سے اور ابن سعود کی سیاست و قوت سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس لیے مجھے پوری امید تھی کہ عرب ممالک کی عام رائے جب شریف کے خلاف پھر جائے گی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے نام سے مناسب موقع پر ابھارا جائے گا تو وہ شریف کا خاتمہ کر ڈالے گا اور شریف کے خاتمے کے ساتھ حجاز بھی انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے گا۔

چنانچہ طے پایا کہ الجامعہ کے نام سے عربی رسالہ کلکتے سے جاری کیا جائے۔ میں اسے ایڈٹ کروں اور خلافت کمیٹی اس کا خرچ برداشت کرے۔ میرے رہا ہوتے ہی پرچہ جاری ہو گیا" (۷ - ۹ - ۲۹۶)

مقاصد مہمۂ الجامعہ

واضح رہے کہ الجامعہ کے اجرا کا صرف اتنا ہی مقصد نہ تھا جو مولانا ملیح آبادی کے مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ بلاشبہ شریفی رویہ اور حالات کی اصلاح کا جذبہ اس کا بہت بڑا محرک تھا۔ درحقیقت اس کے مقاصد کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع تھا اور یہ ایک مستقل ضرورت تھی جس پر اس سے بہت پہلے توجہ دی جانی چاہیے تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اب جو حالات پیش آ رہے تھے ان میں اس ضرورت سے صرف نظر نہ کیا جا سکتا تھا۔ الجامعہ کے پہلے ہی نمبر میں "مقاصد مہمۂ الجامعہ" کے عنوان سے عربی اور فارسی میں الجامعہ کے مقاصد ستہ کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ فارسی میں اس کے مقاصد چوں کہ فہم کے لیے رہین منت ترجمہ نہیں اس لیے انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ دعوت جامعہ اسلامیہ خاصہ وجامعہ جمیع امم واقطار شرقیہ علمہ

۲۔ تعارف وتفاہم وتعاون وتناصر فیما بین جمیع بلاد اسلامیہ شرقیہ، علی الخصوص درمیان براعظم ہند وبلاد اسلامیہ وعربیہ۔

۳۔ دریں عصر انقلاب وتغیر کہ تمام اقوام واقطار شرقیہ برائے اصلاح حال وتلافی مافات سرگرم سعی واقدام اند رایں ہمہ مساعی متفرقہ را در یک رشتہ ارتباط واشتراک منسلک نمودن۔ تا اعمال ہر ملت وجماعت با اعمال دیگر متحد ومربوط باشند۔

۴۔ یک مقصد خصوصی مجلہ خاصہ تعارف افکار وتبادل آرا است درمیان جمیع مفکرین ونظار مسئلہ اصلاح واحیاء مسلمین کہ در اقطار مختلفہ وبلاد بعیدہ منتشر اند۔ تا برائے اصلاح امت وتجدید قوام ملت یک دستور صحیح ومسلک قویم متحقق ومنضبط گردد۔

۵۔ نشر واشاعت لغت عربیہ در بلاد عجمیہ، خصوصاً در بلاد ہند و افغانستان کہ ہمیں لغت جلیلہ برائے تمام عالم اسلامی لغت دینی و علمی و بین الملی ست، وحیات ملیہ واجتماعیہ مسلمین موقوف ومنوط ست برآن۔

۶۔ احیاء علوم اسلامیہ بواسطہ بحث وتحقیق علوم ومسائل ونشر مقالات علمیہ وجمع مباحث ومعارف محققین عصر۔

(شمارہ ۱ صفحہ ۲)

ان مقاصد کی تفصیل وتشریح بھی الجامعہ کے اسی شمارے میں مقالہ افتتاحیہ کے صفحے پہ "فاتحۃ الجامعہ" کے عنوان سے کی گئی ہے۔

(ش ۱ ص ۳، ۴)

الجامعہ کس قسم کا رسالہ تھا اور اسے کن حالات سے سابقہ پڑا تھا اور اس کا کن لوگوں سے مقابلہ تھا۔ اس کا اندازہ مولانا ملیح آبادی کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"الجامعہ انقلابی پرچہ تھا۔ اس کے مضامین میں آگ بھری ہوتی تھی۔ چند ہی نمبر نکلے تھے کہ اسلامی دنیا میں آگ بھڑک اٹھی اور ہر طرف سے

شریف حسین کی طرف تھی۔ یہ دیکھ کر شریف بوکھلا گیا۔ بڑا مغرور اور مغلوب الغضب آدمی تھا۔ اپنی پوزیشن بھی بھول گیا اور اپنے سرکاری اخبار "القبلہ" میں الجامعہ کو بازاری گالیاں دینے لگا۔ القبلہ معمولی اخبار تھا لیکن اسے لکھنے والے بہرحال پڑھے لکھے لوگ تھے، لیکن الجامعہ کے خلاف اس میں جو کچھ چھپتا نہایت رکیک عربی میں ہوتا تھا۔ میں شریف کی رو تین تقریریں مکہ میں سن چکا تھا اس لئے مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ تحریریں خود شریف اپنے قلم سے لکھتا ہے، یا بول کر لکھا دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ شریف حسین مولانا ابوالکلام کو ابوالکلاب لکھا کرتا تھا۔" (ذکر آزاد ص ۲۹۹)

الجامعہ کی اشاعت کے دوران میں مولانا ملیح آبادی کو کن حالات سے گزرنا پڑا اور راہ میں کیا مشکلات پیش آئیں؟ اس سلسلے میں آگے چل کر مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"الجامعہ نکل رہا تھا کہ بمبئی کے کچھ حجازیوں نے گم نام خط لکھے کہ ہمارے بادشاہ کو گالیاں دیتے رہتے ہو، کلکتہ آکر ہم تمہیں مار ڈالیں گے — میں نے یہ خط مولانا کو دکھائے تو انہوں نے چہرہ ایسا بنا لیا جیسے نہایت خوفزدہ ہو گئے ہیں۔ چہرہ بدل لینے میں مولانا کو کمال حاصل تھا۔ پھر دہشت زدہ لہجے میں کہنے لگے: مولوی صاحب! یہ تو بہت بری بات ہوئی۔ حجازی بڑے نڈر اور اجڈ ہوتے ہیں۔ کیوں نہ اعتدال سے لکھیے؟

مولانا کے دل کی حالت میں خوب جانتا تھا۔ سمجھ گیا کہ مجھے ٹٹول رہے ہیں۔ نہ سمجھتا تو بھی وہی کہتا جو ایسے موقع پر کہنا چاہیے تھا۔ عرض کیا اس قسم کی دھمکیاں مجھ پر ذرا اثر نہیں کرتیں! یہ سنتے ہی مولانا کا چہرہ اصلی حالت پر آگیا۔ فرمانے لگے: "آپ کو آزما رہا تھا۔"

مولانا کو اس وقت کیا معلوم تھا کہ بعد میں اسی اخبار نویسی کی لمبی زندگی میں قتل کی کتنی دھمکیاں سہیں اور کئی دفعہ قاتلانہ حملوں کا بھی نشانہ بننا پڑا۔ مگر بحمداللہ اصول پر استقامت میں فرق نہ آیا۔"

(ایضاً، ص ۳۰۳-۴)

الجامعہ کی کامیابی

الجامعہ کی کامیابی اور اس کی بندش کے بارے میں مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں:

"تحریک صحیح تھی اور بر وقت۔ جلد ہی کامیاب ہو گئی۔ خلیج فارس سے مراکش تک پوری اسلامی دنیا میں شریف مکہ کے خلاف ہلچل مچ گئی۔ مگر ابن سعود انگریزوں کے خوف سے پس و پیش کر رہا تھا۔ الجامعہ نے مسلمانان ہند کے نام سے اسے ابھارا اور اس وقت کی بین الاقوامی سیاست میں واضح کر کے بتایا کہ انگریز شریف حسین کی مدد نہیں کر سکتے۔ آخر ابن سعود نے حرکت کی اور حجاز سے شریف حسین اور اس کے خاندان کو مار بھگایا۔

حرمین کی آزادی کے بعد الجامعہ کی ضرورت باقی نہ رہی اور اسے بند کر دیا گیا۔" (ایضاً، ص ۳۰۴)

مولانا ملیح آبادی کی تربیت اور الجامعہ کی رہنمائی

الجامعہ مولانا آزاد کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ پہلا نمبر شائع ہوا تو مولانا دورے پر تھے۔ مولانا ملیح آبادی ڈر رہے تھے کہ مولانا کو پرچہ شاید پسند نہ آئے۔ مولانا لاہور میں تھے کہ پرچہ ان کی نظر سے گزرا اور پسند بھی آیا۔ لاہور سے وہ ملتان گئے اور وہاں سے یہ خط تحریر کیا:

ملتان

اخ العزیز! السلام علیکم

لکھنؤ میں دستی خط ملا تھا۔ وہاں سے آگرہ آگیا، آگرہ کا قصد تھا نہ ضرورت، لیکن ایسی صورت پیش آگئی کہ گئے بغیر چارہ نہ تھا۔ وہاں سے لاہور آیا اور لاہور میں الجامعہ دیکھا۔ مجھے رسالے کی ترتیب اور مجموعی ہیئت کی طرف سے تشویش تھی، لیکن بحمداللہ کہ وہ بلا وجہ ثابت ہوئی۔ نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام آپ نے انجام دے دیا۔ البتہ طباعت کی غلطیاں اور حروف کا التباس جا بجا ہے۔ خصوصاً د اور ر کا التباس۔ اور مرکب الفاظ کے حروف کی تقدیم و تاخیر۔ آئندہ زیادہ غور کے ساتھ پروف دیکھیے گا تو غلطیاں کم رہیں گی۔

اب بڑی دقت دوسرے نمبر کی ہے۔ یہ میرا سفر گو آخری ہے لیکن قصد اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا۔ خیال تھا کہ نو، دس تک واپس پہنچ جاؤں گا لیکن اب بہ مشکل ۱۵، ۱۶ تک واپس ہو سکتا ہوں۔

نہیں معلوم ملتان سے کب رہائی ہو اور اس کے بعد لاہور میں پنجاب کا جھگڑا کب چکے۔ بڑی دقت یہ پیش آگئی ہے کہ مجھ سے پہلے پنڈت نہرو[1] اور مسٹر داس پہنچ چکے تھے وہ ایک ترتیب عمل شروع کر چکے ہیں۔ میں اس ترتیب کو اب بدل نہیں سکتا۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ فیصلے سے دور کر دینے والی۔ بہرحال ارادے سے زیادہ قیام کرنا پڑے گا۔

لکھنؤ، آگرہ اور لاہور میں بے انتہا کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح لکھنے کا موقع ملے لیکن بالکل نہیں ملا حتیٰ کہ آگرہ کے متعلق ایک مختصر بیان پریس میں دینے کی بھی مہلت نہ نکل سکی۔ لوگ کسی ترتیب و تنظیم کے عادی نہیں ہیں۔

---

[1] یہاں اشارہ پنڈت موتی لال نہرو کی طرف ہے۔ دوسرے مسٹر سی آر داس ہیں۔

رات کو ایک دو بجے سونے کی مہلت ملتی ہے اور صبح سے پھر جلسے اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ نیند کے اوقات کے مختل ہو جانے کی وجہ سے دماغ کام نہیں دیتا۔

بہرحال کوشش کر رہا ہوں کہ چند ضروری چیزیں لکھ کر بھیج دوں۔ آپ بد دل اور پریشان نہ ہوں۔ اگر مضمون نہ بھیج سکا تو مجبوراً دوسرے نمبر کی تاخیر گوارا کر لیجیے گا۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں اگر آئندہ نمبر پہلی مئی کو ڈبل نکلے۔ اس کے بعد پھر ایسی صورت پیش نہ آئے گی۔ جوں ہی یہ سفر ختم ہوا میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہوں گا۔“

مولانا ملیح آبادی فرماتے ہیں :

”مولانا کے اس خط سے مجھے واقعی خوشی ہوئی تھی۔ مولانا کا ذوق ایسا تھا کہ کسی چیز کو ان کا اچھا کہہ دینا اس کے اچھے ہونے کا ثبوت تھا۔ اخبار نویسی کے تو وہ امام ہی تھے۔ کمپوزنگ اور طباعت کی غلطیوں کا انہوں نے جو تذکرہ کیا ہے، بجا ہے، لیکن اردو طباعت میں یہ خامیاں موروثی اور فطری بن چکی ہیں۔ ان سے بچاؤ تقریباً محال ہے۔“ (ذکر آزاد۔ ص ۹۹-۲۹۵)

مولانا ابھی سفر ہی میں تھے کہ الجامعہ کا دوسرا پرچہ بھی شائع ہو گیا۔ پرچہ ان کی نظر سے گزرا تو انہوں نے محسوس کیا کہ اس میں بعض باتیں عمومی مصالح کے خلاف ہیں اور بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن سے تحریک خلافت کی طے شدہ پالیسی اور اس کے مقاصد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ”الجامعہ“ آزاد واقعۃً بھی نہیں درست نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے ایک مفصل خط ملیح آبادی کو لکھا۔ اس خط سے چوں کہ سیاسی معاملات میں مولانا کی اعتدال پسندی، سلامتی طبع اور حزم و احتیاط پر روشنی پڑتی ہے اس لیے اس خط کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مولانا کا خط یہ ہے :

لاہور۔ ۱۹/اپریل ۱۹۲۳ء

اخ العزیز ! السلام علیکم

اسی وقت آپ کا خط ملا اور اسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ نے دوسرا نمبر نکالنے کے لیے جو اہتمام کیا اس نے آپ کی مستعدی کا نقش میرے دل پر ثبت کر دیا، لیکن ساتھ ہی اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ سید رشید رضا کا مضمون آپ رسالے میں شائع کر رہے ہیں اور بالکل محسوس نہیں کرتے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے !

لکھنؤ میں جب آپ کا خط آیا اور آپ نے سید (صاحب) کے مضمون کا حال لکھا تو میں سمجھا تھا کہ انہوں نے اتحادیوں[1] کے خلاف شکایتیں کی ہوں گی اور نوٹ میں ان کا جواب دے دینا کافی ہو گا۔ اسی لیے لکھا تھا کہ کمپوز کرا لیجیے، کلکتہ آ کر دیکھوں گا اور نوٹ کے ساتھ شائع ہو جائے گا۔ لیکن اب اصل مضمون دیکھتا ہوں تو دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے۔ نہ صرف متفرنجین ترک بلکہ اثنائے جنگ کی عثمانی گورنمنٹ پر سخت الزامات لگائے ہیں، الحاد و تشریع ترکی کا ملزم ٹھہرایا ہے، حاکمیۃ ملیہ کو (جو اس وقت انگورہ کی طاقتور پارٹی ہے) ہادم خلافت بیان کیا ہے۔ جمال پاشا کے فرضی مظالم کا اعادہ ہے، نورۂ حجاز کے لیے طبیعی ہونے کا ادعا ہے اور بحیثیت مجموعی اتنی ناتمام حق گوئی بھی نہیں ہے، جتنی ”حقائق جلیہ“ وغیرہ مقالات المنار میں تھی۔ تعجب ہے کہ الجامعہ کے دوسرے نمبر میں آپ یہ مضمون شائع کر رہے ہیں اور اس نوٹ کو کافی سمجھتے ہیں جو ابتدا میں درج کیا گیا ہے۔ نوٹ میں آپ ان واقعات اور ان کے طریق استدلال کا کچھ ذکر نہیں کرتے۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ ترک اور عرب دونوں نے ایسا کیا ہے۔ اور ان کا مقصود تمام ترکوں کا عام اتحاد نہیں ہے بلکہ بعض کا۔ ہر شخص اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ الجامعہ ان کے تمام افکار سے متفق اور تمام بیان کردہ واقعات کا مصدق ہے۔ صرف عام و بعض کی توجیہ ضروری سمجھتا ہے۔ نیز ترکوں کی طرح عرب بھی اس کے نزدیک جنسیت کے ملزم ہیں۔

علاوہ بریں آپ نے لکھا ہے کہ ..... جدید مدینۂ ملعونہ سے جنسیت پیدا ہوئی۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

غور کیجیے ! اگر اس مضمون کا ترجمہ ہندوستان میں اخبارات شائع کر دیں تو مسئلہ خلافت کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا۔ جدید انقلاب خلافت کے بعد سے تمام یورپین اخبارات بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ ینگ ٹرک ملحد ہیں۔ اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اسی کی ایک شہادت آپ نے بھی دے دی۔ ایسی شہادت جس میں یہاں تک لکھا ہے کہ اباحوالمنک وکذا فجور النساء المسلمات۔ عام مسلمانوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا ؟ ہندوستان کے علماء تو پہلے سے نوجوان ترکوں کے خلاف مستعد ہو رہے ہیں۔

خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے اور یہ مضمون شائع نہ کیجیے۔ دوسرا نمبر شائع نہ ہو، مضائقہ نہیں لیکن ایک نیا فتنہ نہیں پیدا کرنا چاہیے اور نہ اباطیل واکاذیب کی اشاعت میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ کچھ فرض نہیں کہ ان کا یہی مضمون ضرور شائع ہو۔ اگر وہ پسند کریں گے

[1] ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے رکن انور پاشا وغیرہ (ملیح آبادی)

کوئی اور تحریر بھیج دیں گے، نہیں بھیجیں گے تو ان کی مرضی۔

بہرحال اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ ابتدا کا ایک فارم بدل دیا جائے اور اس میں کوئی اور مضمون دے دیا جائے۔ اگر اور کوئی مضمون نہ ہو تو پھر ایک نمبر "بحکم حل سلاح علی المسلم" کا دے دیجیے۔ اس مرتبہ میں کلکتہ پہنچ جاؤں اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہوں پھر ان مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

گاندھی جی کی تصویر پر جو الفاظ مدح و توصیف کے لکھے ہیں مثلاً "القدوۃ فی حیاتہ، طاہر الذیل، نقی القلب" یہ بھی سخت اعتراضات کا موجب ہوں گے۔ خدارا ان چیزوں میں احتیاط و حزم سے کام لیجیے۔ صرف "قائد حرکۃ ہندیہ سلمیہ" اور نام کافی ہے۔ امید ہے کہ نئے فارم میں اس کا لحاظ رہے گا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ تاخیر آپ پر بہت شاق گزرے گی لیکن کیا کروں، اس معاملے میں مجبور ہوں۔ سید رشید رضا کا مضمون کسی حال میں بھی قابل اشاعت نہیں ہے۔ یا تو لوح پر سے میرا نام الگ کر دیجیے یا یہ مضمون شائع نہ کیجیے۔

اگر فارم بدل کر رسالہ شائع نہ کر سکیں تو میرا انتظار کریں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ڈبل نمبر نکالا جائے۔ فارسی مضمون کے لیے پریشان نہ ہوں اور نہ "اسرار خودی" وغیرہ چھاپ کر رسالے کو مضحکہ خیز بنائیں۔ سب باتیں اپنے وقت پر ہو جائیں گی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ رسالے کی ضخامت دو جزو رکھی جائے۔ کم کر دی جاسکتی ہے۔

میں اس سفر میں بے طرح پھنسا، بے کار وقت گیا۔ امید ہے کہ پرسوں یعنی سنیچر کو روانہ ہو سکوں۔" (ایضاً ص ۳۰۰-۳۰۲)

میرا خیال ہے کہ مولانا ملیح آبادی نے ان باتوں پر غور کیا ہوگا اور مولانا کی رائے سے متفق ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے کہ اس کے بعد ان کا عمل ٹھیک ٹھیک مولانا کے مشورے کے مطابق نظر آتا ہے؛

۱۔ علامہ رشید رضا کے مقالے کی دوسری قسط انہوں نے شائع نہیں کی اور مولانا آزاد نے تحریک خلافت کے جن مصالح اور مقاصد کی طرف توجہ دلائی تھی اور علامہ مرحوم کے مقالے سے جنہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، اس سلسلے میں "المراسلۃ المناظرۃ" کے صفحے پر شیخ عبدالنبی (حیدر آباد) عمر رضا (ترکی) اور بیومی البحیری (الازہر، مصر) کے مراسلات شائع کیے ہیں، جن میں علامہ موصوف کے افکار پر نقد کیا گیا ہے۔

۲۔ اور جیسا کہ مولانا نے مشورہ دیا تھا کہ اگر کوئی مضمون نہ ہو تو پھر ایک نمبر "بحکم حل سلاح علی المسلم" کا دے دیجیے۔ مولانا ملیح آبادی نے اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔

۳۔ الجامعہ کے انیسویں شمارے میں جب گاندھی جی کی تصویر دوبارہ شائع کی تو اس کے کیپشن میں، اور ان کا مفصل خط جو مولانا محمد علی کے نام ہے اور اس پر اتنی ہی مفصل تمہیدی عبارت جو ادارے کی جانب سے ہے، اس کے عنوان کی عبارت میں اسی حزم و احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے جس کی مولانا نے ہدایت فرمائی تھی۔ تصویر پر گاندھی جی کے نام کے ساتھ یہ الفاظ ہیں۔

زعیم الہند المحبوب و قائد الاکبر علی حریتہ

اور خط کے متن کو اس عنوان سے زینت دی گئی ہے۔

زعیم الہند الاکبر و محب الانسانیۃ مہاتما غاندی علی حریتہ

ایک تاریخی و سیاسی علمی مجلہ

الجامعہ ایک تاریخی و سیاسی مجلہ تھا اور آج اس کی ایک مسلمہ علمی حیثیت بھی ہے۔ وہ ۱۹۲۳، ۲۴ء میں برصغیر اور بیرون ملک سیاسی تاریخ اور افکار و تحریکات قومی و ملی کا اہم ترین ماخذ ہے۔ خصوصاً تحریک خلافت اور ترک موالات کے دور آخر کے حالات اور ترکی میں قسطنطنیہ اور انقرہ کی کشمکش یا ادارۂ خلافت اور انجمن اتحاد و ترقی کے قائدین کے افکار کا مستند ترین ماخذ ہے۔ اسی طرح اندرون ملک سیاسی جدوجہد کے حالات اور سیاسی و تاریخی معلومات سے اس کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ الجامعہ نے اپنے مقاصد کے دائرے میں بہترین قومی و ملی خدمات انجام دی ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ سیاست، اصلاح و قیام ملت اور احیائے اسلام کے کاموں سے لے کر ادب و تاریخ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی اہمیت اور خدمات کا اندازہ اس کے مضامین کے انڈکس پر ایک نظر ڈال کر لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں اس کی خدمات کے تمام پہلوؤں پر تبصرہ اور ان کا تعارف ممکن نہیں۔ البتہ اس کی ایک خصوصیت کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

علامہ اقبال مرحوم کے "ترانہ ملی" نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے اس پر گفتگو تحصیل حاصل ہے۔ الجامعہ میں اس کا منظوم عربی ترجمہ چھاپا گیا اس کے شروع میں علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کی شاعری کے خصائص پر ایک جامع نوٹ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے؛

"ترانہ ملی بہترین ملی نغموں میں سے ہے۔ یہ ہندوستان کے عظیم شاعر اور مشہور فلسفی علامہ اقبال کی تخلیق ہے۔ وہ ہندوستان کی ایک بلند پایہ شخصیت ہیں اور بہترین انسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے یورپ کے جامعات میں علم حاصل کیا ہے اور

بھی علمی اسناد و شہادات حاصل کیے ہیں وہ جدید علوم میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ ابنائے وطن کے دلوں میں ان کے لیے بڑی محبت ہے۔ وہ اپنے اقران میں بلند درجے پر فائز ہیں۔ وہ شاعری میں صاحب فکر و فن شخصیت کے مالک اور ایک خاص اسلوب کے خالق ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے اسلامی زندگی کے احیا اور دینی خدمت کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔ انگلستان میں ان کے اشعار کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے، اور وہاں کے اہل علم اور اصحاب نقد و نظر نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔"

(شمارہ ۲ صفحہ ۱۹، ۲۰)

الجامعہ نے آئندہ شماروں میں علامہ مرحوم کے فارسی کلام کی اشاعت کا بھی وعدہ کیا تھا: ترانۂ ملی، کا منظوم عربی ترجمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے استاد مولانا عبدالحق حقی اعظمی بغدادی نے کیا تھا۔ مولانا عبدالحق عربی کے ادیب اور شاعر تھے۔ الجامعہ نے ان کی متعدد منظومات شائع کی ہیں۔

مولانا آزاد نے یہ بات جو لکھی کہ فارسی مضمون کے لیے پریشان نہ ہو اور نہ اسرار خودی کو چھاپ کر رسالے کو مضحکہ خیز بنائیں۔ سب باتیں اپنے وقت پر ہو جائیں گی، تو اس کا تعلق دراصل الجامعہ کے خاص مقصد سے "اسرار خودی" کی عدم مناسبت سے ہے۔ مولانا آزاد نہیں چاہتے ہوں گے کہ الجامعہ آغاز ہی میں اپنے دائرہ مقاصد سے قدم باہر نکالے۔

چند دیگر معلومات و خصائص

الجامعہ مرکزی خلافت کمیٹی کا ترجمان تھا۔ وہی اس کے اخراجات برداشت کرتی تھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کے نگراں تھے اور مضامین کی ترتیب و تالیف کے سلسلے میں ہدایات اور مشوروں سے رہنمائی فرماتے تھے۔

الجامعہ عربی میں جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے پہلے شمارے ہی میں یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ اگرچہ مقالات کا غالب حصہ عربی میں ہوگا کہ عربی زبان بین الملی عالم اسلامی است، لیکن اس کا ایک حصہ فارسی و ترکی مقالات کے لیے بھی مخصوص ہوگا۔ نیز اردو میں مضامین کی شمولیت کا عزم ظاہر کیا گیا تھا۔

- ان المجلہ ترحب بکل لغۃ من اللغات الشرقیۃ الکبیرۃ مثل الفارسیۃ
- والترکیۃ والہندیۃ۔ وستزید المقالات فی ہذہ اللغات الثلاثۃ۔

(فاتحۃ الجامعہ، ش ۱ ص ۴)

چنانچہ الجامعہ کے شائع ہوتے ہی ایک طبقے کی طرف سے اصرار ہوا کہ اس میں اردو کے صفحات بھی شامل کیے جائیں۔ اس سلسلے میں الجامعہ کے دوسرے پرچے میں ایڈیٹر (مولانا عبدالرزاق) کے قلم سے "گزارش" ہے۔ اس گزارش سے چوں کہ عربی میں اشاعت کی ضرورت اور اہمیت اور اس کے مقصد اجرا پر روشنی پڑتی ہے اور اردو حصے کی شمولیت کے لیے ایک شرط بھی بیان کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہیں۔ گزارش یہ ہے:

"ہر طرف سے خطوط آرہے ہیں کہ "الجامعہ" میں اردو کیوں نہیں رکھی گئی؟ ہم اپنے دوستوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بہت جلد اردو بھی اس میں شامل ہو جائے گی۔ جیسا کہ پہلے نمبر میں تصریح کی جا چکی ہے۔

الجامعہ سے اصلی مقصد ممالک اسلامیہ و عربیہ تک ہندوستان کی آواز پہنچانا ہے۔ غالباً یہاں کی پبلک اس حقیقت سے واقف نہیں کہ اکثر اسلامی ممالک ہندوستان کے متعلق قریب قریب اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہم چین یا ترکستان کے متعلق۔ انہیں نہ تو اس برّاعظم کی گزشتہ تاریخ معلوم ہے نہ موجودہ تحریک کی کچھ زیادہ خبر ہے۔

مدتوں سے ایک عام اتحاد اسلامی کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی، مصر میں بھی، ترکی میں بھی۔ مگر عمل کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھتا۔ کیوں؟ وجہ ظاہر ہے۔ باہم کوئی ذریعہ تعارف و تفاہم نہیں جو ہر مشترک عمل کے لیے اولین شرط ہے۔ الجامعہ یہی کمی دور کرنے کے لیے جاری ہوا ہے اور اس لیے قدرتاً اس کی زیادہ قوت عربی پر صرف ہوگی کہ وہی بین الملی اسلامی زبان ہے پھر فارسی اور اردو۔

اردو کب سے شروع ہوگی؟ اس کا جواب ہم سے نہیں، پبلک سے مانگیے۔ اگر حضرت مولانا (ابوالکلام آزاد) کی تحریرات پڑھنے کا شوق ہے، تو پھر اب انہیں فرصت دینی چاہیے اور وہ تمام شرمناک جھگڑے موقوف کر دینا چاہیے جن کے سلجھانے میں ان کا تمام قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جب تک حضرت مولانا اطمینان سے نہ بیٹھیں اس وقت تک ہم اردو فارسی کے متعلق کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔"

(ش ۲ سرورق کا صفحہ ۴)

لیکن اردو، فارسی اور ترکی میں مقالات کی شمولیت عزم کے باوجود عملاً ممکن نہ ہو سکی۔ شروع سے آخر تک الجامعہ کے تمام صفحات عربی کے لیے وقف رہے۔

الجامعہ کی سالانہ قیمت آٹھ روپے تھی۔ ابتدا میں ششماہی خریداری کا سلسلہ نہیں رکھا گیا تھا۔ لیکن نمبر ۳، ۴ (مشترکہ شمارہ) میں ششماہی خریداری کی رعایت کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ جس کی قیمت چار روپے آٹھ آنے تھی۔ ایک پرچے کی قیمت آٹھ آنے تھی لیکن شمارہ ۱۰ یا اس کی دسویں اشاعت سے فی پرچہ بارہ آنے قیمت

کردی گئی تھی:

الجامعہ البلاغ پریس کلکتہ میں چھپتا تھا۔ پریس کے منیجر قاضی نورالاسلام تھے اور ۴۵۔ رپن لین کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ ۴۵۔ رپن لین ایک وسیع و عریض کوٹھی تھی جس کے اوپر کے حصے میں مولانا آزاد رہتے تھے اور نیچے کے حصے میں البلاغ پریس اور الجامعہ کا دفتر تھا۔

الجامعہ پندرہ روزہ مجلہ تھا لیکن پندرہ روزہ الگ الگ اس کے صرف تین پرچے (نمبر ۱، ۲ و ۸) ہی نکل سکے۔ اپریل ۱۹۲۳ء سے نومبر تک اس کے پانچ شمارے دو دو نمبروں کو ملا کر شائع کیے گیے اور ایک اشاعت تین نمبروں (۵، ۶ و ۷) کی جامع تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ الجامعہ اگرچہ پندرہ روزہ مجلہ تھا لیکن عملاً ماہوار شائع ہوتا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۳ء سے دو شماروں کو ملانے کا تکلف بھی ختم کر کے اسے ماہوار کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے آخری چار شمارے (دسمبر ۱۹۲۳ء تا مارچ ۱۹۲۴ء) ماہوار نکلے۔

الجامعہ کی صرف ایک جلد ہے جو بیس شماروں پر مشتمل ہے، لیکن اشاعت کے لحاظ سے یہ صرف تیرہ نمبر ہیں۔ اس کی ابتدائی تین اشاعتوں یا چار نمبروں کے صفحات مسلسل ہیں (صفحات ۱ تا ۸۴) اور الگ الگ ہیں۔ پانچویں شمارے سے ہر اشاعت کے صفحات الگ الگ ہی ہیں اور ہر اشاعت کے صفحات کم و بیش برابر ہیں۔ مجموعی طور پر الجامعہ کی پوری جلد کے صفحات کی تعداد ۳۹۴ ہے۔ اس میں ٹائٹل کے باون (۵۲) صفحات شامل نہیں۔

الجامعہ کا پہلا نمبر اپریل ۱۹۲۳ء میں نکلا تھا اور آخری شمارہ مارچ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔ بارہ مہینوں میں صرف تیرہ پرچے نکلے اور پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

الجامعہ کی اشاعتوں، شماروں، تاریخہائے اشاعت اور صفحات کی تفصیل یہ ہے:

اشاعت	شمارہ	تاریخ اشاعت	صفحات
۱	۱	یکم اپریل ۱۹۲۳ء	۱ تا ۲۴
۲	۲	۱۵ " "	۲۵ تا ۵۲
۳	۳ + ۴	یکم و ۱۵ مئی ۱۹۲۳ء	۵۳ تا ۸۴
۴	۵ + ۶ + ۷	یکم جون تا یکم جولائی "	۳۶
۵	۸	۱۵ جولائی "	۲۴
۶	۹ + ۱۰	۳۰ جولائی و ۱۴ اگست "	۳۲
۷	۱۱ + ۱۲	۲۸ اگست و ۱۳ ستمبر "	۲ + ۳۶
۸	۱۳ + ۱۴	۲۷ ستمبر و ۱۲ اکتوبر "	۲۴
۹	۱۵ + ۱۶	۲۶ اکتوبر و ۱۰ نومبر "	۲۰
۱۰	۱۷	۱۰ دسمبر "	۳۴
۱۱	۱۸	جنوری ۱۹۲۴ء	۲۴
۱۲	۱۹	فروری "	۳۶
۱۳	۲۰	مارچ "	۴۲
		(کل صفحات)	۳۹۴

ابواب وعناوین

الجامعہ کے ابواب وعناوین الہلال و البلاغ سے ملتے جلتے ہیں، مثلاً مقالہ افتتاحیہ، شذرات، المقالات، باب التفسیر، مختارات، اقوال الجرائد العربیہ، شئون داخلیہ، العالم الاسلامی، مسئلہ خلافہ ترکیہ، المسئلۃ العربیہ، افکار و حوادث، حوادث و اخبار، المراسلۃ و المناظرۃ، مراسلات، مطبوعات جدیدہ۔ الجامعہ میں اخبار و مضامین اور مقالات کے ساتھ منظومات بھی شائع ہوتی تھیں۔

بقیہ: مولانا ابوالکلام آزاد کا تحریکِ خلافت میں حصہ

حکومت نے (۱۹۲۴ء) "خلیفۃ المسلمین" کا عہدہ ختم کر دیا تو ہندوستانی رہنماؤں میں مولانا آزاد ہی تھے، جنہوں نے اس پر رنج و غم کا اظہار نہیں کیا۔ اُن کے خیال میں خلافت کا منصب ایک فرد کی جگہ ایک جمہوری حکومت کے سپرد کیا جانا غلط نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود اس جمہوری حکومت (حکومتِ ترکی) نے منصبِ خلافت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا۔

نشاط عرفان



مولانا آزاد ـــ معاصرین کی نظر میں

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے عظیم ترین بزرگوں میں سے تھے۔ جن کے بارے میں ہر دور اور ہر زمانے میں برصغیر ہند و پاک میں بہت زیادہ لکھا گیا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور ان کے انتقال کے بعد بھی۔

ذیل میں مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی علمی وادبی اور سیاسی خدمات کے بارے میں برصغیر ہند و پاک کے ممتاز ادیبوں، مصنفوں اور دانشوروں کے خیالات و افکار کے مختصر اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کی عظمت، ان کے بے داغ کردار اور ان کی پُرخلوص خدمات کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے گا۔

مولانا کو صحیح معنی میں بین الاقوامی شہرت اور ناموری حاصل تھی۔ اسی لیے ان کے انتقال کے بعد بیرونی ممالک کے سربراہانِ مملکت اور دوسرے مشاہیر نے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس کا انتخاب بھی پیشِ خدمت ہے۔

خواجہ حسن نظامی:

سرو قد، دوہرا بدن، گورا رنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں کتابی چہرہ، سفید چھوٹی داڑھی، آواز سُریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی و ظرافت۔

دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں، مگر پیری مریدی سے زیادہ دلدادہ نہیں ہیں۔ قوم سید، پیشہ آزادی اور بے نیازی، حافظے کی قوت بے مثال، تصور کی طاقت، چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی، تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ، نازک مزاجی میں تاناشاہ، سیاست دانی میں ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔!!

بیرونِ ہند کے مسلمان میں اور امریکیوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں۔ یوروپین مورخ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو یوروپین کیوں کر ثابت کیا جائے!!!

حضرت ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں ایک ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو ..... سمجھتے بھی ہیں اور اس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں اور دوسرا ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کو مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں ـــ غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی ہوگی ـــ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک راز دار دوست سے کہا تھا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعے کرتے تھے کہ سر کرپس جواب دیتے رہ جاتے تھے۔

قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔

ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر ناہد سہروردی کے مکان پر انہوں نے حسن نظامی کو ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا:

"سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکتِ مسلم لیگ!" [1]

چراغ حسن حسرت:

میں پہلی مرتبہ شملہ میں مولانا سے ملا تھا۔ ایڈورڈ گنج میں ان کی تقریر تھی۔ تقریر ہو چکی تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن چند منٹ کی ملاقات تھی اور ملنے والوں میں ایک میں ہی نہیں تھا، بہت سے

• جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

لوگوں کا ایک وفد سا تھا۔ لوگ سوال کر رہے تھے اور وہ جواب دے رہے تھے۔ اس وقت ان کی صورت شکل کے عام انداز سے ان پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا لیکن ایسا عقاب نہیں جو محض شکاریوں کا بازیچہ ہو بلکہ ایسا عقاب جو سنگِ خارا کی چٹانوں میں آشیانہ بناتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے افسانہ نگاری کے متعلق انہیں اپنا ایک مضمون دکھایا۔ پڑھ کر کہنے لگے: "تم نے فلاں فلاں فرانسیسی قصہ نویسوں کا ذکر نہیں کیا حالاں کہ ان کے تذکرہ کے بغیر اس موضوع پر کوئی مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔" پھر افسانہ نگاری کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی اور اس سلسلے میں ایسے ایسے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر کر گئے جن کے نام ہی میں نے نہیں سنے تھے۔

پٹنہ میں بڑی دھوم سے طبی کانفرنس ہوئی۔ غالباً حکیم مسیح الملک (اجمل خاں) اس کے صدر تھے۔ چوں کہ مولانا آزاد بھی اتفاق سے وہاں (پٹنہ) موجود تھے اس لیے بعض طبیبوں نے ان سے استدعا کی کہ آپ کانفرنس میں طب یونانی کے متعلق چند کلمات کہہ دیجئے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے بھی سفارش کی۔ لیکن مولانا (ابوالکلام آزاد) تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پورے دو گھنٹے طب قدیم اور طب جدید کے نظریوں اور طریق علاج وغیرہ پر بحث کرتے رہے۔ حکیم نثار احمد صاحب نے جو کلکتہ کے مشہور طبیب ہیں اور اس اجتماع میں موجود تھے خود مجھ سے بیان کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں جو باتیں بیان فرمائیں وہ بڑے بڑے نامور طبیبوں کو بھی معلوم نہیں۔

- ان کے (مولانا ابوالکلام آزاد) والد بزرگوار مولانا خیر الدین ایک مشہور خانوادۂ طریقت سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اب بھی ان کے عقیدت مند ملک کے مختلف حصوں میں موجود ہیں لیکن مولانا ابوالکلام نے پیری مریدی سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

"مولانا پر بڑے بڑے کڑے وقت بھی آئے ہیں لیکن اس غیرت کے پتلے نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ ان کے والد بزرگوار کے مریدوں میں بہتیرے لوگ ایسے ہیں جو اپنا سب کچھ انہیں دے ڈالنے کو تیار ہیں بعض عقیدت مندوں نے جو "الہلال" کے دورِ اول سے آج تک ان کے مداح چلے آتے ہیں، کئی مرتبہ ان کی مالی اعانت کرنا چاہی لیکن انہوں نے گوارا نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے بڑی بڑی رقموں کے منی آرڈر اور چیک بھیجے جو واپس کر دیے گئے۔"

مہادیو ڈیسائی

ذہنی اعتبار سے تو مولانا کانگرس میں اپنی مثال نہیں رکھتے اور اکثر مسائل اور پالیسیوں کی تشریح اس طریق سے کرتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کانگرس میں مولانا سے بڑھ کر اور کوئی معاملہ فہم سیاست داں اور سیاسی جوڑ توڑ کرنے والی شخصیت نہیں۔ ایک دفعہ آپ ایک پوزیشن قبول کر لیں تو پھر اس کے تمام پہلوؤں کو اس وضاحت سے بیان فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کا کوئی گوشہ بھی تشنہ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی سیاسی زندگی کے انتہائی خطرناک مراحل پر ہمیشہ مولانا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ایک دفعہ میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ کی گاندھی جی سے وابستگی کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ گاندھی جی کی ذہانت کے علاوہ ان کی بے داغ سچائی نے مجھے ان کی طرف مائل کیا۔ لیکن ۱۹۲۶ء تک میں ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھتا۔ اس کے بعد ینگ انڈیا میں گاندھی جی کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا۔ جس میں انہوں نے اپنی بیوی پر ایک معمولی سی کوتاہی پر شدید گرفت کی۔ وہ آشرم میں ایک رقم جمع کرانا بھول گئی تھیں۔ اس پر مجھے خیال ہوا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جس کی سچائی کا اعتراف اس کے دشمنوں کو بھی ہونا چاہئے۔

کانگرس کے معاملات میں مولانا کی حیثیت ہمیشہ بے مثل رہی ہے۔ انہیں سالہا سال سے یہی حیثیت حاصل ہے اور رہے گی۔ مگر اس کے باوجود آپ ہمیشہ اس قسم کے عہدے قبول کرنے سے بھاگتے تھے۔ آپ اگر چاہتے تو کسی صوبائی اسمبلی یا مرکزی اسمبلی میں پارٹی لیڈر بن سکتے تھے مگر آپ ہمیشہ صاف بچ کر نکل جاتے رہے۔ آنجہانی سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے مگر آپ نے ہمیشہ نمائش اور ہنگامہ کی جگہ مشیر ہونے کو ترجیح دی۔

اگرچہ آپ انگریزی بہت کم بولتے ہیں مگر آپ کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتب سے بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کئی انگریزی شعراء کا مطالعہ کیا ہے مثلاً شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، شیلے وغیرہ مگر آپ بائرن کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یونان کی جنگ آزادی میں شریک ہو کر مارا گیا اور اس نے اپنی نظموں میں آزادیٔ افکار اور آزادیٔ عمل کی تعلیم دی ہے اور انقلابی سیاست میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ کے پاس عربی، فارسی اور ترکی کی لاتعداد کتابیں موجود ہیں جن کے ناموں سے ہمارے ملک کے اکثر عالم اور ادیب بھی ناواقف ہیں۔

بیرونی دنیا سے آپ خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ مرحوم زاغلول پاشا اور فتحی بے سے آپ کی خط و کتابت تھی۔ موخر الذکر تو آپ کے نہایت عزیز دوست تھے۔ کمال اتاترک اور ترکی کے سرکردہ قائدین سے آپ کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ ترکی کی نوجوان پارٹی کے لیڈر جنہوں نے ۱۹۰۸ء کا انقلاب کیا تھا آپ کے ذاتی دوست تھے۔ یہ پارٹی گزشتہ

جنگِ عظیم تک برسرِ اقتدار رہی۔ احمد رضا صدر ترکی پارلیمان، ڈاکٹر صلاح الدین، انور پاشا اور جاوید بے سے آپ کی دوستانہ خط و کتابت رہی ہے۔ اسی طرح ایران کا مشہور انقلاب پسند تقی زادے آپ کا بہت عزیز دوست تھا۔

کثرتِ مطالعہ اور استغراقِ کتب نے آپ کو خلوت پسند اور عزلت گزیں بنا دیا ہے۔ اگرچہ آپ بہت خلیق اور ملنسار ہیں، مگر آپ کے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اگرچہ آپ بہترین گفتگو کرنے والے ہیں مگر اکثر خاموش رہتے ہیں۔ مولانا کو نمائش، ہنگاموں اور جلوسوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ رات کے کھانے پر بہت کم ہی دعوتیں قبول کرتے ہیں۔ آپ ایک سحر بیان مقرر ہیں، آپ بڑے بڑے مجمعوں کو اپنے دلائل و براہین سے قائل کرا سکتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ عوام میں بہت کم خلط ملط ہوتے ہیں، ہاں کانگرس کمیٹی کی بحثوں میں آپ نمایاں حصہ لیتے ہیں اور آپ کی بحث ہمیشہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہوتی ہے۔[۶]

مولانا سید سلیمان ندوی

اگر ہمارے نظر بندوں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدی پر فائز ہوا تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجہ پر ممتاز ہوئی، جس عزم و استقلال، استغنا، اور قوتِ ایمانی کے ساتھ مولانا نے یہ زمانہ بسر کیا ہے وہ ائمۂ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور اعانتِ نظر بنداں کا ماہوار عطیہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عبادی الشکور کے رمز میں پنہاں ہیں۔ یہ معلوم ہوگا کہ رات کو انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بنا پر وہ نمازِ عشا کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے گوارہ نہیں کیا۔ انہوں نے حکومت سے اجازت چاہی اور جب کوئی جواب نہ ملا تو برملا اعلان کر دیا کہ فریضۂ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آ سکتے! آہ، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو آزادی کے بستر پر بھی اٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے اور ایک وہ عباد سالیس ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجد الٰہی کی یاد فراموش نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے "الہلال" اور "البلاغ" نے پیدا کیا اور جس اسلوبِ بلاغت کمال انشا پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لئے ایمان اور یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی و وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ ضرورت تھی کہ اسی موثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہو تا کہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لئے نورِ بینش اور افزائشِ بصیرت کا سر و سامان اردو میں میسر آئے۔[۷]

مولانا غلام رسول مہر

مولاناؒ نے پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی تھی تو وہ عمر کی سولہویں منزل میں تھے اور اس زمانے میں انجمن کے اسٹیج پر ممتاز اصحابِ علم و فضل کو بھی بہ مشکل بار ملتا تھا۔ یہ تقریر اتنی مسلسل، مربوط، مدلل اور عام تقریروں سے بہ ہر لحاظ اتنی مختلف تھی کہ مولانا شناءاللہ مرحوم و مغفور نے فرمایا "ہم تو تھے پسنجر ٹرین، ہمارے بعد کلکتہ میل آ رہی ہے"۔ اس زمانے میں کلکتہ میل کو رفتار کی تیزی اور ہنگامہ خیزی کے باعث تمام ٹرینوں پر بدرجہا فوقیت حاصل تھی۔ مولانا آزاد کے وطن کی نسبت سے "کلکتہ میل" کے ساتھ تشبیہ میں جو لطف تھا وہ تشریح سے بے نیاز ہے۔

یہ سنہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ تھا۔ آئندہ سال مولانا دوسری مرتبہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے (منعقدہ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء) ۲۲ اپریل کو انہوں نے تقریر فرمائی۔ اس کا موضوع تھا "اسلام زمانۂ آئندہ میں"، اس وقت مولانا سترہویں سال میں تھے۔ یہ تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ صدرِ اجلاس نے حاضرین کو خوشخبری سنائی کہ آزاد صاحب کل پھر تقریر فرمائیں گے۔ چنانچہ ۲۳ اپریل کو مولانا نے دوبارہ تقریر کی۔ انجمن کی روداد مظہر ہے کہ تقریر پر صدرِ اجلاس نے "لیکچرار کی خوش بیانی نہیں، جادو بیانی کی داد دی اور ان کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کی"۔

سترہ سال کی عمر میں مولانا کی سحر بیانی کے کرشمے آپ نے ملاحظہ فرمائے اب شہرت و اشاعت سے بے نیازی کی شان دیکھئے۔ انجمن کی روداد میں ایک جگہ مرقوم ہے: "افسوس ہے کہ باوجود متعدد تقاضوں کے آزاد صاحب نے لیکچر قلم بند کر کے نہیں دیا اور اس لئے شاملِ روداد نہیں ہو سکا"۔ دوسری جگہ لکھا ہے: "چوں کہ یہ تقریر قلم بند ہو کر نہیں ملی اس واسطے درج نہیں کی جاتی"۔ انجمن حمایت اسلام کی جس تقریر کا ذکر پہلے کیا ہے اس سے تقریباً سات سال بعد مولانا نے "الہلال" جاری کیا جس کی کوئی مثال تاریخ صحافت اردو میں نہ پہلے موجود تھی اور نہ اس کے بعد آج تک منظرِ عام پر آ سکی۔ حالاں کہ پہلے "الہلال" کے ظہور پر آج باون سال پورے ہو چکے ہیں اور دوسرے "الہلال" کی بندش پر بھی چھتیس سال گزر چکے ہیں۔

اگر اس مختصر سی مدت کے کارناموں پر سرسری نظر ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ اس میں بتانا ہوگا کہ چوبیس سال کے

اس نوجوان نے اچانک نمودار ہو کر علم و عمل اور فکر و نظر کے دائرے میں کیسے بنیادی انقلاب پیدا کر دیے! ہر گوشے پر کتنے گہرے اثرات ڈالے۔ کون سا معاملہ تھا جو مولانا کے سامنے آیا اور اس پر ایسی سیر حاصل، دل نشین اور یقین افروز بحث نہ کی گئی کہ اس بارے میں دوبارہ کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہو؟

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

۱۹۱۲ء میں "الہلال" افق کلکتہ سے طلوع ہوا اور اب مولانا کا قیام کلکتہ میں مستقل ہو چکا تھا۔ اس نے اردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی صورت و سیرت، مغز و قالب سب یک اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف اور کہیں زیادہ شاندار اور جاندار۔ چھپائی، کاغذ، تصویریں، سب کا معیار اعلیٰ۔ الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مستقل طور پر "مولانا" ہو گئے اور شہرت کے پروں پر اڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی اور مولانا کی خطابت کے جوہر بھی اسی وقت سے خوب چمکے ہر جلسے کی رونق ان کی ذات سے ہونے لگی۔ الہلال بظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی اور اس کی سیاست پر بین الملی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی۔ بات بات پر آیات قرآنی سے استدلال و استناد علمی، ادبی پہلو بھی نمایاں تھے اور فکاہی رنگ بھی کچھ کم شوخ نہ تھا۔ اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی تھی اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے دیتے ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ ذہانت، فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی کا نمایاں ترین دور یہی رہا ہے۔

جن لوگوں نے مولانا کو بہ ایں سنجیدگی و وقار ان کی زندگی کے آخری ۲۵، ۳۰ سال میں دیکھا ہے۔ وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ ۱۳ء ۱۴ء میں کیا تھے اور اس سے بھی پہلے یعنی اپنی بھرپور جوانی نہیں بلکہ آغاز جوانی کے سن میں وہ کیا تھے اسے تو سرے سے چھوڑ دیجئے (ذہانت و فطانت کا مجسمہ، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع، حاضر جوابی میں طاق، لطیفہ گوئی میں استاد۔ اسے چھیڑا اسے بنایا، اس پر فقرہ چست کیا، اسے چٹکیوں میں اڑایا۔ لوگ تنہا ملتے جلتے سامنا کرتے گھبراتے ہچکچاتے اور کنی کاٹ جاتے۔ ۱۳ء کا آخر تھا یا ۱۴ء کا شروع لکھنؤ میں کھانے پر بلانے کو تو بلا دیا لیکن فکر یہ ہوئی کہ اتنی دیر مسلسل ہدف ان حضرت کے گرما گرم فقروں کا کون بنا رہے گا؟ اپنے جوار میں ایک بڑے طرار، شوخ گفتار، طلق اللسان خوش بیان، ادیب، ظریف چودھری محمد علی ردولوی تھے بس انہیں گھیر گھار کر لے آیا گیا اور ہم تماشائیوں کو لطف مہذب و شستہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور برابر کی نوک جھونک کا آتا رہا۔ چودھری صاحب نے کہیں اپنے حلقۂ ظرافت کی اصطلاح بطور Bore چالو کی۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کی تعریف؟ چودھری صاحب بولے۔ بور مردے ست کم عقل کہ بے ارادہ دیگراں را مکلف باشد۔ مولانا نے داد دی کہ سبحان اللہ تعریف کے لئے زبان بھی آپ نے خاص غیاث اللغات کی استعمال فرمائی ہے؂

ڈاکٹر بی۔ وی کیسکر۔ سابق وزیر اطلاعات حکومت ہند

مولانا سے میری راہ و رسم کوئی بیس برس ہوئے شروع ہوئی تھی ان دنوں مولانا اور میں دونوں الہ آباد جیل میں تھے۔ میں ہر شام مولانا سے ملا کرتا تھا کیوں کہ ان کی ملاقات اور مختلف موضوعات پر گفتگو فکر و نظر کو جلا بخشتی تھی۔ وہ دنیا کے عظیم اسکالروں میں سے تھے وہ بہت بڑے عالم تھے لیکن عجز و انکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں نے ان کی میز پر فرانسیسی زبان کی بہت سی کتابیں دیکھیں۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آیا انہیں فرانسیسی ادب سے دلچسپی ہے اور کیا وہ یہ زبان اچھی طرح جانتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: بس معمولی شد بد ہے! بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے بہت بڑے عالم ہیں اور فرانسیسی ادب سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔ وہ عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور فرانسیسی کے عظیم اسکالر تھے؂

خواجہ غلام السیدین

"مولانا آزاد نے شعوری طور پر اور نہایت سلیقے کے ساتھ اپنی خودی کی تعمیر کی تھی۔ وراثت میں سیرت اور دل و دماغ کا بیش بہا خزانہ پایا تھا۔ بزرگوں کی تربیت سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور پھر اپنی ذاتی اپج اور انفرادیت کے طفیل ہر معاملے میں اپنی ایک ذاتی راہ نکالی تھی اور باوجود وراثت اور صحبت کے اثرات قبول کرنے کے ان کو تمام و کمال اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ زندگی بھر اپنے ہی بنائے راستے پر چلتے رہے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی تربیت دیتے رہے۔ ایمان کو بھی انہوں نے بطور ایک عطیہ خداداد کے نہیں پایا بلکہ اس کے حصول کی راہ میں شک و شبہے کے بہت سے خارزاروں میں سے گزرے اور اس تک طلب سعی اور فکر سخت جد و جہد اور آزمائشوں کے بعد پہنچے"

انہوں نے ملک کی سیاسی جد و جہد میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا اور قومی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ پیش آئے جس میں انہوں نے گاندھی جی اور نہرو کے دوش بدوش انقلابی قیادت کا فرض انجا

دیا۔ تیسری طرف ان کی تقریریں اور تحریریں اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں اور عرصۂ دراز تک رکھیں گی۔ وہ لفظوں کا جادو وہ عبارت کا دروبست، وہ فصاحت جو ابتدائی دور میں شوکت الفاظ سے معمور رہتی تھی اور آخری دور میں اپنی سلاست اور زور بیان سے جادو جگاتی تھی۔ پوری تحریر کو ضبط تحریر میں لائیں تو معلوم ہوگا کہ ادب عالیہ میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

ان کی ذات میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں۔ ایک اصول پرستی جس کا تقاضہ ہے کہ انسان جس بات کو صحیح سمجھے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے اور دوسری جرأت کا کسی خوف یا لالچ یا نام نہاد "مصلحت" سے مت ترنہ ہو۔ دراصل خوف تو ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کا یا تو حساب صاف نہ ہو یا جو اپنے یقین اور اصول کی قیمت ادا کرنے کو تیار نہ ہوں۔ لیکن مولانا کا حساب زندگی ہمیشہ صاف رہا اور کبھی نہ خواہش انعام ہوئی نہ ستائش کی تمنا۔ کوئی خطاب قبول نہیں کیا۔ سنتا ہوں کہ جب بھارت رتن نے دروازے پر دستک دی تو انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ دیکھا کہ اعزازی ڈگریوں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ "اگر کوئی ادارہ یا جماعت ان کے نام پر کسی عمارت یا درس گاہ وغیرہ کا نام رکھنا چاہے تو بغیر ان سے دریافت کئے باسلوب مناسب معذرت کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میں جب تک وزیر تعلیم ہوں اس قسم کی کوئی چیز کی جائے۔" جرأت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی گاندھی جی یا جواہر لال سے اختلاف ہوتا تو اس کو کھلم کھلا ان کے سامنے مضبوطی کے ساتھ ظاہر کرتے برخلاف ان لوگوں کے جو سامنے تائید اور پیٹھ پیچھے مخالفت کرتے تھے۔ اصول پرستی کا ایک قصہ سن لیجئے: ایک صوبہ کی طرف سے پارلیمنٹ کے الیکشن کے لئے ایک امیدوار کا نام بہت اصرار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ان کے پاس صوبہ کانگرس کمیٹی کی طرف سے وفد آیا تار اور ٹیلی فون آئے۔ ان کے اپنے ساتھیوں اور وزیروں نے سفارش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ "اس شخص نے اناج کی ذخیرہ اندوزی کی اس وقت جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ میں کسی طرح اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوں کہ اس کو کانگرس کا ٹکٹ دیا جائے۔" زندگی ایسی پاک و صاف گزری کہ جب پیدا کرنے والے نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تو بینک میں اتنا روپیہ نہ تھا کہ موٹر خریدنے کے لئے حکومت سے جو رقم لی تھی اس کو ادا کیا جا سکے! میں نے بحیثیت ان کے جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے آٹھ سال سے زیادہ ان کے ساتھ کام کیا اور انہوں نے کبھی کسی امیدوار کے تقرر یا ترقی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی۔ کوئی سفارش نہیں کی: "یہ تمہارا کام ہے کہ تم قاعدہ اور اصول کے مطابق فیصلہ کرو۔"

پروفیسر آل احمد سرور

مولانا آزاد کی بنیادی حیثیت ایک مفکر کی ہے۔ مفکر خلوت پسند ہوتا ہے۔ فکر اپنے اظہار کے لئے علمی اصطلاحات لانے پر مجبور ہے۔ مولانا کے یہاں عربی کی اصطلاحات اسی وجہ سے ہیں۔ پھر مولانا ایک بہت بڑے خطیب بھی ہیں، خطابت کے لئے رجز یہ لہجہ ضروری ہے اور سید عبداللہ نے الہلال کے مضامین کو رجز غلط نہیں کہا ہے پھر مولانا ایک عظیم صحافی ہیں اور صحافت ہنگامی واقعات کو بھی آفاقی رنگ دینے پر مجبور ہے۔ ان اشاروں کی مدد سے الہلال اور البلاغ کے مصنف کا کارنامہ سمجھ میں آجائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ نثر سرسید اور حالی کی سادہ نثر سے مختلف ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ نثر کا بہترین نمونہ نہیں ہے مگر اس میں علمی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی موضوعات کو خطیبانہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جلال ہے جس میں دلیری و قاہری ملے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک پیمبرانہ انداز ہے جو حق اور باطل، سود و زیاں، نور و ظلمت صراط مستقیم اور ضلالت کی نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورہ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے حکیمانہ نکتہ سنجی کے ساتھ کہیں کہیں شاعرانہ شوخی سے بھی کام لیتی ہے تاکہ حکمت بوجھ نہ معلوم ہو بلکہ باعث کشش نظر آئے۔ ترجمان کی نثر کو ہم غالب کے درمیانی دور کی شاعری کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ غالب کی انفرادیت اس دور میں، رنگ بہار ایجاد بیدل کی مرہون منت نہیں رہی، اس نے اپنی راہ پالی ہے۔ مولانا کی حکمت اب خطابت کے طوفان نہیں اٹھاتی ہاں شعریت کی ہلکی سی موجیں ضرور پیدا کرتی ہے۔ موضوع کی رعایت سے انداز بیان علمی ہے مگر اس میں علم کی خشکی نہیں ایک جمالیاتی حسن ہے جس کی وجہ سے ایک رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔ مفکر کو اظہار خیال کے لئے وسیع میدان ملا ہے مگر مفکر ذوق جمال رکھتا ہے اس لئے فکر کے پہاڑ نہیں لڑھکاتا ہاں اس کی آب و تاب دکھاتا ہے۔ یہاں صحافت نہیں ہے کہ طوفانی کیفیت پیدا کر دے یہاں ازلی اور ابدی صداقتوں کی تشریح ہے جن کے لئے حکیمانہ اسلوب کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نے اس طرح اردو نثر کو برگزیدگی عطا کی ہے۔ سجاد انصاری نے جب کہا تھا کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس کے لئے ابوالکلام کی نثر منتخب کی جاتی تو ان کا اشارہ اس برگزیدگی کی طرف تھا۔

جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے سوز دروں اور عجم کے حسن طبیعت دونوں کو اردو میں سمو لینا

اور اردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی نثر سے یہ کام ختم ہوگیا اور اقبال کی نظم سے۔ اب اردو نثر کی ترقی کے لئے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی سے ہی لئے جاسکتے ہیں مگر ابھی اردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہوگئے ان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا اس وجہ سے ابوالکلام آزاد کے جوشش قدح سے ادب میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔"

بیرونی ممالک کے مشاہیر کا خراجِ عقیدت

مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر

آہ! روشنی کا مینار اور عزم و حوصلہ کا سرچشمہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ہم اہل مشرق اپنی تاریک راہوں کو کس طرح چراغ سے روشن کرسکیں گے اور مغرب کی سامراجی قوتوں سے کس طرح اپنا لوہا منوا سکیں گے۔

مصر ۱۹۵۶ء کے نہر سوئیز کے معرکہ میں اپنی کامیابی پر سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام کا شکر گزار ہے۔

وہ عرب اور ایشیائی اقوام کی آزادی کے سب سے بڑے علم بردار تھے، عرب دنیا اور ایشیا نے گوشتہ پچاس سال میں جو کچھ حاصل کیا وہ مولانا ابوالکلام کی سعی مشکور کا ہی نتیجہ ہے۔ ہندوستان کے اس غم میں ہم اہل مصر اور اہل عرب پوری طرح شریک ہیں۔

میکمیلن (سابق وزیر اعظم برطانیہ)

"میں جانتا ہوں کہ دنیا بھر کے وہ تمام لوگ جو مولانا آزاد کو جانتے ہیں ان کے مشورے اور دوستی سے محروم ہونے کو بہت محسوس کریں گے۔"

عصمت انونو (سابق صدر ترکی)

ترک عوام انہیں نہیں بھلا سکتے۔ جنگ بلقان اور پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء) کے موقع پر ایشیا کے وہ واحد شخص تھے جنہوں نے نہایت دلیری اور بے باکی کے ساتھ ترکوں کی حمایت کی اور اس حق گوئی کی پاداش میں انگریزوں کی قید و بند کی سختیاں برداشت کیں وہ ترک عوام کو اتنے عزیز تھے کہ ایک بار انہیں ترکی میں آکر قیام کرنے اور ترکوں کی رہنمائی کرنے کی دعوت تک دی گئی۔

ترکی اپنی آزادی اور بقا کی جدوجہد میں ان کی حمایت کو ہمیشہ قدر و احترام کی نظر سے دیکھتا رہے گا۔ ان کی وفات سے ہمیں بھی اتنا ہی صدمہ پہنچا ہے جتنا اہل ہند کو۔

ظاہر شاہ (سابق شاہ افغانستان)

"مولانا مرحوم مشرقی ممالک کے تعلقی افق کے نمایاں ستارے تھے۔ مولانا آزاد کی وفات سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ یہ نقصان ہندوستان کے دوستوں اور علم کے شیدائیوں کے سے بھی بڑا نقصان ہے۔"

سکندر مرزا (سابق صدر پاکستان)

"اسلامی ادیب و عالم کی حیثیت سے ان کا مقابلہ چند ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے انسان تھے۔"

سردار محمد داؤد خاں (سابق وزیر اعظم افغانستان)

"مولانا ابوالکلام آزاد بہت بڑے سیاست داں اور سرکردہ دانشور تھے۔"

حکومت روس کا تعزیتی بیان

"مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کا غم ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ روس کے عوام کو بھی ہے۔ وہ ایسے مجاہد تھے جنہوں نے دنیا کی سب سے بڑی استبدادی قوت برطانیہ عظمیٰ کے خلاف سب سے پہلے علم جہاد بلند کیا اور ظالم کے خلاف مظلوموں کی صف بندی کی۔

انقلاب روس کے رہنماؤں نے ان کی پرجوش جدوجہد آزادی سے بہت زیادہ حوصلہ پایا تھا۔ روس میں انقلاب کی کامیابی ان کی صدائے انقلاب کی بھی رہین منت ہے۔ روس کے عوام اس عظیم انسان کو سلام کرتے ہیں۔

حکومت چین کی تعزیت

"چین کے عوام کے لئے آج صدمہ کا دن ہے۔ وہ اپنے ایسے ہمدرد سے محروم ہوگئے ہیں جس نے ہر مشکل وقت میں ان کی حمایت کی۔

چین پر جاپان کی جارحیت کے خلاف انہوں نے بحیثیت صدر کانگرس آواز بلند کی۔ انقلاب چین کی انہوں نے پرزور حمایت کی۔ اقوام متحدہ کے ادارہ، یونیسکو میں انہوں نے سب سے پہلے چین کی نمائندگی کی آواز اٹھائی۔

ہمارے سر اس عظیم انقلابی اور عوام کے دوست کے سامنے خمیدہ ہیں۔"

ہیکل (مشہور عرب مصنف)

"علم آج سیہ پوش اور ماتم کناں ہے۔ علم کا شہسوار مرگیا ہے اب دل و دماغ کی تشنگی کہاں سے بجھائی جائے گی!
آہ! دنیا پر کیا اس سے بڑا بھی کوئی سانحہ گزرا ہے؟"

برٹرینڈ رسل (مشہور برطانوی فلسفی)

"یہ خبر سن کر (مولانا ابوالکلام کی وفات کی خبر) مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں یکہ و تنہا رہ گیا ہوں، جیسے وہ دریا خشک ہوگیا جس کی موجوں سے میں ذہنی اور فکری سرور حاصل ہوجایا کرتا تھا۔
فیثا غورث، سقراط اور ہیگل کے بعد شاید سب سے بڑے انسان کی موت ہے۔"

سابق وزیر تعلیم مصر

"مولانا ابوالکلام کی جدائی ساری دنیا کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔"

ٹائن بی (مشہور برطانوی مورخ)

"تاریخ کی گتھیاں سلجھانے والا ہاتھ شل ہوگیا۔ ماضی حال اور مستقبل پر دور تک نظر رکھنے والا چلا گیا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا ایک ایسی روشنی سے محروم ہوگئی جس سے انسانی تاریخ کی پُرپیچ اور تاریک راہوں کا سراغ لگانا ممکن ہوجاتا تھا۔"

پروفیسر فواد کبیر (ترکی کے مشہور عالم)

"مولانا آزاد مشرق و مغرب کے ثقافتی علوم کا خزانہ تھے اور جنگ آزادی کے ہیرو۔"

حوالہ جات

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے برصغیر ہند و پاک کے بارے میں کہا تھا؟ (مرتبہ: ڈاکٹر احمد حسین کمال) صفحات،
۳۔ ایضاً، صفحات
۴۔ ابوالکلام آزاد (مرتبہ: عبداللہ بٹ) صفحات ۸۷ تا ۹۱
۵۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال کی سابقہ کتاب، صفحات
۶۔ ماہنامہ رسالہ جامعہ مارچ ۱۹۶۳ء (مولانا آزاد کی شخصیت کی چند جھلکیاں) صفحات: ۲۲ تا ۲۵
۷۔ اردو کا ادیبِ اعظم (از مولانا عبدالماجد دریابادی) صفحات: ۵ تا ۱۸
۸۔ ڈاکٹر احمد حسین کمال کی گزشتہ کتاب: صفحہ ۳۵
۱۰۔ ماہنامہ صبح (دہلی) آزاد نمبر (مدیر: عبداللطیف اعظمی) صفحات: ۶۵ تا ۶۸
۱۳۔ ماہنامہ جامعہ (دہلی) اپریل ۱۹۶۱ء (اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد) صفحات: ۱۹۹ تا ۲۰۱

بقیہ: نقشِ آزاد

خیالات کی اردو میں ترجمانی کی گئی ہے جو اس جلیل الشان عالم و مدبر کے ذکرِ دوام کو جریدۂ عالم میں ثبت کرنے کی تمنا میں پیش کیے گئے ہیں جس نے اپنی بیش بہا زندگی ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ ہم سب پروفیسر ہمایوں کبیر کے رہینِ منت ہیں جنہوں نے اس غرض کی تکمیل کے لیے فضلائے روزگار کا اس قدر دلکش انتخاب کیا۔ (مترجم)

انگریزی مجموعہ مضامین
Maulana Abul Kalam Azad--A Memorial Volume, Edited by Prof. Humayun Kabir.
کا اردو ترجمہ۔

بقیہ: مولانا آزاد بحیثیت صحافی

یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے۔ جو روزِ اول سے ان سے منسوب رہی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی بڑی قربانی دی۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کرکے، وہ اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہوگیا ہوتا۔

محمد ضیاء الدین انصاری

نقشِ آزاد (ببلیوگرافی)

اس اشاریہ میں مولانا آزاد کی تصانیف، اُن کے مضامین، مکاتیب اور خطبات وغیرہ کے مجموعے اور منتخبات نیز مولانا آزاد پر کتابیں اور رسائل کے خصوصی شمارے شامل ہیں:

کتبِ آزاد

۱۔ آزادی کی کہانی خود آزاد کی زبانی، بہ روایت ملیح آبادی۔ دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۸ء، ۴۲۴ ص

۲۔ آزادیٔ ہند، ترجمہ رئیس احمد جعفری۔ لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۵۹ء، ۵۰۰ ص۔ مولانا کی انگریزی تالیف INDIA WINS FREEDOM کا اردو ترجمہ۔ اس میں ترجمہ کم، تنقید و تبصرہ زیادہ ہے۔

۳۔ اتحادِ اسلامی۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (بت)۔ مولانا کی ایک تقریر جو قومی دارالاشاعت سے پانچ بار شایع ہوئی۔

۴۔ اسلام کا نظریۂ جنگ؛ مرتبہ ابن راعی۔ لاہور، بساطِ ادب، ۱۹۶۵ء، ۲۰۵ ص

" " " دوسری بار۔ دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۰ء، ۲۰۵ ص

"مولانا محترم نے جور و استبداد اور ظلم و ستم یا غیر اسلامی حکومت میں صحت مند انقلاب کے محرکات، اس کی ضرورت، طریق کار، جنگ کی ضرورت، اس کا صحیح اسلامی تصور، جنگ اور جہاد اسلامی میں فرق۔۔۔ گویا کہ جنگ کے موضوع پر مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں قرآن و احادیث کے حوالہ جات سے مختلف مقالات میں جس طرح اظہار خیال فرمایا ہے اسے ترتیب دے کر کتاب کی صورت دی گئی ہے۔"

۵۔ اصحابِ کہف۔ لاہور، ادبستان (بت) ۲۱۵ ص۔

" بار دوم " " " ۱۴۴ ص۔

مندرجات۔ اصحاب کہف۔ ص ۷۔ ۳۲ (۲) ذوالقرنین۔ ص ۳۳۔ ۱۴۴

۶۔ اعلان الحق۔ کلکتہ، عثمانی پریس ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء، ۱۶ ص

"جسے محض احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے خاکسار ابوالکلام آزاد دہلوی نے تالیف کیا جس میں ہلال رمضان کے متعلق تین ضروری بحثیں نہایت تحقیق کے ساتھ کی گئی ہیں۔"

۷۔ البیرونی اور جغرافیۂ عالم۔ نئی دہلی، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۸۰ء، ۱۱۲ ص۔ مع تقدیم و تحشیہ ضیاء الحسن فاروقی و مسیح الحسن۔

۸۔ التبلیغ۔ کراچی، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان (بت) ۴۲ ص۔

"جمعیۃ اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں کی گئی ایک اہم تقریر۔۔۔ اس تقریر میں مولانا نے تبلیغ کے پہلوؤں پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے، یہ اُن ہی کا حصہ تھا۔ نیز انہوں نے اس تقریر میں یورپ کے ذہنی انقلاب، ان کے معاشرتی مسائل اور موجودہ ذہنی و فکری رجحان پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ اور جس انداز میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی ضرورت واضح کی ہے، علمائے کرام کو اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔"

۹۔ السیدہ فاطمہ بنت عبداللہ۔ (مع دعوتِ حق)۔ لاہور، شمیم بک ڈپو (بت) ۷۱ ص

۱۰۔ ام الکتاب یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ۔ لاہور، مکتبۂ احباب (بت) ۴۳۶ ص

۱۱۔ باقیاتِ ترجمان القرآن، مرتبہ غلام رسول مہر۔ دہلی، اشاعت الکتاب، ۱۹۶۲ء، ۱۱۰ ص

"ترجمان القرآن کی تیسری جلد کی مختلف سورتوں اور آیتوں کا ترجمہ مع تفسیر و تشریح جو تمام تر مولانا ابوالکلام مرحوم و مغفور کی تحریرات و تصریحات پر مشتمل ہے۔"

۱۲۔ بائیکاٹ۔ (یورپین اشیاء کے بائیکاٹ پر مضمون) میرٹھ، قومی دارالاشاعت ۱۹۲۱ء

۱۳۔ پردہ قید کی علامت ہے یا آزادی کی ضمانت ۔ لاہور، شمیم بک ڈپو (ب ت) ۸۷ص

۱۴۔ تاریخی شخصیتیں ۔ لاہور، ابوالکلام اکیڈمی، ۱۹۵۹ء ۲۱۰ص

مندرجات۔ (۱) حکایت برق وخرمن ۔ص ۹-۱۸

(۲) جمال الدین افغانی ۔ ص ۱۹ - ۳۰

(۳) جان جاک روسو ۔ص ۳۱ - ۶۴

(۴) نپولین ۔ ص ۶۵ - ۸۶

(۵) رستم بن رضا ۔ ص ۸۷ - ۱۰۰

(۶) مدحت پاشا ۔ ص ۱۰۱ - ۱۷۰

(۷) مصطفیٰ فاضل پاشا ۔ص ۱۷۱ - ۲۰۰

(۸) سعد پاشا زاغلول ۔ص ۲۰۱ - ۲۳۸

(۹) والٹیر ۔ ص ۲۳۹ - ۲۶۰

۱۵۔ تحریک نظم جماعت ؛ مولفہ و مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری ۔ دہلی، نذیر سنز، ۱۹۷۸ء

۱۶۔ تذکرہ ۔ مرتبہ فضل الدین احمد مرزا ۔ کلکتہ، البلاغ پریس (۱۹۱۹) ۳۱۷ص

" " لاہور، مکتبہ میری لائبریری ۱۹۶۰ء ۳۴۴ص

" " لاہور، کتاب محل (ب ت) ۳۴۰ص

" مرتبہ مالک رام نئی دہلی، ساہتیہ اکاڈمی ۱۹۶۸ء ۴۲۵ص

" " بار دوم " " ۱۹۸۵ء ۴۲۵ص

(مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان کے بعض اکابر و شیوخ کے سوانح و حالات)

۱۷۔ تربیت عسکری اور قرآن حکیم ۔ لاہور، شمیم بک ڈپو (ب ت) ۷۹ص

۱۸۔ ترجمان القرآن ۔ جلد ۱ (مع تفسیر سورہ فاتحہ) دہلی، جید برقی پریس، ۱۹۳۱ء ۴۴۵ص

جلد ۲ لاہور، مطبع مصطفائی ب ت ۴۴۵ص

مندرجات ۔ ج ۱ ۔ سورہ فاتحہ تا سورہ انعام ۔

ج ۲ ۔ سورہ اعراف تا سورہ مومنون ۔

۱۹۔ ترجمان القرآن ۔ مع پیش لفظ از ڈاکٹر ذاکر حسین ۔

ج ۱ ۔ (سورہ فاتحہ مع حواشی) نئی دہلی، ساہتیہ اکاڈمی، ۱۹۶۴ء ۵۴+۲۰۵ص

دوسری بار " " ۱۹۷۶ء ۵۵+۲۰۴ص

تیسری بار " " ۱۹۸۰ء ۵۵+۲۰۴ص

ج ۲ (سورہ بقرہ تا سورہ انعام) " " ۱۹۶۶ء ۸۱+۸۸۴ص

دوسری بار " " ۱۹۷۶ء ۸۱+۸۸۴ص

تیسری بار نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی ۱۹۸۰ء ۸۱+۸۸۴ص

ترجمان القرآن ج ۳ (سورہ اعراف تا سورہ یوسف) نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۸ء - ۵۵ + ۹۰۴ + ۲۵

دوسری بار " " ۱۹۷۷ء "

تیسری بار " " ۱۹۸۰ء "

ج ۴ (سورہ الرعد تا سورہ النور) " " ۱۹۷۱ء ۹۱+۱۰۴۲+۴۰

دوسری بار " " ۱۹۷۷ء "

تیسری بار " " ۱۹۸۰ء "

۲۰۔ تفسیر پارۂ الٓم لاہور، شمیم بک ڈپو ۲۲، فروری ۱۹۵۸ء ۶۴ص

دوسرا ایڈیشن " " (۱۲، مئی) ۱۹۵۸ء ۶۴ص

۲۱۔ تفسیر پارہ سیقول " " (۲۱، فروری) ۱۹۵۸ء ۶۴ص

۲۲۔ تفسیر پارہ تلک الرسل " " (ب ت) ۸۰ص

۲۳۔ تفسیر پارہ لن تنالوا " " (ب ت) ۶۴ص

۲۴۔ تفسیر پارہ والمحصنٰت " " (ب ت) ۶۴ص

۲۵۔ جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد، مرتبہ انور عارف، کراچی، مکتبہ ماحول ۱۹۶۰ء ۴۴ص دہلی، نیو تاج آفس (ب ت) ۱۱۱ص

(اس میں ادلۂ شرعیہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اذن سے غیر مسلم کا مسجد میں داخل ہونا جائز ہے اور مساجد کی مجالس میں ان کو شریک کیا جا سکتا ہے۔ ضمناً حقوق و آداب مساجد اور بعض دیگر مسایل بھی زیر بحث آگئے ہیں)

۲۶۔ جہاد اور اسلام ۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (ب ت) ۶۲ص

دہلی، شاہد اکیڈمی ۷۲ص

(مسئلہ جہاد پر فلسفیانہ اور محققانہ مضمون ۔ جہاد کے معنی اور اس کی تشریح، غیر مسلموں سے تعلقات، قربانی کی غرض و غایت، عید الضحیٰ، اسوۂ ابراہیمی، حقیقت اسلامیہ، جہاد فی سبیل اللہ کی تفصیل تمام و کمال احادیث و کلام مجید سے)

۲۷۔ حضرت یوسف علیہ السلام ۔ لاہور، ادبستان، ۱۹۵۵ء ۲۱۵ص

۲۸۔ حقیقۃ الصلوٰۃ ۔ بنارس، دارالکتب، ب ت ۸۰ص

یہ طویل مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے جس کے عنوانات حسب ذیل ہیں :

(۱) غرض و غایت نماز ۔ ص ۱ - ۳۳ (۲) فلسفہ حقیقت نماز ۔ ص ۳۴ - ۶۵ (۳) نماز قصر بحالت امن و راحت ص ۶۶ - ۷۷ ۔ (۴) روح نماز اور اس کا فقدان ۔ ص ۷۷ - ۸۰

۲۹۔ حیات سرمد ۔ لکھنؤ، تنویر پبلشرز ب ت ۲۶ص

۳۰۔ خصائص محمدیہ ۔

• ایک قلمی رسالہ جلال الدین سیوطی کا انیس اللبیب فی خصائص الحبیب ا ہے۔ یہ مختصر رسالہ ہے جس کو بعد مطوّل و مشرح دو جلدوں میں لکھا تو خصائص کبریٰ کے نام سے مشہور ہے اور دائرۃ المعارف حیدرآباد میں چھپ گیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ المرحوم کی کتابوں میں تھا۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا اور ان ہی عبدالرحمٰن کو دیا چنانچہ وہ انہوں نے خصائص محمدیہ کے نام سے چھاپ کر شایع کر دیا ہے[1]۔

۳۱۔ خطبات سیاسیہ او مساجد اسلامیہ۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (ب ت) ۴۴ ص

• ۱۹۱۳ء میں لاہور کی شاہی مسجد کی انتظامیہ کمیٹی نے ایک رزولیوشن پاس کیا تھا کہ سیاسی جلسے مسجد میں نہ ہوں جس کے اوپر حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے ایک زبردست مضمون شایع فرمایا تھا کہ دکھلایا تھا کہ مساجد کی حقیقت کیا ہے اور ان میں سیاسی تقریریں ہو سکتی ہیں!

۳۲۔ خطبۂ صدارت انڈین نیشنل کانگریس اسپیشل سیشن ۱۵ ستمبر ۱۹۲۳ء۔ علی گڑھ، جامعہ پریس (ب ت) ۲۶ ص۔

۳۳۔ خطبۂ صدارت انڈین نیشنل کانگریس۔ ترپنواں (۵۳) اجلاس رام گڑھ ۱۹۴۰ء۔ رام گڑھ۔ مجلس استقبالیہ ۱۹۴۰ء۔ ۴۰ ص

۳۴۔ خطبۂ صدارت تحریری جلسہ جمعیۃ علماء لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (ب ت) ۵۶ ص

۳۵۔ خطبۂ صدارت تقریری جلسہ جمعیۃ علماء۔ لاہور، ۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء۔ میرٹھ قومی دارالاشاعت (ب ت) ۴۰ ص

۳۶۔ خلافت (مسئلہ خلافت اول)۔ لاہور، شمیم بک ڈپو (ب ت) ۸۰ ص

۳۷۔ داستان کربلا؛ مرتبہ محمد عبدالرحمٰن سعید۔ کراچی، نفیس اکیڈمی ۱۹۵۷ء۔ ۲۲۸ ص

۳۸۔ درس وفا۔ دہلی، عثمانیہ کتب خانہ (ب ت) ۹۲ ص

۳۹۔ دعوت حق۔ دہلی، نیا کتاب گھر (ب ت) ۹۴ ص

دوسری مرتبہ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (ب ت) ۸۴ ص

تاریخ عہد عباسیہ کا ایک صفحہ، مناظرہ دربار مامون الرشید، مناظرہ کا اہتمام اور ہیبت و اجلال دربار۔ ایوان دربار میں صاعقۂ حق کی پہلی گرج اور مامون کی محویت۔"

۴۰۔ دعوت عمل۔ تیسری مرتبہ میرٹھ، قومی دارالاشاعت ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء ۴۴ ص

یکم جولائی ۱۹۱۴ء کو الہلال میں شائع شدہ ایک مضمون۔

۴۱۔ ذکریٰ علی گڑھ، شرکت ادبیہ ۱۹۲۵ء ۸۶ ص

حضور اقدسؐ کی سیرت مبارکہ اور آپ کی تعلیمات سے متعلق دو مضامین جو ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے تحریر کیے گئے تھے۔ جو البلاغ کے شمارہ ۶۔۷ اور ۱۳۔۱۴ میں پہلی بار شایع ہوئے تھے۔

مندرجات: (۱) تذکار مقدس۔ ص ۱۔ ۶۰ (۲) افسانۂ ہجر و وصال ص ۶۱۔ ۸۳

۴۲۔ ذوالقرنین۔ لاہور، شمیم بک ڈپو (ب ت) ۷۹ ص

۴۳۔ رسول رحمت۔ دہلی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۲ء ۶۹۹ ص

سیرت طیبہ پر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالات بہ ترتیب و اضافۂ مطالب از غلام رسول مہر۔

۴۴۔ رسول عربی لاہور، مکتبۂ عظمت (ب ت) ۲۵۲ ص

۴۵۔ شہید اعظم۔ دہلی، ادارہ اشاعت القرآن ۱۹۲۷ء ۹۶ ص

بار پنجم دہلی، شاہی کتب خانہ (ب ت) ۸۰ ص

بار ششم " " ۸۰ ص

" تاج پبلشرز ۱۹۷۷ء ۷۲ ص

سیدنا حضرت امام حسین کی شہادت عظمیٰ کے مستند تاریخی واقعات اور اسوۂ حسینہ۔

۴۶۔ عیسائیت کا مسئلہ۔ کراچی، ادارۂ فروغ ادب ۱۹۶۴ء ۱۱۲ ص

۴۷۔ غبار خاطر۔ لاہور، آزاد ہند پبلیکیشنز ۱۹۴۶ء ۳۳۷ ص

لاہور، انارکلی کتاب گھر ۱۹۴۶ء ۲۹۶ ص

لاہور، مکتبۂ احرار (۱۹۴۷ء) ۳۳۷ ص

دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس (ب ت) ۲۹۲ ص

لاہور، مکتبۂ میری لائبریری ۱۹۶۲ء ۲۸۸ ص

مرتبہ مالک رام۔ نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۷ء ۱۰۔ ۴۱ ص

" دوسری بار " " ۱۹۸۳ء ۴۳۵ ص

"قلعۂ احمد نگر کی اسیری از ۹ / اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵ / جون ۱۹۴۵ء کے زمانے کی بعض تحریرات"

مالک رام صاحب نے ابتدا میں ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جس میں مولانا آزاد اور غبار خاطر کے مکتوب الیہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے سوانح بیان کیے ہیں اور دونوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے، نیز غبار خاطر کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کے آخر میں متعدد اشاریے شامل کیے ہیں اور سب سے زیادہ اہم کام یہ کیا ہے کہ مولانا نے ان خطوط میں جو سیکڑوں اشعار نقل کیے ہیں، ان کی تخریج کی ہے۔

۴۸۔ فلسفۂ اصول و مبادی کی روشنی میں۔ مترجمہ محمد وارث کامل، لاہور، چٹان

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۷۰۔ ۲۷۱

ب ت ۱۱۲ص

دہلی، چمن بک ڈپو ب ت ۱۱۲ص

"مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۷ء میں بمقام دہلی ایک ایجوکیشنل کانفرنس طلب کی تھی جس میں آپ نے فلسفہ کے نالہ، و ما علیہ پر مبسوط تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا، فلسفہ کی ایک نئی تاریخ لکھی جانی چاہیے یعنی ایسی تاریخ جس کے دامن پر فرسودہ نظریات کے گرد و غبار کی تہیں جمی ہوئی نہ ہوں! مولانا کی اس تجویز پر صاد کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستانی جمہوریہ کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں ایڈیٹروں کا ایک بورڈ بنا جس نے مشرقی و مغربی فلسفہ کی ایک نئی تاریخ ترتیب دی۔ زیر نظر کتاب کا اصل متن اسی تاریخ کا دیباچہ ہے جسے جناب محمد وارث کامل نے بڑی خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔"

۴۹۔ فیصلہ مقدمہ جامع مسجد کلکتہ۔ کلکتہ، ستارۂ ہند پریس ۱۹۲۱ء ۴۸ص

۵۰ قربانی دہلی، محبوب المطابع (ب ت) ۵۶ص

فرانس کے مشہور انشا پرداز وکٹر ہیوگو کے ایک افسانہ پر مبنی مولانا کے قلم سے نکلا ہوا افسانہ۔ دیگر مقامات پر یہ افسانہ 'محبت' کے عنوان سے بھی شایع ہوا ہے۔

۵۱۔ قولِ فیصل۔ کلکتہ، البلاغ پریس ۱۹۲۲ء ۱۰۰ص

دہلی، نیا ادارہ ب ت ۱۲۸ص

(مع کلدوائی مقدمہ) لاہور، خالد بک ڈپو ب ت ۱۵۷ص

"حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان جو انہوں نے گورنمنٹ کے استغاثہ کے جواب میں تحریر کیا اور جو تحریک خلافت و سوراج کے اسباب، مقاصد اور ملک کے قومی و مذہبی فرائض پر سب سے بہتر اور مستند بیان ہے۔ مع روداد گرفتاری و مقدمہ۔ آخر میں ضمیمہ پر مولانا آزاد کی بیگم کا گاندھی جی کے نام تار بھی درج ہے۔"

۵۲۔ مالیر کوٹلہ کا نزاع: امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا فیصلہ، مالیر کوٹلہ، انجمن اہل حدیث، ۱۹۵۴ء ۴۸ص

۵۳۔ مساجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ۔ لاہور، شمیم بک ڈپو ب ت ۸۰ص

"یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مسجدوں میں وعظ و خطبات کو روک دو کیوں کہ وہ 'سیاسی' ہیں تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کو روکنا چاہتے ہیں اور سیاست کے نام سے حفظ حقوق مسلمین و دفع ظلم و جبر کی سعی مراد لیتے ہیں۔"

۵۴۔ مسلمان اور کانگریس۔ لاہور، آزاد بک ڈپو ب ت، ۹۶ص

۵۵ مسلمان عورت۔ بار سوم۔ لاہور، ادبستان ۱۹۴۶ء ۲۸۸ص

بار نہم۔ " " ۱۹۵۶ء ۲۵۶ص

"پیش نظر کتاب فرید وجدی کی عربی تصنیف "المرأۃ المسلمۃ" کا اردو ترجمہ ہے جو ادبی ثمر ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی مساعی کا اور تصنیفی صلاحیتوں کا۔ اس کو ترجمہ ہم واقعات کے اعتبار سے کہتے ہیں ورنہ اس کو فرید وجدی کا اردو ایڈیشن کہنا چاہیے۔"

۵۶۔ مسئلۂ خلافت و جزیرۂ عرب۔ کلکتہ، آل انڈیا خلافت کمیٹی ۱۹۲۰ء ۱۶۰ص

طبع ثانی۔ کلکتہ، البلاغ پریس ۱۳۳۹/۱۹۲۰ء ۲۲۴ص

دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۱ء ۳۲۰ص

۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے لیے مولانا آزاد نے یہ رسالہ بطور خطبۂ صدارت تحریر فرمایا تھا۔ اس کی ضخامت ۱۶ صفحات پر مشتمل تھی بعد میں انہوں نے اس سے متعلق بقیہ مباحث بھی بڑھا دیے تاکہ اس اہم موضوع پر ایک مکمل تحریر مرتب ہو جائے۔

طبع ثانی کا وضاحتی نوٹ:

"جو پہلے خطبۂ صدارت کی صورت میں پراونشیل خلافت کمیٹی بنگال کے زیر اہتمام شایع ہوا تھا۔ اب مصنف کی نظرِ ثانی، مطالب کی تقسیم و تحویل، مجمل بیانات کی مزید تفصیل، متعدد اہم فصول و مباحث کے اضافہ اور بعض ضروری ضمیموں کی تذییل کے بعد مکرر شایع کیا جاتا ہے۔"

منہاج العابدین:

۶۰۔ "اسی زمانے میں مولوی عبدالواحد خاں مرحوم کی جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، آمد و رفت ہو چکی تھی۔ ان کی وجہ سے دو کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ایک منہاج العابدین امام غزالی اور ایک نفحات الانس جامی۔ نفحات کے چند اجزا کر کے چھوڑ دیے۔ وہ بہت بڑی کتاب ہے لیکن منہاج العابدین پوری ہو گئی۔ منہاج کا ایک نہایت عمدہ قلمی نسخہ والد کے کتب خانے میں تھا، اس وقت تک چھپا نہیں تھا۔۔۔ عبدالواحد خاں مرحوم نے اس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا۔ چوں کہ وہ نسخہ باہر ہی تھا اس لیے مجھے بآسانی مل گیا اور انہیں دے دیا۔ اس واقعے کی وجہ سے اس کتاب پر خاص طور پر توجہ ہوئی اور پھر خیال ہوا کہ اس کا ترجمہ کر دیا جائے چنانچہ وہ مکمل ہو کر شایع ہو گیا۔"[1]

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ ص ۲۷۱

۶۱۔ مولانا ابوالکلام کا پیغام۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (ب ت) ۴۴ص
مولانا آزاد کا وہ مضمون جو انہوں نے تحریک خلافت کے سلسلہ میں ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو جیل جانے سے دو دن قبل تحریر فرمایا تھا۔

۶۲۔ ولادت نبوی۔ لاہور، ادبستان ۱۹۵۵ء ۱۲۷ص
ماہ ربیع الاول اور تذکار ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔

۶۳۔ ہماری آزادی؛ ایک تاریخ جو آپ بیتی بھی ہے، مترجمہ محمد مجیب، نئی دہلی اورینٹ لانگ مینس، ۱۹۶۱ء ۵۰۶ص

دوسری بار نئی دہلی اورینٹ لانگ مینس، ۵۰۶ص

تیسری بار " " ۱۹۶۷ء ۵۰۶ص

انگریزی تالیف INDIA WINS FREEDOM کا اردو ترجمہ۔

۶۴۔ ہندوستان پر حملہ اور مسلمانوں کا فرض، مرتبہ مشتاق احمد۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت (ب ت) ۲۴ص

مجموعے و منتخبات

۱۔ آزاد کی تقریریں؛ مرتبہ انور عارف۔ دہلی، ادبی دنیا ۱۹۶۱ء ۳۹۲ص
کراچی، مکتبہ ماحول ۱۹۶۱ء ۳۴۴ص
یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں زیادہ تر وہ تقریریں ہیں جو مولانا کی اپنی زبان میں ہیں۔ دوسرے حصہ میں وہ تقاریر ہیں جو ابتداءً حکومت ہند کی شائع کردہ Speeches of Maulana Azad میں شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند کا انتخاب کر کے اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ وہ تقریریں ہیں جو مولانا نے قیام پاکستان کے بعد اسلام، تعلیم اور فلسفہ کے موضوع پر کیں۔ ان میں سے بیشتر کا ترجمہ مولانا محمد وارث کامل نے کیا۔

۲۔ ابوالکلام کے افسانے؛ مرتبہ عبدالغفار شکیل۔ علی گڑھ، سرسید بکڈپو ۱۹۶۱ء ۱۰۳ص
مندرجات: (۱) مولانا آزاد اور افسانہ نگاری۔ ص ۵—۸ (۲) محبت۔ ص ۹۔ ۳۶ (۳) حقیقت کہاں ہے۔ ص ۳۷—۴۳ (۴) ہولناک رات ص ۴۸۔ ۵۷ (۵) نپولین پر دوسرا حملہ ص ۵۸۔ ۶۲ (۶) سودہ بنت عمارہ ص ۶۳۔ ۶۷ (۷) اروی بنت الحارث۔ ص ۶۸۔ ۷۳ (۸) چڑیا چڑے کی کہانی۔ ص ۷۴۔ ۹۵ (۹) شہید رسم۔ ص ۹۶۔ ۹۹ (۱۰) قمار باز۔ ص ۱۰۰۔۱۰۳

۳۔ ارمغان آزاد؛ مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ کراچی، مکتبہ الشاہد ۱۹۷۲ء ۲۴۸ص
" آزاد اکیڈمی، ۱۹۸۰ء ۲۲۸ص
مولانا آزاد کا کلام اور ان کے ابتدائی مضامین کا انتخاب

۴۔ اسلامی مسائل۔ دہلی، شہزاد بک ڈپو ب ت ۱۲۸ص
اس میں مولانا آزاد نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مفصل بحث کی ہے اور احکام خداوندی کی تشریح فرمائی ہے۔

۵۔ اکابر اسلام کے آخری لمحات۔ (انسانیت موت کے دروازے پر)
لاہور، شمیم بک ڈپو ۱۹۵۷ء ۶۲ص
(بار دوم) " " ۱۹۵۸ء ۶۲ص
عمرو بن العاص، حجاج بن یوسف، معاویہ ابن سفیان، حضرت حبیب بن عدی، عبداللہ بن البجادین، عبداللہ بن زبیر اور عمر بن عبدالعزیز کے آخری لمحات کی تصویرکشی۔

۶۔ الحرب فی القرآن۔ لاہور، الہلال بک ایجنسی ۱۹۲۲ء ۱۱۶ص

۷۔ الحریت فی الاسلام؛ مرتبہ مشتاق احمد۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت ۱۹۲۱ء ۴۸ص
"اس میں اسلامی جمہوریت اور حریت اسلامی پر زبردست بحث فرمائی ہے اور نام نہاد آزادی یورپ کا اسلامی آزادی سے مقابلہ کیا ہے۔ دیگر بے شمار ضروری مسائل پر لاجواب بحث ہے"

۸۔ امر بالمعروف۔ لاہور، الہلال بک ایجنسی ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء ۱۴۸ص
"یہ رسالہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ان متفرق مضامین کا مجموعہ ہے جو الہلال کے پہلے دور کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ الہلال بک ایجنسی نے جو مجموعے اس سے پہلے شائع کیے ہیں ان کی طرح اس کا مدعا بھی یہی ہے کہ زیر غور مسئلہ کے متعلق حضرت مولانا کے تمام ارشادات یکجا ہو جائیں تاکہ قارئین ان سے بہتر طریق پر مستفید ہو سکیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان مضامین میں امر بالمعروف کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث فرمادی گئی ہے لیکن ان مضامین سے مسئلہ کے بنیادی اصول اور اس کی اہمیت پوری طرح آشکارا ہو گئی ہے"

۹۔ انتخاب الہلال۔ لاہور، ادبستان (ب ت) ۲۵۶ص
لاہور، حمید برادرز ۱۹۵۸ء ۳۸۱ص
" " ۱۹۶۱ء ۳۸۴ص
الہلال کے ۷ مضامین کا انتخاب۔ آخر میں علامہ شبلی کی ایک نظم "تنزل اسلام کے سبب اصلی" بھی شامل ہے۔

۱۰۔ انسانیت موت کے دروازہ پر۔ حیدرآباد، آزاد اکیڈمی (ب ت) ۲۴۴ص
(بار دوم) لاہور، گوشۂ ادب ۱۹۵۰ء ۲۵۵ص
(بار ششم) " " ۱۹۵۶ء ۲۵۵ص
(بار نہم) " " ۱۹۵۸ء ۲۵۵ص
"اس سلسلۂ مضمون کا مقصد مشاہیر کے انجام زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرنا ہے۔ جو لوگ دنیا میں مناصب و مراتب کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں اور اپنے اوصاف کمالات کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جگہ پاتے ہیں، طبعی طور پر یہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ انہوں نے داعیٔ اجل کو کس طرح لبیک کہا اور قاصدِ مرگ کا استقبال کس طرح کیا، نیز ان کے الوداعی کلمات کیا تھے۔ اس کتاب میں ۳۹ مشہور شخصیتوں کے واقعات وفات پیش کیے گئے ہیں"
۱۱۔ تازہ مضامین ابوالکلام۔ میرٹھ، قومی دارالاشاعت ۱۹۲۱ء ۴۷ص
(دوسری مرتبہ) " " ۱۹۶۱ء ۴۶ص
۱۲۔ تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر۔ حیدرآباد، عثمانیہ بک ڈپو (ب ت) ۳۹۶ص
لاہور، کتاب منزل ۱۹۵۹ء ۳۹۲ص
مولانا آزاد کے ۷۹ خطوط ۶ (چھ) مضامین کا مجموعہ۔
تحریک آزادی۔ لاہور، مکتبہ ماحول ۱۹۵۸ء ۲۴۸ص
(بار دوم) " " ۱۹۵۹ء ۲۴۸ص
دہلی، کتاب خانہ (ب ت) ۱۹۲ص
دہلی، یمنی بک ڈپو (ب ت) ۲۴۰ص

مندرجہ ذیل مضامین کا انتخاب:

تحریک آزادی اور مسلمان۔ ۲۔ لکھنؤ کانفرنس۔ ۳۔ مسلمان اور [illegible] ۴۔ ایک تاریخی خطبہ۔ ۵۔ مسئلۂ زکوٰۃ۔ ۶۔ سیرت کی [illegible]ت۔ ۷۔ مذہب کی دوکان۔ ۸۔ مرزائیت۔
[illegible] سحات آزاد۔ (بار دوم) لاہور، مکتبہ شعر و ادب (ب ت) ۲۰۲ص
"الہلال کے زمانے میں مولانا کے سامنے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے مذہبی اور سیاسی شبہات سوالات کی صورت میں رکھے تو ان شبہات کی گرہ کو جس مدلل طریقے سے مولانا نے کھولا ہے، یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اور ان کے مدلل جوابات سے لوگ جیسے مطمئن [ہوئے] ایسا اطمینان اس سے پیشتر میسر نہیں آیا تھا۔ کتاب میں [جوا]ب کی وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے جو ترتیب الہلال کے [میں] موجود ہے"
[illegible] شہادت۔ بمبئی، بک سنٹر ۱۹۶۶ء ۱۱۲ص

الہلال والبلاغ کے چند مضامین کا انتخاب۔
۱۶۔ خطبات آزاد۔ لاہور، ادبستان ب ت ۲۶۸ص
دہلی، اردو کتاب گھر ۱۹۵۹ء ۱۹۲ص
مرتبہ مالک رام نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی ۱۹۷۴ء ۴۳۶ص

مندرجہ ذیل خطبات کا مجموعہ:

(۱) خطبہ اتحاد اسلامی۔ اجلاس عام کلکتہ۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء
(۲) خطبہ صوبائی مجلس خلافت آگرہ۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء
(۳) خطبۂ صدارت تحریری جمعیۃ علمائے ہند۔ اجلاس لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء
(۴) خطبہ صدارت تقریری جمعیۃ علمائے ہند۔ اجلاس لاہور ۱۹۲۱ء
(۵) خطبہ اجلاس عام کلکتہ (شہادت حسین)
(۶) اجلاس خصوصی انڈین نیشنل کانگریس۔ دہلی ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء
(۷) خطبہ صوبائی مجلس خلافت کانفرنس بنگال۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۰ء
(۸) خطبہ آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء
(۹) خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس۔ اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء
۱۷۔ خون شہادت کے دو قطرے۔ مرتبہ ملا واحدی۔ امرتسر ب ت ۳۱ص
بقول ڈاکٹر عابد رضا بیدار: خون شہادت کے دو قطرے کا انتساب بھی مولانا کی طرف نیم غلط ہے۔ یہ دراصل ملا واحدی کی ترتیب ہے۔ یہ دو مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے ایک منصور پر مرتب کا ہے، اور دوسرا سرمد پر مولانا آزاد کا شائع شدہ مضمون۔ سرمد والا مضمون جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اصلاً نظام المشائخ میں شائع ہوا تھا۔[1]
۱۸۔ صبح امید۔ نئی دہلی، سنگم کتاب گھر ۱۹۵۹ء ۴۰۴ص
لاہور، ظفر برادرز ب ت ۲۴۴ص
"امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے چند بصیرت افروز مضامین کا انتخاب"
۱۹۔ صدائے حق۔ مرتبہ مسعود الحسن۔ دلی، حالی پبلشنگ ہاؤس (ب ت) ۱۲۴ص
دہلی، مکتبہ اشاعت القرآن (ب ت) ۱۲۰ص

مندرجہ ذیل مضامین کا انتخاب:

(۱) جمہوریت کے بعد سوشلزم بھی ایک غلطی ہے
(۲) نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے بھی ایک اہم چیز
(۳) اجتماعی زندگی کی عمارت کی خشت اولیں
(۴) خطبۂ عید الضحیٰ (۵) خطبۂ عید صیام

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد از عابد رضا بیدار۔ ص ۲۲۳

(۶) خطبۂ عید الضحیٰ (۷) اسیرِ رسول (۸) وقت کے چند تاثرات

۲۰۔ صدائے رفعت؛ مرتبہ مرزا جانباز۔ لائلپور، ملک پبلشرز ب ت ۱۸۰ص
مندرجات: ۱۔ السیدہ فاطمہ بنت عبداللہ۔ ۲۔ تاریخ عہد عباسیہ کا ایک ورق۔ ۳۔ الحریت فی الاسلام۔ ۴۔ ایک تقریر۔
۵۔ ایک پیغام۔ ۶۔ جمعیۃ علماء کے اجلاس لاہور میں ایک تقریر۔
۷۔ تربیت عسکری اور قرآن حکیم۔ ۸۔ لاہور کے جلسہ میں ایک تقریر۔
۹۔ خطبۂ عید الضحیٰ۔ ۱۰۔ مومنین کے اوصاف و مدارج۔

۲۱۔ طنزیاتِ آزاد، حدیث الغاشیہ؛ مرتبہ عمر فریدی۔ لاہور، نیا کتاب گھر ۱۹۶۳ ۲۳۰ص
الہلال اور البلاغ سے طنزیہ مضامین کا انتخاب۔

۲۲۔ عروج و زوال کا قرآنی دستور۔ لاہور، بزم اشاعت ۱۹۶۴ء ۲۰۸ص
مندرجہ ذیل مضامین کا انتخاب:
۱۔ امت مسلمہ۔ ۲۔ حقیقت اسلام۔ ۳۔ وحدت اجتماعیہ۔ ۴۔ مرکز قومیت۔ ۵۔ جغرافیائی مرکزیت۔ ۶۔ فکر وحدت اور فکر مرکزیت۔ ۷۔ عروج و زوال کا فطری اصول۔ ۸۔ عزم و استقامت۔ ۹۔ تجدید و تاسیس۔ ۱۰۔ کامیابی کی چار منزلیں۔

۲۳۔ عیدین۔ لاہور، ادبستان ۱۹۵۶ء ۸۸ص
مندرجات: (۱) عید الفطر ص ۷-۲۶ (۲) عید الضحیٰ ص ۲۷-۸۰

۲۴۔ کاروانِ خیال؛ مرتبہ محمد عبدالشاہد خاں شروانی۔ بجنور، مدینہ پریس، ۱۹۴۶ء ۱۵۱ص
مجموعہ خطوط ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء۔ ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء از امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد و صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ ابتدا میں ۷۵ صفحات پر مشتمل مرتب کا دیباچہ ہے جس میں ان دونوں بزرگوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان خطوط کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۲۵۔ مجموعہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد؛ مرتبہ مشتاق احمد۔ ح ۱ میرٹھ، قومی دارالاشاعت ب ت ۷۲ص
" ح ۲ " " ۱۰۸ص
" ح ۳ " " ۱۰۸ص
" ح ۴ " " ۱۰۰ص
" ح ۵ " " ۱۰۰ص
" ح ۶ " " ۱۰۰ص
حصہ اول و دوم 'مضامین ابوالکلام' اور حصہ سوم تا حصہ ششم مجموعہ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد کے عنوان سے شایع ہوئے۔

۲۶۔ مضامین ابوالکلام۔ کراچی، دارالاشاعت، ب ت ۱۶۰ص

۲۷۔ مضامین ابوالکلام۔ جلد ۱، مرتبہ سفارش حسین۔ دہلی، ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۴ء
جلد ۲، مرتبہ بدرالحسن " " ۱۹۴۴ء

۲۸۔ مضامین البلاغ۔ مرتبہ محمود الحسن صدیقی " ۱۹۴۴ء ۶۹ص
" " شاہین بک سنٹر ۱۹۸۶ء ۲۱۶ص
" ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس ب ت ۲۱۱ص

۲۹۔ مضامین لسان الصدق؛ مرتبہ عبدالقوی دسنوی۔ لکھنؤ، نسیم بک ڈپو ۱۹۶۷ء ۱۵۳ص

۳۰۔ مقالات ابوالکلام۔ لاہور، ادبستان (ب ت) ۲۰۱ص
مندرجات: (۱) مساجد اسلامیہ اور خطبات اسلامیہ۔ ص ۷-۹۰ (۲) نظام حکومت اسلامیہ۔ ص ۹۱-۱۵۴ (۳) سقوط ادرنہ۔ ص ۱۵۵-۱۹۴ (۴) دعوت عمل۔ ص ۱۹۵-۲۰۰

۳۱۔ مقالات ابوالکلام آزاد۔ کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۵۷ء ۱۶۰ص
(اشاعت دوم) " " ۱۹۶۱ء ۱۶۰ص

مندرجہ ذیل مضامین کا انتخاب:
(۱) تفسیر القرآن کا ایک باب (۲) ماہ ربیع الاول؛ ولادت نبویؐ۔
(۳) تاریخ فریضۂ حج (۴) ورود مقدس یوم الحج۔
(۵) عشرۂ محرم الحرام (۶) خلیفہ مامون الرشید اور الواثق، قتل امام رضا۔
(۷) الطامۃ الکبریٰ (۸) تاریخ ہند میں اولین بحری حملہ کا اقدام۔
(۹) سرگزشت مصالحت (۱۰) بعض احادیث مشہورہ۔
(۱۱) اقترب للناس حسابہم۔

۳۲۔ مقالات الہلال۔ لاہور، ادبستان، ۱۹۴۲ء ۲۱۵ص
(بار دوم) " " ۱۹۵۵ء ۲۱۵ص
(بار سوم) " " ۱۹۶۰ء ۲۱۵ص
یہ 'انتخاب الہلال' کی دوسری جلد کی حیثیت سے شایع ہوئی۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:
(۱) مساجد اسلامیہ اور خطبات سیاسیہ (۲) مسجد ضرار۔
(۳) نظام حکومت اسلامیہ (۴) سقوط ادرنہ (۵) مسئلہ سود

۳۳۔ مکاتیب ابوالکلام۔ لاہور، ادبستان (ب ت) ۲۰۰ص
مولانا حالی، علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، مولانا محی الدین احمد، مولانا غلام رسول مہر، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ کے نام مولانا آزاد کے خطوط۔

۳۴۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد؛ مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء

۳۵۔ مکالمات ابوالکلام۔ لاہور، مکتبۂ احباب (ب ت) ۲۳۶ص
مولانا آزاد کے پچیس مضامین کا انتخاب۔

۳۶۔ ملفوظاتِ آزاد، مرتبہ محمد اجمل خاں۔ (جلد اول۔ دینی) دہلی، حالی پبلشنگ
ہاؤس ۱۹۵۹ء ۱۶۰ص
مختلف دینی مسایل سے متعلق مولانا کے نام استفساری خطوط
اور مولانا کے جوابات۔

۳۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد، مرتبہ محمد اجمل
خاں۔ دہلی، بیت الحکمہ، ۱۹۶۶ء ۴۰۰ص

۳۸۔ میرا عقیدہ، مرتبہ قاضی احمد حسین۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۵۹ء ۲۸ص
"مولانا مرحوم کی طرف جو غلط باتیں منسوب کی گئی ہیں ان میں سب سے
زیادہ سنگین حصہ وہ ہے جس کا تعلق عقاید سے ہے۔ تفسیر
سورہ فاتحہ کی اشاعت ہوئی تو عقاید کا معاملہ زیر بحث آگیا۔
اور لوگ اس گمان میں پڑ گئے کہ مولانا ایمان باللہ اور بالآخرت
کو کافی سمجھتے ہیں۔ مولانا کو توجہ دلائی گئی تو تردید فرمائی۔ یہ تردید
جو مکتوب کی شکل میں تھی اخبارات میں شایع بھی ہو چکی ہے لیکن افسوس
کہ مخالفتوں کے زور نے طبیعتوں کو آمادہ نہیں کیا کہ وہ اس
طرف متوجہ ہوں اور اب اس عظیم شخصیت کے انتقال کے بعد دیکھتا
ہوں کہ معتقدوں نے بھی انہیں نہیں بخشا اور اس کی نسبت ایسی
باتیں لکھ دیں جن کی وہ خود تردید کر چکا ہے۔ یہ دیکھ کر اس عاجز کو
خیال آیا کہ مولانا کے ان خطوط کو شایع کر دوں جن میں مولانا نے
اپنے عقاید سے بحث کی ہے"

۳۹۔ نقشِ آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر۔ لاہور، کتاب منزل (۱۹۵۸ء) ۴۶۰ص
"یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ مکاتیب جو میرے نام آئے
نیز بعض دوسری تحریرات و مکاتیب" مرتب

۴۰۔ نگارشاتِ آزاد۔ لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۶۰ء ۳۲۰ص
دہلی، مکتبہ ماحول (جولائی) ۱۹۶۰ء ۳۲۰ص
دہلی، نیو تاج آفس (ستمبر) ۱۹۶۰ء ۳۲۰ص
مختلف موضوعات پر مولانا کے ۲۶ مضامین کا انتخاب۔

۴۱۔ نوادر ابوالکلام، مرتبہ عبدالغفار شکیل۔ علی گڑھ، سرسید بک ڈپو، ۱۹۶۲ء، ۲۳ص
- مولانا آزاد کے اردو و فارسی کلام، نادر تحریروں، اہم مضامین
اور چند خطوط کا انتخاب۔

۴۲۔ ہجر و وصال، مرتبہ بشیر احمد چودھری۔ لاہور، دار البلاغ۔ ۱۹۶۰ء ۲۶۶ص
دہلی، شاہین بک سنٹر ۱۹۸۴ء ۱۹۲ص
دہلی، چمن بک ڈپو (بے سنہ) ۱۸۰ص
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہفت روزہ البلاغ اور الہلال
کے منتخب مقالات کا بے نظیر و عدیم المثال مجموعہ"

مطالعۂ ابوالکلام

مولانا آزاد کے فن، ان کی شخصیت اور کارناموں پر کتابیں اور مضامین کے مجموعے

۱۔ آزاد، جگن ناتھ
ابوالکلام آزاد۔ (۴۴ اشعار پر مشتمل نظم) لکھنؤ، ادارۂ فروغ اردو (۱۹۵۸ء) ۱۶ص

۲۔ ابوسلمان الہندی۔
امام الہند (تعمیر افکار) کراچی، مکتبۂ اسلوب ۱۹۶۲ء ۳۸۶ص

۳۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ مرتب
مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک مطالعہ۔ کراچی، مکتبۂ اسلوب ۱۹۸۶ء ۴۴۸ص
مولانا کی شخصیت اور علمی و مذہبی اور سیاسی خدمات پر
برصغیر ہند و پاک کے مشاہیر کے مضامین۔

۴۔ ابوسلمان شاہجہانپوری
ابوالکلام و عبدالماجد (ادبی معرکہ)، کراچی۔ ادارۂ تصنیف و
تحقیق پاکستان، ۱۹۸۷ء ۱۴۱ص
الہلال ۱۹۱۲ء میں لغات و اصطلاحات کی ایک علمی بحث
کی تفصیل اور تنقیدی تجزیہ۔

۵۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔
اردو کی ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ۔ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۸۸ء ۱۱۲ص
کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان ۱۹۸۸ء ۱۴۴ص
اردو زبان کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات، ان کے
افکار اور علمی افادات کا تعارف"

۶۔ امداد صابری
امام الہند مولانا آزاد۔ کراچی، ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان ۱۹۸۶ء ۳۰۴ص
مولانا کی سیرت و شخصیت اور افکار و خدمات کے تمام پہلوؤں
پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷۔ انصاری، اثر بن یحییٰ۔
مولانا آزاد۔ ایک سیاسی ڈائری۔ دھولیہ (مہاراشٹر)، عالیہ پبلی کیشنز،
۱۹۸۴ء ۵۷۶ص

۸۔ انور عارف۔ مرتب
ابوالکلام آزاد۔ لاہور، مکتبہ ماحول ۱۹۵۹ء ۲۷۲ص
مولانا آزاد سے متعلق مختلف مضامین کا مجموعہ۔ یہ مضامین نئی دنیا،
آج کل، شاہراہ، اور صبا (حیدرآباد) کے آزاد نمبروں سے ماخوذ ہیں۔

۹۔ بزمی۔ ابوسعید۔
مولانا آزاد تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں (مع سوانح حیات) دہلی، ناز پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۹ء ۱۲۸ص۔

۱۰۔ بیدار، عابد رضا۔
مولانا ابوالکلام آزاد۔ رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۱۹۶۸ء ۲۹۴ص
دس سالہ یادگار اشاعت

۱۱۔ بیشا چاریہ، شانتی رنجن۔ مترجم و مرتب۔
مولانا ابوالکلام آزاد کے پاسپورٹ کا خفیہ فائل۔ نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۷ء ۱۱۶ص

۱۲۔ پبلی کیشنز ڈویژن۔ نئی دہلی۔
ابوالکلام آزاد۔ نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۵۸ء۔ ۲۲۴ص
آج کل (آزاد نمبر۔ ۱۹۵۸ء) کی کتابی شکل

۱۳۔ پیسلوان، حسن محمد۔
مولانا ابوالکلام۔ سرینگر۔ ۱۹۵۸ء ۳۲ص
[illegible] کے حالات زندگی پر مختصر کتابچہ۔

[illegible] مرتب
[illegible] لاہور، [illegible] ۱۹۶۰ء ۲۳۹ص
[illegible]

[illegible] مرتب
[illegible] ۱۹۶۰ء ۸۰ص
[illegible] مقالات کا مجموعہ

۱۴۔ [illegible] مرتب
مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے۔ دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۰ء [illegible]
[illegible] اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ [illegible] سمینار [illegible] میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ۔ ان مقالات کو [illegible] عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔
۱۔ شخصیت۔ ۲۔ سیاست۔ ۳۔ مذہب۔
۴۔ ادبی نثر۔ ۵۔ صحافت۔

۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبہ صدارت پر ایک نظر دہلی
ادارہ فکر اسلام (ب ت) ۳۶ص
مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبہ صدارت رام گڑھ (۱۹۴۰ء) پر

تنقید و تبصرہ۔ تبصرہ نگار نامعلوم۔

۱۸۔ رضی الدین احمد۔
نقد ابوالکلام۔ ترویج سری وینکٹیسورا یونیورسٹی، ۱۹۶۸ء، ۱۱۵ص
مولانا آزاد کی شخصیت اور فن کو انانیتی ادب کے تناظر میں دیکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور اس ضمن میں مولانا کے انانیتی ادب کا مرزا غالب، سرسید، علامہ اقبال، امیر خسرو اور علامہ فیضی کے انانیتی ادب سے تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

۱۹۔ زیدی، علی جواد۔ مرتب
انوار ابوالکلام۔ سرینگر، ثقافتی سب کمیٹی جشن بہار کشمیر ۱۹۵۹ء ۱۲۰ص
"ریاست کشمیر کی زیر سرپرستی مئی ۱۹۵۸ء میں جشن بہار کشمیر منایا گیا جو تقریباً دو ہفتہ تک جاری رہا۔ اسی سلسلہ میں مولانا آزاد کی عہد ساز شخصیت اور ان کے ناقابل فراموش کارناموں پر ایک آزاد سمینار منعقد کیا گیا۔ یہ سمینار ۲ مئی سے ۷ مئی ۱۹۵۸ء تک جاری رہا۔ اس میں مجموعی طور پر [illegible] زیر نظر کتابچہ میں اسی سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو ترتیب دیا گیا ہے۔

۲۰۔ سعید احمد اکبر آبادی (مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری)
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ کراچی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اکیڈمی۔ [illegible]
۱۲۸ص
سیرت و شخصیت [illegible]

۲۱۔ [illegible]
مولانا [illegible]

۲۲۔ [illegible]
[illegible] آزاد [illegible]
آزاد [illegible]

۲۳۔ [illegible]
آثار ابوالکلام [illegible]
انجمن پبلیکیشنز ۱۹۴۹ء [illegible]
(طبع ثانی بعد ترمیم و اضافہ [illegible])

۲۴۔ عبدالقوی دسنوی
ابوالکلام آزاد۔ نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، [illegible]

۲۵۔ عبدالقوی دسنوی۔
مطالعۂ غبار خاطر۔ نئی دہلی، نئی آواز ۱۹۸۱ء [illegible]

۲۶۔ عبداللہ بٹ۔
ابوالکلام آزاد ۔ لاہور، مکتبہ اردو ۱۹۴۲ء ۲۶۳ ص

۲۷۔ عبداللہ بٹ۔ مرتب
ابوالکلام آزاد ۔ لاہور، قومی کتاب گھر ۱۹۴۳ء ۲۳۶ ص
اشاعت ثانی ۱۹۸۶ء ۱۴۸ ص
مولانا آزاد کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ

۲۸۔ عبدالماجد دریا آبادی ۔
اردو کا ادیب اعظم ۔ کراچی، ادارۂ تصنیف و تالیف پاکستان ۔ ۱۹۸۶ء
۱۵۱ ص
مولانا کے حسن انشا اور مرقع سیرت پر ایک نظر

۲۹۔ عبدالودود خاں ۔ مرتب
مولانا ابوالکلام آزاد۔ تحریک آزادی و یک جہتی۔ دہلی، کتاب والا، ۱۹۸۳ء ۱۱۲ ص
مولانا کی شخصیت اور کارناموں پر مختلف دانشوروں کے مضامین کا انتخاب ۔

۳۰۔ عتیق صدیقی ۔ مرتب
آئینۂ ابوالکلام (مجموعہ مقالات) دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۷۶ء ۴۰۰ ص
اس مجموعہ کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ 'تاثرات' کا ہے جس میں جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ہمایوں کبیر، سجاد انصاری، نیاز فتحپوری اور سید حامد علی کے تاثراتی مضامین اور تقاریر سے اقتباسات دیے گئے ہیں ۔ دوسرے حصے کا عنوان "مقالات" ہے جس میں مولانا کی شخصیت اور فن پر مختلف حضرات کے آٹھ مضامین شامل کیے گئے ہیں ۔ تیسرا حصہ 'انتخاب آزاد' ہے جس میں مولانا کے خطوط اور چند ابتدائی مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔

عتیق صدیقی ۔ مرتب
افکار ابوالکلام ۔ نئی دہلی، نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ڈیماکریٹک سوشلزم،
۱۹۶۶ء ۹۶ ص
"ہمارا پہلا سمینار مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی دسویں برسی کے موقع پر 'افکار آزاد' کے موضوع پر ہوا تھا جس میں دہلی اور دہلی سے باہر کے کچھ آزاد دوستوں نے حصہ لیا تھا ۔ پیش نظر 'افکار ابوالکلام' اسی مذاکرے کی کارروائی پر مشتمل ہے جو ٹیپ ریکارڈ کرلی گئی تھی اور من وعن پیش کی جارہی ہے"
۔۔۔صدیقی ۔ مرتب

غالب اور ابوالکلام ۔ دہلی، مکتبہ شاہراہ ۱۹۶۹ء ۲۴۸ ص

۳۳۔ عثمانی، مسعود الحسن ۔ مرتب
ابوالکلام آزاد ۔ احوال و آثار ۔ لکھنؤ، مولانا آزاد میموریل اکیڈمی، ۱۹۷۷ء
۲۲۴ ص
مولانا کی شخصیت اور ان کے ہمہ جہتی کارناموں پر مختلف ادیبوں، سیاست دانوں اور دانشوروں کے مضامین کا انتخاب ۔

۳۴۔ عرش ملسیانی ۔
ابوالکلام آزاد ۔ سوانح حیات ۔ نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن ۱۹۷۰ء ۹۱ ص

۳۵۔ عظمت اللہ ۔
حیات آزاد ۔ دہلی، انصاری پریس، ۱۹۴۰ء ۱۴۴ ص
اس کا متبادل عنوان 'حیات مولانا ابوالکلام آزاد' بھی رکھا گیا ہے ۔ اس میں امام الہند مولانا آزاد کے مفصل حالات، الہلال کے مفید مضامین، مختصر مقدمہ کراچی اور خطبۂ صدارت رام گڑھ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ۵۳ ویں سالانہ اجلاس وغیرہ شامل ہیں ۔

۳۶۔ عنفران احمد ۔
ابوالکلام آزاد ۔ دہلی، فیضان بک سیلائرز، ۱۹۸۵ء ۸۸ ص
"طلبا و طالبات کے لیے تحریک آزادی کے قائدین سے تعارف کرانے کے لیے سلسلہ کی پہلی کتاب "

۳۷۔ فاروقی، محمد عبدالرزاق ۔
ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات گلبرگہ، انجمن حیات نو ۱۹۸۵ء ۹۸ ص

۳۸۔ منظور احمد، ملک زادہ ۔
غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ ۔ لکھنؤ، ساجد صدیقی بک سیلرز ۱۹۷۱ء ۱۶۰ ص

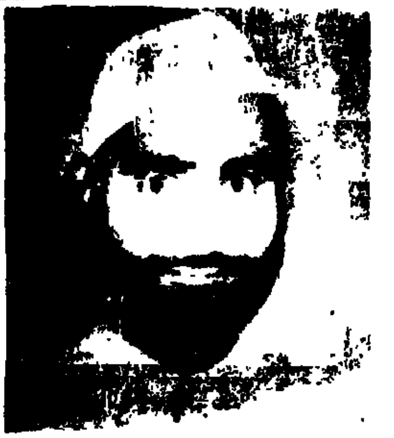
۳۹۔ منظور احمد، ملک زادہ ۔
مولانا ابوالکلام فکر و فن ۔ لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۹ء ۶۲۷ ص
(بار دوم) " ۱۹۷۸ء ۶۲۷ ص

۴۰۔ منظور احمد، ملک زادہ ۔
مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینہ میں ۔ لکھنؤ، مکتبہ دین و ادب، ۱۹۷۲ء ۱۶۲ ص

۴۱۔ ہمایوں کبیر ۔ جامع ۔
مولانا ابوالکلام آزاد ۔ کتاب التذکرہ، مترجم میر ولی الدین
حیدرآباد ۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

محمد ضیاء الدین انصاری

آزاد نمبروں کا اشاریہ



مولانا ابوالکلام آزاد، جامع الصفات، جامع الحیثیات اور جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک مثالی ادیب، فقید العصر عالم، اردو صحافت کے امام، عظیم سیاست داں، کاروانِ آزادی کے قافلہ سالار، ایک مخلص، بے لوث، بے ریا اور مشفق انسان، صبر و تحمل کے کوہِ گراں اور رمادرِ وطن کے مایۂ ناز اور لائقِ صد افتخار سپوت تھے۔ زمانے نے ہمیشہ ان کے ساتھ ناانصافی کی اور ان کی صحیح قدر و قیمت نہیں پہچانی۔ مخالفین کا تو ذکر ہی کیا خود اپنوں نے بھی انہیں سمجھنے میں فہم و فراست کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ حضرات مولانا کے تبحرِ علمی، علوئے فکر اور بلندیٔ کردار تک پرواز نہ کرسکے۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا کے انتقال کے بعد عوام نے اچانک محسوس کیا کہ اس نے اپنا سچا ہمدرد، حقیقی سرپرست اور مخلص و بے لوث رہنما کھو دیا ہے۔ مولانا اُن تمام نام نہاد قائدین سے یکسر مختلف تھے، جو محض اپنی سیاسی دکان چمکانے کی خاطر عوامی فلاح و بہبود کے نعرے بلند کرتے، لیکن اس کی آڑ میں جنسِ کاسد کی تجارت کرتے۔ وہ عوام کے جذبات بھڑکاتے۔ انہیں طوفانوں میں لے جاتے، لیکن عین منجدھار میں بے یار و مددگار چھوڑ کر خود امن و سلامتی کی راہ لیتے اور مڑ کر اس ڈوبتی ہوئی قوم پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کرتے۔ مولانا نے ہمیشہ عوام کی رہنمائی کی اور بڑے بڑے نازک موقعوں پر کام آئے اور انہیں مصائب و آلام سے نجات دلانے کی پُرخلوص کوشش کی، لیکن دوسرے قائدین کی طرح اُنہوں نے اپنے کارناموں کا پروپیگنڈا نہیں کیا۔ اسی لیے عوام ان کی خدمات کا اعتراف نہ کرسکے۔

مولانا کی وفات نہ صرف ہندستانی عوام، بیرونی ممالک، بالخصوص پورے عالمِ اسلام کے لیے حادثۂ عظیم تھی۔ اسی لیے ان کی وفات کا ماتم پوری دنیا نے کیا۔ حتیٰ کہ اس مُلک کے باشندے بھی ان کا ماتم کرنے پر مجبور ہوئے جو اپنی تحریک کے دوران اور قیامِ ملک کے بعد بھی مولانا کو طرح طرح سے مطعون کرتے رہے اور انہیں "شو بوائے" بتاتے رہے۔ اب انہیں احساس ہوا کہ وہ مولانا کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک روا رکھتے رہے۔ اس کے بعد یہاں مولانا کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا جانے لگا۔ مولانا کی وفات کے بعد جہاں جلسے، مذاکرے اور سیمینار منعقد ہوئے، وہیں متعدد رسالوں اور اخباروں نے خصوصی شمارے شائع کیے۔ جن میں ہفت روزہ 'چٹان' (لاہور) اور ہفت روزہ 'ماحول' (کراچی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پاکستان میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 'چٹان' (فروری ۱۹۶۵ء) کی اطلاع کے مطابق جب پاکستان میں عوام کے علمی ذوق کا جائزہ لیا گیا تو پتہ چلا کہ سب سے زیادہ مطالعہ کی جانے والی اور شائع ہونے والی کتابیں مولانا کی ہیں۔

مولانا نے جو کچھ لکھا اور ان پر جو کچھ لکھا گیا، اس کا ایک ایک حرف اہلِ بینش کے لیے سرمۂ بصیرت ہے۔ اُن پر بے شمار کتابیں اور سیکڑوں مضامین لکھے جاچکے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی ایک جامع اور توضیحی کتابیات تیار کی جائے۔ لیکن یہ کام بڑا دقت طلب ہے، البتہ سر دست اُن مضامین وغیرہ کا اشاریہ تیار کرنا بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا جو اخباروں اور رسالوں کے مولانا آزاد سے متعلق خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر آزاد نمبروں کے مندرجات کا اشاریہ تیار کیا گیا ہے۔ اسے مکمل کام کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں مختلف ذرائع سے جتنے آزاد نمبر دستیاب ہوسکے، اُن کا اشاریہ تیار کیا ہے۔ قوی امکان اس بات کا ہے کہ کچھ رسالے ہماری دسترس

• مزمّل منزل، سول لائنز، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

سے باہر ہوں اور بہت سال شامل ہونے سے رہ گئے ہوں، اس کے لیے قارئین کرام سے التماس ہے کہ مرتب کو وہ ایسے خصوصی شماروں کی نشاندہی فرما دیں، اس کے لیے وہ نہ صرف مرتب کے بلکہ پوری علمی و ادبی دنیا کے شکریہ کے مستحق ہوں گے۔

زیر نظر اشاریہ کو اصلاً دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلے حصہ میں رسالوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ پھر ہر رسالے کے تحت اس کے مندرجات کو پیش کیا گیا ہے۔ رسالوں کی ترتیب ابجدی رکھی گئی ہے جب کہ ان کے مندرجات کی ترتیب وہی برقرار رکھی گئی ہے جو ان رسالوں میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں ان تمام مندرجات کو ان کے عنوانات کے تحت واحد ابجدی ترتیب سے درج کیا گیا ہے: پہلے حصہ میں نثر ہے اور دوسرے میں وہ تمام نظمیں، قطعات، رباعیات اور متفرق اشعار وغیرہ شامل ہیں، جن کے ذریعے شعرائے کرام نے مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس طرح کوشش اس بات کی کی گئی ہے کہ تمام اندراجات اس طور پر درج کیے جائیں جس سے قاری کو تلاش کرنے میں ہر ممکن سہولت ہو۔ اس سے اشاریے میں طوالت کا عیب تو ضرور پیدا ہو گیا ہے، لیکن افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اب اس میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے۔ امید ہے آزادیات پر مطالعہ کرنے والے محققین اور دانشوروں کے لیے یہ اشاریہ اساسی اہمیت کا حامل ہوگا۔

آج کل (ماہنامہ) دہلی

ابوالکلام آزاد نمبر

جلد ۱۷، شمارہ ۱ (اگست) ۱۹۵۸ء ۱۲۸ ص

مدیر: بالکمند عرش ملسیانی

مندرجات:

اردو ادب (سہ ماہی) علی گڑھ، انجمن ترقی اردو آزاد نمبر

جلد ۸، شمارہ ۱؛ ۱۹۵۹ء ۳۳۷ ص

مدیر: پروفیسر آل احمد سرور

مندرجات:

الجمعیۃ (روزنامہ) دہلی۔ آزاد نمبر ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء ۱۳۶ ص

مدیر: محمد عثمان فارقلیط

مندرجات:

جامعہ (ماہنامہ، نئی دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر، جلد: ۴۸ شمارہ: ۳
(مارچ) ۱۹۶۳ — ۸۰ ص

مدیر: عبداللطیف اعظمی

مندرجات:

جمہور ۔ (دہ روزہ) علی گڑھ ' ابوالکلام نمبر ' جلد : ۱۱ ۔ شمارہ : ۵ ۔ ۶
۱۶ / فروری ۱۹۶۰ء ۱۲ ص
مدیر : محمد عبدالشاہد خاں شروانی

مندرجات :

چٹان (ہفت روزہ) لاہور / ابوالکلام آزاد نمبر ۔ جلد : ۱۸ / شمارہ : ۷
۱۵ / فروری ۱۹۶۵ء ۲۴ ص
مدیر : شورش کاشمیری

مندرجات :

شاہراہ (ماہنامہ) دہلی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ۔ جلد : ۱۱ ۔ شمارہ ۲ ۔ ۳
فروری ۔ مارچ ۱۹۵۹ء ۱۱۲ ص
مدیر : محمد یوسف جامعی

مندرجات :

صبا (ماہنامہ) حیدرآباد ۔ ابوالکلام آزاد نمبر ۔ جلد ۵ شمارہ ۲-۳
۱۹۵۹ء ص ۱۱۲
مجلس ادارت: سلیمان اریب، وحید اختر، سردار سلیم

مندرجات:

صبح (سہ ماہی) دہلی مولانا ابوالکلام آزاد نمبر جلد ۲ شمارہ ۱
۱۹۷۰ء ص ۲۰۰
مدیر: عبداللطیف اعظمی

مندرجات:

ماحول (ہفت روزہ) کراچی۔ ابوالکلام آزاد نمبر جلد: ۲۔ شمارہ: ۱۷:
۱۸ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۶۴

مدیر: انور عارف

منشورات:

منظومات:

نئی دنیا (روزنامہ) دہلی۔ امام الہند نمبر۔ جلد؟ شمارہ؟

(۲۵ نومبر ۱۹۵۸ء) ص ۲۵۲

مدیر: احمد مصطفےٰ صدیقی راہی

منذرجات:

بہ لحاظِ عناوین

۲۲۔ ابوالکلام بحیثیت انشاء پرداز — ظفر حسین خاں — آج کل

۲۳۔ ابوالکلام کی صحافت — خواجہ مقبول احمد — اردو ادب

۲۴۔ ابوالکلام کی نظر میں عورت — صالحہ عابد حسین — ماحول

۲۵۔ " " " " — نئی دنیا

۲۶۔ احمد محی الدین ابوالکلام — ابن الحسین مورخ — "

۲۷۔ ادیب اور سیاست داں — فضل الرحمٰن — صبا

۲۸۔ اردو اسلوب نگارش: محمد حسین آزاد سے ابوالکلام آزاد تک
محمد وارث کامل — الجمعیتہ

۲۹۔ اردو صحافت کے تاثرات غم و عقیدت (اردو رسائل و اخبارات کے تراشے) — الجمعیتہ

۳۰۔ اردو کانفرنس میں مولانا کی آخری یادگار تقریر — شاہراہ

۳۱۔ اردو نثر میں مولانا آزاد کا اجتہاد — آل احمد سرور — صبح

۳۲۔ اظہار عقیدت (ڈاکٹر سید محمود، بخشی غلام محمد، حافظ محمد ابراہیم، ارونا آصف علی)

۳۳۔ افکار آزاد اور چند قومی مسائل — ضیاء الحسن فاروقی — صبح

۳۴۔ اک شمع رہ گئی تھی — سری نواس لاہوٹی — صبا

۳۵۔ الہلال اور بین الاقوامی سیاست — محمد مہدی — شاہراہ

۳۶۔ الہلال اور اردو صحافت — شمس الدین منیری — الجمعیتہ

۳۷۔ الہلال سے غبار خاطر تک (مولانا کا تنقیدی شعور اور باعظمت اسٹائل) — محشر اعظمی — الجمعیتہ

۳۸۔ امام الہند — ایک جائزہ — ریاض الرحمٰن خاں شروانی — "

۳۹۔ امام الہند کا طرز خطابت — محمد عبدالشاہد خاں فاروقی — "

۴۰۔ امام الہند کی گھریلو زندگی میں ایک میزبان کے مشاہدات
مسز ارونا آصف علی — "

۴۱۔ امام الہند کے مذہبی رجحانات کی ایک جھلک
سید محمد الیاس کھنوری — "

۴۲۔ امام الہند کے ملفوظات — محمد عبدالشاہد خاں شروانی — جمہور

۴۳۔ امام الہند مولانا آزاد — سفر اور مقصد سفر
محمد یونس خالدی — آج کل

۴۴۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (اردو ترجمہ محی الدین الوائی)
مترجمہ: عبدالرحمٰن کیرلوی — نئی دنیا

۴۵۔ امن کا دفاع (۱۵ نومبر ۱۹۵۶ء کو یونیسکو کے نویں اجلاس میں مولانا کی تقریر) — نئی دنیا

۴۶۔ اُن کی جدائی — مولانا احمد سعید — الجمعیتہ

۴۷۔ انتخاب غزلیات — مولانا ابوالنصر آہ — شاہراہ

۴۸۔ انڈیا ونس فریڈم — عالم خوندمیری — صبا

۴۹۔ " " " ۔ ایک تبصرہ — محمد عتیق صدیقی — شاہراہ

۵۰۔ انسانی سوسائٹی میں مذہب کا مقام
مولانا آزاد — الجمعیتہ

۵۱۔ انسانی عظمت و سربلندی کا حقیقی راز " — "

۵۲۔ انمول رتن — حیرت بدایونی — صبا

۵۳۔ اُنہیں کا تذکرہ — ضیا احمد بدایونی — اردو ادب

۵۴۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک — ادارہ نئی دنیا — نئی دنیا

۵۵۔ ایک امانت — محمد میاں — الجمعیتہ

۵۶۔ ایک سانحہ عظیم — مولانا حفظ الرحمٰن — "

۵۷۔ ایک صاحب طرز ادیب — تمکین کاظمی — صبا

۵۸۔ ایک غیر معمولی سیاست داں — جواہر لعل نہرو — نئی دنیا

۵۹۔ ایک غیر معمولی شخصیت — راجندر پرشاد — الجمعیتہ

۶۰۔ ایک قلمی تصویر — خواجہ حسن نظامی — "

۶۱۔ ایک محسن کی یاد میں — جگن ناتھ آزاد — نئی دنیا

۶۲۔ ایک مرد مومن و حق پرست کی مثالی زندگی
عزیز الحسن صدیقی — الجمعیتہ

۶۳۔ ایک نادر روزگار شخصیت — غلام رسول مہر — نئی دنیا

۶۴۔ بچپن اور تعلیم — شریف الحسن ناظر لکھنوی — "

۶۵۔ بچپن کی شاعری (مولانا آزاد کے ابتدائی کلام کا انتخاب) — "

۶۶۔ بصائر — ایک آواز جو کانوں میں گونجتی رہے گی
انور صابری — الجمعیتہ

۶۷۔ بعض قدیم تحریریں — قاضی عبدالودود — اردو ادب

۶۸۔ بولتی ہوئی تحریریں (فرمودات حضرت مولانا آزاد کے چند اقتباسات) — نئی دنیا

۶۹۔ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
شیخ حسام الدین — ماحول

۷۰۔ بیگم زلیخا — حمیدہ سلطان — صبح

۷۱۔ بیگم زلیخا کے مزار پر — " " — ماحول

۷۲۔ پہلی بات (اداریہ) — مدیر صبا — صبا

۷۳۔ " " " — مدیر ماحول — ماحول

۷۴۔ پہلی کرن " — مدیر صبح — صبح

۷۵۔ تذکرہ — محمد مجیب ترجمہ محمد شفیع الرحمٰن — آج کل

۷۶۔ تذکرہ — محمد مجیب — نئی دنیا

۷۷۔ ترجمان القرآن — سعید احمد اکبرآبادی — آجکل

۷۸۔ " " — قاضی بشیر احمد — نئی دنیا

۷۹۔ " " — کبیر احمد جائسی — صبا

۸۰۔ تعلیم کے افادی زاویے — ادارہ نئی دنیا — نئی دنیا

۸۱۔ تقریظ و تبصرہ تذکرۂ صادقہ — قاضی عبدالودود — اردو ادب

۸۲۔ تقسیم کا وجوہ اور نتائج — ادارہ نئی دنیا — نئی دنیا

۸۳۔ تقسیم ہند کی کہانی (انڈیا ونس فریڈم سے چند اقتباسات) — ماحول

۸۴۔ جامع الصفات، جامع حیات، جامع حیثیت — عبدالماجد دریابادی — چٹان

۸۵۔ جشن تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ (الپنچ، پٹنہ ۵ر جولائی ۱۹۰۲ء سے ماخوذ) — اردو ادب

۸۶۔ جیل کے جھروکوں سے — اسداللہ خاں — الجمعیۃ

۸۷۔ چراغ آگہی — متین سروش — صبا

۸۸۔ چند یادیں — نصیر بہادر خاں — چٹان

۸۹۔ چند یادیں — عبدالماجد دریابادی — الجمعیۃ

۹۰۔ چند یادیں — " — شاہراہ

۹۱۔ حضرت امام الہند کی آخری تقریر (۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء کو اردو کانفرنس دہلی کی تقریر) — الجمعیۃ

۹۲۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مکتوب — عبدالرحمٰن — الجمعیۃ

۹۳۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں ڈیڑھ سال — عبدالقیوم خاں — "

۹۴۔ حضرت مولانا کی چند تصویریں — خالد مصطفےٰ صدیقی — نئی دنیا

۹۵۔ حضرت مولانا کی عظیم المرتبت شخصیت (ملک و بیرون ملک کی ممتاز شخصیتوں کا مولانا کو خراج عقیدت) — "

۹۶۔ حضرت مولانا کی قلمی تصویر — خواجہ حسن نظامی — "

۹۷۔ حدیث زندگی: خود امام الہند ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں — علامہ انور صابری (مرتب) — الجمعیۃ

۹۸۔ حقیقت: تاثرات کے پردے میں — ذاکر حسین — الجمعیۃ

۹۹۔ حکیم خاقانی شروانی (مخزن لاہور۔ اگست ۱۹۰۲ء سے ماخوذ) — اردو ادب

۱۰۰۔ خطبۂ احیائے ملت (اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کی جامع مسجد میں مولانا کی تاریخی تقریر) — نئی دنیا

۱۰۱۔ خطوط (مولانا غلام رسول مہر اور منشی عبدالقیوم خطاط کے نام مولانا آزاد کے خطوط) — اردو ادب

۱۰۲۔ دار و رسن کی آزمائش — ادارہ نئی دنیا — نئی دنیا

۱۰۳۔ دعوت عمل (مولانا کی مختلف تحریروں سے اقتباسات) — "

۱۰۴۔ دور حاضر کی عظیم شخصیت — ہمایوں کبیر — الجمعیۃ

۱۰۵۔ رثاء للفقید العظیم (عربی) — الشیخ محمد المامون الدمشقی — "

۱۰۶۔ رفیق تنہائی (تازہ مطبوعات) — ابن خانقاہی — شاہراہ

۱۰۷۔ زباں پہ بار خدایا ۔ ۔ ۔ ۔ — غلام رسول مہر — شاہراہ

۱۰۸۔ زرّیں حدملت — انیس الحسن — الجمعیۃ

۱۰۹۔ ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم — غلام رسول مہر — "

۱۱۰۔ زلیخا — حمیدہ سلطان — آجکل

۱۱۱۔ زلیخائے ہند — ثریا وحید صدیقی — ماحول

۱۱۲۔ " " — " — نئی دنیا

۱۱۳۔ زندگی کے آخری ایام: مختصر علالت اور وصال — انیس الحسن — الجمعیۃ

۱۱۴۔ زندۂ جاوید شخصیت — راجندر پرشاد — نئی دنیا

۱۱۵۔ سفر آخرت — شورش کاشمیری — "

۱۱۶۔ شادی کی ایک تہنیت: انسانی معاشرہ میں ازدواجی موقف — مولانا آزاد — الجمعیۃ

۱۱۷۔ شہنشاہوں کے لباس میں ایک درویش باصفا — آر۔ وینکٹ راؤ — "

۱۱۸۔ صحافتی عظمت — احمد مصطفےٰ راہی — نئی دنیا

۱۱۹۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صحبت یار آخر شد — عبدالرزاق ملیح آبادی — شاہراہ

۱۲۰۔ صفحات مجیدیہ من حیاۃ امام الہند ابی الکلام آزاد (عربی) — استاد محی الدین الالوائی الازہری — الجمعیۃ

۱۲۱۔ عجب آزاد مرد تھا (مختصر سوانح حیات) — سید شہیر الدین — شاہراہ

۱۲۲۔ عظیم المرتبت انسان — آغا آفتاب قزلباش — ماحول

۱۲۳۔ عظیم مفکر — بی۔ وی۔ کیسکر — نئی دنیا

۱۲۴۔ عقیدت کے آنسو — عبدالرزاق ملیح آبادی — "

۱۲۵۔ عوام اور حکومت کا رہنما — گوبند ولبھ پنت — "

۱۲۶۔ عہد آفریں شخصیت — ہمایوں کبیر — آجکل

۱۲۷۔ " " " — " — نئی دنیا

۱۲۸۔ علامہ جمال الدین افغانی اور مولانا آزاد — سلیم احمد تسلیم مینائی — الجمعیۃ
۱۲۹۔ علم، مقصد اور وسیلہ (۸ جنوری ۱۹۵۱ء کو دارالعلوم دیو بند میں مولانا کی یادگار تقریر) — نئی دنیا
۱۳۰۔ علم کو وسیلۂ معاش نہ بناؤ " " " " " — الجمعیۃ
۱۳۱۔ علم و عمل کا سنگم — ذاکر حسین — نئی دنیا
۱۳۲۔ علی گڑھ اور مولانا ابوالکلام آزاد — رشید احمد صدیقی — چٹان
۱۳۳۔ غبارِ خاطر — ثروت ناہید ریحانی — نئی دنیا
۱۳۴۔ " " — ممتاز حسین — ماحول
۱۳۵۔ غبارِ خاطر ایک تاثر — ابو علی اعظمی — شاہراہ
۱۳۶۔ غبارِ خاطر۔ ایک مطالعہ — تاجور سامری — "
۱۳۷۔ غبارِ خاطر پہ ایک نظر — اسلوب احمد انصاری — اردو ادب
۱۳۸۔ غبارِ خاطر کے مسودے کا ایک ورق (عکس تحریر مولانا ابوالکلام آزاد) — چٹان
۱۳۹۔ غزل — مولانا ابوالکلام آزاد — شاہراہ
۱۴۰۔ فتنہ و فساد کی ابتدا — ادارہ نئی دنیا — نئی دنیا
۱۴۱۔ فخرِ دہلی — ملا واحدی — "
۱۴۲۔ فرمودات آزاد (مولانا آزاد کے چند اقوال) — آج کل
۱۴۳۔ فکر و تہذیب کا ایک نگم (اردو ترجمہ) یو۔ این۔ ڈھیبر — الجمعیۃ
۱۴۴۔ فنِ اخبار نویسی — مولانا ابوالکلام آزاد — اردو ادب
۱۴۵۔ قمار بازنہ (افسانہ) " " " — شاہراہ
۱۴۶۔ قولِ فیصل (کلکتہ کی عدالت میں ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد کا تحریری بیان) — نئی دنیا
۱۴۷۔ کردارِ ابوالکلام — علامہ انور صابری — "
۱۴۸۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد — ادارہ نئی دنیا — "
۱۴۹۔ گزارشِ احوال واقعی (اداریہ) — مدیر — شاہراہ
۱۵۰۔ لسان الصدق — عبدالقوی دسنوی — اردو ادب
۱۵۱۔ مادی اور روحانی انقلاب — مولانا ابوالکلام آزاد — الجمعیۃ
۱۵۲۔ مردِ آزاد — خواجہ احمد فاروقی — آج کل
۱۵۳۔ " " — " " — ماحول
۱۵۴۔ مردِ غازی — حبیب الرحمٰن — صبا
۱۵۵۔ مرقعِ جمال — میر مشتاق احمد — نئی دنیا
۱۵۶۔ مزار آزاد پر — عبدالخبیث — ماحول
۱۵۷۔ معرکۂ حق و باطل کی ایک لازوال داستان — مولانا ابوالکلام آزاد — الجمعیۃ

۱۵۸۔ مغالطے اور افسانے (مولانا ابوالکلام آزاد اور دیوان سنگھ مفتوں) — ابو سلمان شاہ جہاں پوری — چٹان
۱۵۹۔ مفتوحہ ممالک میں فاتحین کا داخلہ — مولانا ابوالکلام آزاد — الجمعیۃ
۱۶۰۔ مفتیٔ اعظم فلسطین کا تاثر " " — "
۱۶۱۔ مکاتیبِ ابوالکلام آزاد۔ ایک جائزہ — ریاض الرحمٰن خاں شروانی — صبح
۱۶۲۔ مولانا آزاد۔ ایک تاثر — آل احمد سرور — اردو ادب
۱۶۳۔ مولانا آزاد۔ ایک طبیب ایک مصلح — ابو سلمان شاہ جہاں پوری — صبح
۱۶۴۔ مولانا آزاد۔ چند یادیں — عبدالماجد دریابادی — "
۱۶۵۔ مولانا آزاد۔ غبارِ خاطر کے آئینے میں — گوپی ناتھ امن لکھنوی — آج کل
۱۶۶۔ مولانا آزاد۔ میری نظر اور دل میں " " " — الجمعیۃ
۱۶۷۔ مولانا آزاد اپنے آئینے میں — عتیق صدیقی — اردو ادب
۱۶۸۔ مولانا آزاد اپنے خطوط کے آئینے میں — نیاز فتح پوری — ماحول
۱۶۹۔ مولانا آزاد اپنے معاصرین کے خطوط کی روشنی میں — عبداللطیف اعظمی — جامعہ
۱۷۰۔ مولانا آزاد اور انجمن ترقی اردو — ظ۔ انصاری ادیب — صبح
۱۷۱۔ مولانا آزاد اور فلسفۂ اشتراک — نصرت باقر رضوی — "
۱۷۲۔ مولانا آزاد بحیثیت ایک انسان — خواجہ غلام السیدین — "
۱۷۳۔ مولانا آزاد بحیثیت صاحب طرز — سید اعجاز حسین — ماحول
۱۷۴۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کی نظر میں (اردو ترجمہ) — الجمعیۃ
۱۷۵۔ مولانا آزاد رانچی میں — سہیل عظیم آبادی — ماحول
۱۷۶۔ مولانا آزاد سے ملاقاتیں — محمد وارث کامل — "
۱۷۷۔ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ (اداریہ) — مدیر — چٹان
۱۷۸۔ مولانا آزاد کا ادبی مقام — سید عابد حسین — صبح
۱۷۹۔ مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب (مکتوب الیہ نامعلوم) — نئی دنیا
۱۸۰۔ مولانا آزاد کا بچپن — فاطمہ بیگم — ماحول
۱۸۱۔ مولانا آزاد کا پیغام (عکسِ تحریر) — نئی دنیا
۱۸۲۔ مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ — خواجہ غلام السیدین — ماحول
۱۸۳۔ مولانا آزاد کا ذہنی پس منظر — محمد عتیق صدیقی — شاہراہ
۱۸۴۔ مولانا آزاد کا فلسفۂ تعلیم — ادارہ نئی دنیا — نئی دنیا
۱۸۵۔ مولانا آزاد کا مرتبہ بحیثیت اردو انشا پرداز کے — عبدالقادر سروری — صبا
۱۸۶۔ مولانا آزاد کی دوسری برسی (اداریہ) — مدیر — جمہور
۱۸۷۔ مولانا آزاد کی شخصیت آثار ابوالکلام کی روشنی میں — ریاض الرحمٰن خاں شروانی — آج کل

۱۸۸۔ مولانا آزاد کی شخصیت اردو شاعری کے آئینے میں
محمد شرف الدین ساحل — صبح

۱۸۹۔ مولانا آزاد کی چند جھلکیاں — غلام رسول مہر — جامعہ

۱۹۰۔ مولانا آزاد کی شخصیت کے بعض اہم پہلو
ریاض الرحمٰن خاں شروانی — نئی دنیا

۱۹۱۔ مولانا آزاد کی صحافتی عظمت — نیاز فتحپوری — آج کل

۱۹۲۔ مولانا آزاد کی گھریلو زندگی — محمد اجمل خاں — ماحول

۱۹۳۔ مولانا آزاد کی نثر نگاری — عبدالوحید رحمانی بنارسی — الجمعیۃ

۱۹۴۔ مولانا آزاد کی نفسیات اُن کے ادب کے آئینے میں
قاضی عبدالغفار — شاہراہ

۱۹۵۔ مولانا آزاد کے احسانات اردو ادب پر
مالک رام — ماحول

۱۹۶۔ " " " " " — صبا

۱۹۷۔ مولانا آزاد کے افکار و عزائم کی زندہ تصویر: جمعیۃ العلمائے ہند
انیس الحسن — الجمعیۃ

۱۹۸۔ مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات — عبداللہ ولی بخش قادری — صبح

۱۹۹۔ مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے — " " — جامعہ

۲۰۰۔ مولانا آزاد کے چند خطوط (مولانا غلام رسول مہر، ایم اے زکریا اور یحییٰ اعظمی کے نام مولانا کے خطوط کے عکس) — آج کل

۲۰۱۔ مولانا آزاد کے چند خطوط (ظفر علی خاں، سید سلیمان ندوی اور مولانا احمد رضا خاں کے نام مولانا کے چند خطوط) — جامعہ

۲۰۲۔ مولانا آزاد کے دینی افکار اور وحدتِ ادیان کا مفہوم
اخلاق حسین قاسمی — الجمعیۃ

۲۰۳۔ مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں
علی بہادر خاں — آج کل

۲۰۴۔ مولانا آزاد کے لمحاتِ غم — رفعت حسینی — صبح

۲۰۵۔ مولانا آزاد کے متعلق کچھ یادداشتیں
عبدالسلام ہاشمی — الجمعیۃ

۲۰۶۔ مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور اُن کے جواب
محمد اجمل خاں — آج کل

۲۰۷۔ مولانا آزاد وزارتِ تعلیم کی مسند پر
اشفاق حسین — الجمعیۃ

۲۰۸۔ مولانا ابوالکلام — پنڈت سندر لال — صبا

۲۰۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد — پنڈت سندر لال — ماحول

۲۱۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد — رشید احمد صدیقی — "

۲۱۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد — رشید جالندھری — چٹان

۲۱۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد — شریف چکوال — "

۲۱۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد — خواجہ غلام السیدین — آج کل

۲۱۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد — نصیر الدین ہاشمی — صبا

۲۱۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد انشا و ادب کے میدان میں
قاضی عبدالغفار — الجمعیۃ

۲۱۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد: ایک تاثر
مولانا انور صابری — الجمعیۃ

۲۱۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد: ایک نادرِ روزگار شخصیت
غلام رسول مہر — آج کل

۲۱۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد: صحافی اور ادیب
مالک رام — صبح

۲۱۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد: مالا اور یا معکس
محمد ظفر حیات — چٹان

۲۲۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مہد سے لحد تک — "

۲۲۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور شاعری — عبدالغفار شکیل — اردو ادب

۲۲۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور نماز — نصر اللہ خاں عزیز — ماحول

۲۲۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندی فلسفہ
صفی الدین صدیقی — صبا

۲۲۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا قلم اور جنگِ آزادی
فیض الرحمٰن اعظمی — الجمعیۃ

۲۲۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک خود نوشت سوانح: تذکرہ
ابو علی اعظمی — "

۲۲۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی بھوپال سے خاص نسبت
سید محمد یوسف قیصر — نئی دنیا

۲۲۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی پہلی تقریر — عرفان بن شوق نیموی — اردو ادب

۲۲۸۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی عظیم شخصیت
اشفاق حسین — صبا

۲۲۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و دماغی کاوشوں پر طائرانہ نظر
محمد عبدالشاہد خاں شروانی — اردو ادب

۲۳۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب زندگی — حسن عسکری — "

منظومات

۲۸۔	بارگاہِ آزاد میں	سید رضوان بریلوی	نئی دنیا
۲۹۔	بیادِ آزاد	وقار انبالوی	چٹان
۳۰۔	بیادِ ابوالکلام	خواجہ مقبول احمد	جمہور
۳۱۔	تاثرات	محشر اعظمی	الجمعیۃ
۳۲۔	تاثراتِ غم	یحییٰ اعظمی	"
۳۳۔	تاریخ ہائے رحلت	بادی القادری بدایونی	نئی دنیا
۳۴۔	تصویر ابوالکلام	علامہ انور صابری	الجمعیۃ
۳۵۔	تعزیت	علامہ جمیل مظہری	نئی دنیا
۳۶۔	تاریخ انتقال ابوالکلام آزاد	بادی القادری بدایونی	آج کل
۳۷۔	تیرے بعد	اعجاز صدیقی	"
۳۸۔	" "	طاہر شادانی	ماحول
۳۹۔	چراغِ علم و فن	جگن ناتھ آزاد	صبا
۴۰۔	حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا	سیدہ فرحت	نئی دنیا
۴۱۔	خضرِ حیات	شمیم کرہانی	آج کل
۴۲۔	دیدہ ور	بشیر النساء بیگم	صبا
۴۳	رباعی	حافظ محمد اسحاق	الجمعیۃ
۴۴۔	رسمِ زباں عام رہی	غفور انیس	صبا
۴۵	روح کی آواز	نشتر خانقاہی	شاہراہ
۴۶۔	زندۂ جاوید	خان آصف رام پوری	نئی دنیا
۴۷	شمعِ انجمن	اظہر دیوبندی	"
۴۸۔	فردوسِ گمشدہ بیادِ آزاد	فضا ابن فیضی	آج کل
۴۹۔	فی تاریخ وفات ترجمان القرآن امام الہند (عربی)	عبدالرشید للارشد	الجمعیۃ
۵۰۔	قربانیوں سے جس کی محکم وفا کی بنیاد	مانی جائسی	نئی دنیا
۵۱۔	قطعۂ تاریخ وفات	ذاکر بنگلوری	آج کل
۵۲۔	" "	رحمت بلند شہری	الجمعیۃ
۵۳۔	" "	سرفراز حسین خبیر لکھنوی	آج کل
۵۴۔	" "	ظہور الحسن ناظم سیوہاروی	الجمعیۃ
۵۵	" "	محمد ادریس نسیم دہلوی	"
۵۶۔	" "	محمد جمیل الرحمٰن	"
۵۷۔	" "	محمد عبدالبصیر ٹونکی	"
۵۸۔	قطعۂ تاریخ وفات	محمد عمر نظمی	نئی دنیا
۵۹۔	قطعہ تاریخ بائیں وفاتِ آزاد	منظور علی تمنا بجنوری	آج کل
۶۰۔	قطعہ ہائے تاریخ وفات	صادق بستوی	الجمعیۃ
۶۱۔	ماتمِ آزاد	افضل قریشی	نئی دنیا
۶۲۔	ماتمِ آزاد	تلوک چند محروم	ماحول
۶۳۔	" "	"	نئی دنیا
۶۴۔	" "	علامہ جمیل مظہری	آج کل
۶۵۔	" "	فرحت القادری	الجمعیۃ
۶۶۔	ماتمِ یک شہر آرزو (نذر ابوالکلام)	شاذ تمکنت	صبا
۶۷۔	مادہ ہائے تاریخ وفات	محمد ادریس نسیم دہلوی	الجمعیۃ
۶۸۔	مردِ آزاد	وفا صدیقی بھوپالی	صبا
۶۹۔	مردِ تیز گام	علامہ انور صابری	ماحول
۷۰۔	" "	"	نئی دنیا
۷۱۔	مردِ خدا	گوپی ناتھ امن لکھنوی	ماحول
۷۲۔	مردِ مجاہد	نیاز حیدر	شاہراہ
۷۳۔	مرکبِ احساس	حسن حمیدی	"
۷۴۔	مقامِ آزاد	فضا کوثری	الجمعیۃ
۷۵۔	مولانا آزاد ــ غالب کی زبان میں	مرزا نذر حسین نذیر	"
۷۶۔	مولانا ابوالکلام آزاد	بسمل سعیدی ٹونکی	آج کل
۷۷۔	" "	"	نئی دنیا
۷۸۔	" "	جگن ناتھ آزاد	چٹان
۷۹۔	" "	شورش کاشمیری	"
۸۰۔	مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار پر	بسمل سعیدی ٹونکی	الجمعیۃ
۸۱۔	نازشِ ہندوستان	مفتی بشیر الدین احمد بشیر	"
۸۲۔	نذرِ آزاد	نگار امام۔ اے	ماحول
۸۳	" "	"	نئی دنیا
۸۴۔	نذرِ عقیدت	عزیز احمد عزیز بنارسی	الجمعیۃ
۸۵۔	نقشِ جاوداں	محشر بدایونی	ماحول
۸۶۔	نوحۂ ابوالکلام	رشید کیفی	صبا
۸۷۔	یغفرک اللہ	روحی الٰہ آبادی	آج کل

صفیہ عارف صدیقی

مولانا ابوالکلام آزاد پر
منتخب مضامین کی وضاحتی فہرست

۱۔ ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالکلام آزاد   قومی آواز، ضمیمہ ہفتہ وار، ۲۱، فروری ۸۸ء: ۱

اس مضمون میں مولانا ندوی نے مولانا آزاد کے ساتھ ہوئی اپنی ملاقاتوں کا تذکرہ کیا اور مولانا کی علمی بصیرت، سیرت اور احسن کردار پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

ہندوستان میں تاریخِ دعوتِ اسلامی کا ایک باب :۔ مولانا آزاد اور تحریک نظم جماعت۔

برہان، ۶۵(۳) ستمبر ۱۹۷۰ء : ۱۵۳ — ۱۷۷،

مولانا کے مذہبی طرزِ فکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا نے مسلم قوم کو متحد کرنے کے لیے اور خاص طور سے تنظیم جماعت اور امامت کے مسئلے کو سلجھانے کے لیے جو کوششیں کیں ان کا اچھا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

الہلال کلکتہ : تاریخ، خصائص و مقاصد اور فن کی روشنی میں ـــــ

جامعہ، ۸۵ (۲): فروری ۸۸ء: ۱۰۰—۱۱۴۔

مولانا آزاد کے رسالہ "الہلال" کی تاریخ اور اس کے اسلوب کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس رسالے نے جن اغراض و مقاصد کو پورا کیا اور ایک نازک وقت میں قوم کی جو خدمات انجام دیں، انھیں بھی سراہا گیا ہے۔

۴۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

نقوشِ امام الہند: مولانا ابوالکلام آزاد پاکستان میں ـــــ

اردو ادب، ۱: ۱۹۶۴ء: ۱۴۸ — ۱۵۹

مصنف نے پاکستان میں مولانا کے متعلق رجحانات کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق تقسیم ملک کے وقت اور بعد میں بھی پاکستان میں مولانا کے لیے کوئی خاص سنجیدہ فضا قائم نہیں تھی لیکن رفتہ رفتہ حالات بدلنے لگے اور ۱۹۶۴ء میں (جب یہ مضمون احاطۂ تحریر میں آیا) پاکستان میں بھی مولانا کے علوم و معارف اور افکار و نظریات کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔

۵۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا آزاد، اور فرجاد مرحوم: حالات و خطوط۔ اردو ادب، ۱: ۷۰ء: ۷۱ — ۷۷۔

قاضی زین العابدین فرجاد اور مولانا کے تعلقات نیز مولانا آزاد کے نام قاضی فرجاد کے خطوط کا جائزہ لیا گیا اور خطوط کا متن بیان کیا ہے اور قاضی فرجاد کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

۶۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

نقوشِ امام الہند: مولانا آزاد پر کتابیں اور رسالے۔ اردو ادب ۳: ۱۹۶۷ء: ۵ — ۳۲۔

مولانا آزاد سے متعلق تحقیق و ترتیب کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا پر شائع ہونے والی کتابوں اور جرائد پر مشتمل یہ مضمون ایک ضخیم ببلوگرافی کا حصہ ہے اور اس اشاریے میں صرف مولانا پر مستقل کتابوں اور رسالوں کے خاص نمبروں کا تذکرہ ہے۔ اس مضمون کے دوسرے حصے (شمارہ ۳) میں رسالوں کا ذکر ہے۔

● ۱۷۴۷، میر جملہ لین، لال کنواں، دہلی ۶

۷۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا ابوالکلام آزاد پر پہلی کتاب ۔ معارف، ۹۹ (۴): اپریل ۱۹۶۷ء: ۲۹۵—۳۰۵

مولانا آزاد پر شائع ہونے والی پہلی کتاب "امام الاحرار اور مولانا ابوالکلام آزاد" پر تبصرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں مولانا پر شائع ہونے والی دوسری کتابوں کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔

۸۔ ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا ابوالکلام آزاد ـــــ ندائے ملت، ۲۲ (۴۱): یکم نومبر ۱۹۸۰ء: ۳۴

صحافتی سرگرمیوں کے ذریعہ مولانا نے قوم و ملک کے لیے کیا خدمات انجام دیں اور "الہلال" کا بنیادی مقصد کیا تھا، ان سب نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۹۔ اخلاق حسین قاسمی

وحی و نبوت کے تصور میں: سرسید اور مولانا آزاد کا اختلاف ـــــ برہان، ۱۰۰ (۳): ستمبر ۸۷ء: ۱۷۷—۱۸۰۔

یہ مضمون مصنف کے ایک ضخیم تبصرے کا حصہ ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کی علمی، ادبی اور تفسیری خصوصیات پر کیا ہے۔ اس مضمون میں تصور وحی کے معاملے پر سرسید احمد خاں اور مولانا آزاد کے نظریات کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۰۔ آزاد (جگن ناتھ)

مولانا آزاد کا شعری ذوق ... قومی راج، ۳۱ (۱۴): ۱۰ ستمبر ۸۶ء: ۱۱، ۱۸

مختلف حوالوں سے مولانا کے شعری ذوق کا جائزہ لیا ہے۔ ان حوالہ جات میں مولانا عبدالرزاق اور ڈاکٹر سید عبداللہ شامل ہیں۔

۱۱۔ امید ادیب

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ـــــ قومی راج، ۹ (۲۴): ۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ء: ۱۲—۱۹

مولانا کے خاندانی پس منظر، ان کی پیدائش، تعلیم و تربیت، سیاسی کارکردگیوں اور ادبی کاوشوں نیز ان کے مختلف شوق جیسے تیراکی، موسیقی وغیرہ پر ایک جائزہ ہے۔

۱۲۔ بھٹاچاریہ (شانتی رنجن)

مولانا آزاد اور تحریک آزادی: ۱۹۲۵ء کی ایک خفیہ رپورٹ کے آئینے میں، نیا دور، ۳۹ (۵): اگست ۸۴ء: ۴—۷

کلکتہ آرکائیوز میں محفوظ مولانا کی فائیل سے وہ خفیہ رپورٹ نکال کر پیش کی ہے جو ۱۹۲۵ء میں حکومت وقت نے سی۔ آئی۔ ڈی کے ذریعہ تیار کرائی تھی جس سے مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کا خاصا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۳۔ بیدار (عابد رضا)

مولانا آزاد، غبار خاطر اور کاروان خیال ـــــ برہان، ۴۴ (۴) اپریل ۶۰ء: ۲۲۹—۲۵۶۔

مولانا کی دو کتابوں کاروان خیال اور غبار خاطر کا تقابلی مطالعہ ہے۔ مصنف نے مولانا کے ایسے خطوط شامل کیے ہیں جو دونوں کتابوں میں مشترک ہیں۔ ان میں کچھ خط ایسے بھی ہیں جن میں بقول مصنف خود مولانا نے بعد میں ردوبدل کر دی ہے۔

۱۴۔ حسن نجمی

مولانا آزاد پر سہ روزہ سیمینار ـــ ہماری زبان، ۴۴ (۴۲) ۱۵ نومبر ۱۹۸۰ء: ۸، ۹

اردو اکادمی دہلی کی جانب سے منعقد کیے گئے ایک سہ روزہ سیمینار کی رپورٹ ہے حسن نجمی صاحب نے ہر اجلاس میں پڑھے جانے والے مقالات اور ہونے والے مباحثوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔

۱۵۔ حسین امین

مولانا آزاد اور لکھنؤ کا خمیرہ ـــــ قومی آواز، ہفتہ وار ضمیمہ: ۲۱ فروری ۸۸ء: ۳

مصنف نے مولانا کی تمباکو نوشی سے دلچسپی کا ذکر اپنے والد جناب امین سلونوی صاحب کے توسط سے کیا ہے جو مولانا کے اچھے شناسا تھے اور مولانا کی دلچسپیوں کا خیال رکھتے تھے۔

۱۶۔ خالد محمود

مولانا آزاد بحیثیت صحافی ـــــ ندائے ملت، ۳۴ (۱۸): ۵ مئی ۸۸ء: ۲۱—۲۲

مولانا کی ابتدائی زندگی پر کچھ مواد ہے اور مضمون کا زیادہ حصہ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں خاص طور پر صحافتی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

۱۷۔ دعوت

تکلیف دہ روش ـــ دعوت (سہ روزہ)، ۲۵ فروری ۸۸ء: ۳

اس اداریے میں مولانا آزاد کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم"

کے غیر مطبوعہ صفحات پر چلنے والی بحثوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں اداریے نے اپیل بھی کی ہے کہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس تکلیف دہ روش کو چھوڑ کر مولانا کے اصولوں کو مجروح ہونے سے بچالیں۔

۱۸۔ ذاکر حسین

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت ـــ جامعہ، ۸۵ (۲)، فروری ۸۸ء ۱۱، ۱۴۔

ذاکر حسین صاحب نے مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کے ساتھ اپنے تعلقات و تجربات کو بیان کیا ہے۔ ان کی خدمات کو سراہا ہے نیز ان کی قائم کردہ مثالوں کو قائم رکھنے کی اپیل بھی کی ہے۔

۱۹۔ ذکی (ایم قاسم)

مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو ـــ قومی آواز، ۲۴ فروری ۸۹ء: ۳، ۶

مولانا آزاد کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو انھوں نے اردو کے تحفظ اور فروغ کے لیے کیں۔

۲۰۔ رضوی (خورشید مصطفیٰ)

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت ـــ قومی آواز (ضمیمہ)، ۱۸ ستمبر ۸۸ء: ۱، ۴۔

مولانا کی سیاسی بصیرت اور سیاسی نظریات کا جائزہ لیا ہے اور تحریکِ خلافت نیز کانگریس پارٹی میں مولانا نے جو کردار ادا کیا، اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۱۔ رفیع اللہ

اسلامی قانون مولانا آزاد کی نظر میں ـــ برہان، ۴۵ (۲): اگست ۱۹۶۰ء: ۱۱۷ تا ۱۲۲

مولانا آزاد کے مذہبی نقطۂ نظر کو واضح کرتا ہے۔ مولانا کے خیالات پیش کرنے سے پہلے اسلامی قوانین کی تعریف بیان کی گئی ہے اور شریعت و قانون کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔

۲۲۔ شیخ (ایم۔ ایچ)

مولانا ابوالکلام آزاد: صفِ اوّل کے سیاستداں ـ قومی راج، ۱۸ دسمبر ۸۹ء: ۷۷ تا ۷۸

موضوع مولانا کی سیاسی سرگرمیاں ہیں۔ مولانا کی سیاسی کوششیں ان کی صحافتی کاوشوں سے وابستہ تھیں اس لیے ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۳۔ صابر (محمد سلیمان)

مولانا آزاد، شخصیت، ادب اور صحافت ـــ قومی آواز، ۵ مارچ ۸۹ء: ۳

مولانا کی شخصیت کے دو اہم پہلو۔ "ادب اور صحافت" اجاگر کیے گئے ہیں۔

۲۴۔ صباح الدین عمر

مولانا ابوالکلام آزاد کو رسوا کرنے کی سازش ـــ ہماری زبان، ۴۷ (۶)، ۸ فروری ۸۸ء: ۳

ملک زادہ منظور احمد کی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و فن" اور "مولانا ابوالکلام آزاد۔ الہلال کے آئینے میں" کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے نیز مولانا کے چند خطبات پر بھی نظر ڈالی ہے۔

۲۵۔ صدیقی (محمد عتیق)

الہلال کا انڈکس ـــ اردو ادب، ۲: ۱۹۶۱ء: ۱۳۳، ۱۶۸

"الہلال" پر تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے نیز رسالہ کے موضوع وار انڈکس کی حرف الف کی تقطیع پر مشتمل انڈکس بھی پیش کیا ہے۔

۲۶۔ عارفی (فخر الدین)

قومی ایکتا کے علمبردار۔ مولانا ابوالکلام آزاد ـ زبان و ادب، ۱۲ (۱) جنوری۔ مارچ ۸۷ء: ۱۱۳، ۱۱۶

زندگی سے متعلق مولانا کے نظریے کی وضاحت کی گئی ہے۔ مولانا کی سیاسی سرگرمیوں اور ان کے علمی و ادبی ذوق کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

۲۷۔ عبدالقوی دسنوی

مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار "پیغام" ـ آج کل، ۴۳ (۵) دسمبر ۸۴ء: ۵۰، ۵۸

مولانا کی صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے ہفتہ وار رسالے "پیغام" کے اغراض و مقاصد پیش کیے ہیں۔ رسالے کی مشمولات اہم خبریں اور تحریریں بھی شاملِ مضمون ہیں۔

۲۸۔ عبداللطیف اعظمی

مولانا ابوالکلام آزاد ـــ جامعہ، ۸۰ (۳): مارچ ۸۳ء: ۳۰، ۳۴

مضمون مولانا کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتا ہے اور ان کی تہہ دار شخصیت پر سے پردے بھی اٹھاتا ہے۔

۲۹۔ عبداللطیف اعظمی

مولانا ابوالکلام آزاد پر بے بنیاد الزامات ـــ زبان و ادب، ۱۳ (۲)

اپریل - جون ۱۹۸۶ء : ۲۴ - ۴۶ ،

ہماری زبان — دہلی ۱۵، اپریل ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئے نثار احمد فاروقی کے ایک مضمون کی تردید کی ہے۔ مصنف نے مختلف اعتراضات اور ان کے جوابات دیے ہیں۔

۳۰۔ عبداللطیف اعظمی

مولانا آزاد کا صد سالہ یوم پیدائش — ہماری زبان، ۴۹ (۴۲) یکم نومبر ۱۹۸۷ء : ۸

اس مضمون میں مصنف نے مولانا آزاد پر لکھی گئی متعدد کتابوں کا تذکرہ کیا ہے اور آخر میں چند موضوعات بھی دیے ہیں۔ جن پر ابھی کام ہونا چاہیے۔

۳۱۔ عبداللطیف اعظمی

ابوالکلام آزاد : تاریخی غلطیاں — آج کل، ۴۶ (۳) اکتوبر ۱۹۸۷ء

۱۵ - ۱۰، ۲۳

یہ مضمون مولانا پر لکھی جانے والی ایک کتاب "ابوالکلام آزاد" مؤلفہ عبدالقوی دسنوی" پر تبصرہ ہے۔ کتاب میں درج متضاد تاریخوں اور بیانات کی نشاندہی کی ہے۔

۳۲۔ غفران احمد

مولانا ابوالکلام آزاد — صبح امید، ۴۹ (۳) مارچ ۱۹۸۴ء : ۵-۸

۳۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد — سب رس، ۴۴ (۳) مارچ ۱۹۸۴ء : ۲۵-۳۱

مولانا کی ہمہ گیر شخصیت پر مجموعی طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں مولانا کے بارے میں پنڈت نہرو اور غلام رسول مہر کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

۳۴۔ فاروقی (خواجہ احمد)

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد — مبصر، (۹) اگست ۱۹۸۱ء : ۹-۱۷

۳۵۔ فاروقی (ضیاء الحسن)

افکار آزاد کی معنویت: آزاد ہند کے مسلمانوں کے لیے — جامعہ ۸۳ (۲) فروری ۱۹۸۶ء : ۷ - ۱۳ ،

اسلام اور عصر جدید، ۱۸ (۱) : جنوری ۱۹۸۶ء : ۵ - ۱۲

جامعہ، ۸۵ (۲) : فروری ۱۹۸۸ء : ۵ - ۱۰

مولانا کے افکار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ مولانا کے افکار سے فیض حاصل کرکے ہندوستان کے مسلمان آج بھی ملک کی تاریخ میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔

۳۶۔ فاروقی (ضیاء الحسن)

بشارات : مولانا آزاد — جامعہ، ۸۳ (۲) فروری ۱۹۸۶ء : ۳-۶

اس میں جہاں مولانا کے کارناموں کا ذکر عقیدت سے کیا گیا ہے وہیں مصنف نے ان کے مخالفین کے طرز عمل کو بھی روشن کیا ہے۔

۳۷۔ فاروقی (عماد الحسن)

علامہ اقبال اور مولانا آزاد : خطبات اور ترجمان القرآن کی روشنی میں۔

جامعہ، ۸۵ (۲) : فروری ۱۹۸۸ء : ۷۷ — ۹۷

علامہ اقبال اور مولانا آزاد کا تجزیہ بحیثیت مفکر اور شارح اسلام کے کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں ان دونوں کے خطبات اور ترجمان القرآن کو مد نظر رکھا ہے۔

۳۸۔ فاروقی (نثار احمد)

مولانا آزاد کا خاندانی پس منظر — ہماری زبان، ۴۰ (۱۰) ۱۱ اپریل ۱۹۸۶ء : ۱ — ۳

مولانا کے خاندانی کوائف کا جائزہ لیا ہے۔ مصنف کو مولانا کے بیانات سے اکثر جگہ اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی تائید میں کئی دلیلیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

۳۹۔ قطب اللہ

مولانا آزاد اکادمی — قومی آواز ضمیمہ، ۲۱ فروری ۱۹۸۸ء : ۳

اس انشائیے میں مولانا کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے نام سے کھولی جانے والی "مولانا آزاد میموریل اکادمی" کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۰۔ مالک رام

مولانا ابوالکلام آزاد : پہلے بیس سال — تحریر، ۲ (۱) ۱۹۶۸ء

۵ — ۹۷ ،

مولانا آزاد کی زندگی کے ابتدائی ۲۰ برسوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

۴۱۔ محمد حسن

ابوالکلام آزاد اور ہم — قومی آواز، ۸ (۱۰۸) : ۱۹ اپریل ۱۹۸۸ء : ۳

مصنف نے مولانا کی طرز فکر و عمل اور زندگی کے بارے میں ان کے نظریات کو پیش کیا ہے۔

۴۲۔ محمود احمد برکاتی

انتخاب امام الہند — میثاق، ۳۵ (۱) جنوری ۱۹۸۶ء : ۱ - ۹

راقم نے مولانا اسرار احمد کی کتاب "نظم جماعت اور انتخاب امام الہند" کے حوالے سے اس مسئلہ پر مولانا آزاد کے نظریات اور ان کے حامی و منکرین کے تاثرات پیش کیے ہیں۔

۴۳۔ مسینوں (لوئی)

بہار اردو اکادمی کی مطبوعات

بہار اردو اکادمی اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت مسلسل اہم موضوعات پر کتابیں شائع کر رہی ہے، جو ملک کے مشاہیر مصنفین کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اکادمی کا ایک سہ ماہی ادبی جریدہ "زبان و ادب" جو اپنی گراں قدر خوبیوں کے سبب علمی و ادبی حلقوں میں شہرت اور مقبولیت رکھتا ہے، پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

اکادمی کے زیرِ اہتمام "اردو بھون" پٹنہ میں ایک سیلس سنٹر بھی حال ہی میں قائم کیا گیا ہے، جہاں اکادمی کی درج ذیل مطبوعات دفتری اوقات کے دوران ہمیشہ دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر کتب فروشوں کے یہاں سے بھی ہماری مطبوعات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

کتاب کا نام	مصنف/مرتب	قیمت
۱۔ کلیاتِ شاد (حصہ اوّل، دوم، سوم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	100.00
۲۔ دیوانِ جوشش	"	25.00
۳۔ مقالاتِ قاضی عبدالودود حصہ اوّل	"	20.00
۴۔ رقصِ شرر	"	10.00
۵۔ دیوانِ سجاد اکبرآبادی	ڈاکٹر شمیم احمد	10.00
۶۔ اختر اورینوی کے افسانے	ڈاکٹر عبدالمغنی	15.00
۷۔ بہار کے نظم نگار شعراء	ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی	20.00
۸۔ ودیاپتی - حیات اور شاعری	شمیم احمد صدیقی	10.00
۹۔ سوانح عمری مولانا آزاد	مشتاق احمد	10.00
۱۰۔ سیلِ آتش	سید فضل احمد	12.00
۱۱۔ دنکر حیات اور شاعری	خواجہ بدیع الزماں	10.00
۱۲۔ نامۂ شوق	سید صابر حسن	15.00
۱۳۔ محشرِ انقلاب	علامہ سرور کاکوری بینائی	12.00
۱۴۔ سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے	ڈاکٹر وہاب اشرفی	12.00
۱۵۔ حافظ محمود شیرانی (مجموعہ مقالات)		20.00
۱۶۔ حسرت موہانی (مجموعہ مقالات)		15.00
۱۷۔ دنیا کی لوک کہانیاں	احمد جمال پاشا	14.00
۱۸۔ مثنوی سحرالبیان	میر حسن	8.00
۱۹۔ نیرنگِ خیال	محمد حسین آزاد	7.50
۲۰۔ انتخابِ مضامینِ سرسید		7.50
۲۱۔ یادگارِ سلیمان	عبدالقوی دسنوی	25.00
۲۲۔ مقالاتِ نصیر حسین خیال	سید نقی احمد ارشاد	20.00
۲۳۔ اکبر الٰہ آبادی	(سمینار کے مقالات)	20.00
۲۴۔ ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء	اقبال حسین	16.00
۲۵۔ آموزشِ اردو	مصنفہ ڈاکٹر رضیہ تبسم	12.00
۲۶۔ کلیاتِ منتظر	سلمان شمسی ندوی	7.50
۲۷۔ عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ	سید ریاست علی ندوی	35.00
۲۸۔ قومی تحریک اور ہندوستانی آئین	عبدالصمد	20.00
۲۹۔ گرٹیا رانی	ریحان حمیدی	7.50
۳۰۔ اردو کا افسانوی ادب	(مجموعہ مقالات)	20.00
۳۱۔ اپنی تلاش میں (حصہ دوم)	پروفیسر کلیم الدین احمد	28.00
۳۲۔ بدچلن	سرت چندر چٹرجی	35.00
۳۳۔ نغمۂ سنگ	رمز عظیم آبادی	16.00
۳۴۔ حقیقت بھی کہانی بھی	سید بدرالدین احمد	40.00
۳۵۔ آثارِ جمیل	رضا مظہری	30.00
۳۶۔ چند تنقیدیں	سید ریاست علی ندوی	13.00
۳۷۔ مقالاتِ عظیم الدین احمد	(مجموعہ مقالات)	13.00

زیرِ طبع:

کتاب کا نام	مصنف/مرتب
۳۸۔ معاشیات کے بنیادی اصول	ڈاکٹر اے۔ ایم منظر
۳۹۔ خطوطِ شبلی بنام آزاد	ڈاکٹر سید محمد حسنین
۴۰۔ مولانا ابوالکلام آزاد	پروفیسر عبدالقوی دسنوی

زبان و ادب (سہ ماہی)
ایڈیٹر: شین مظفر پوری
سالانہ خریداری: 20-00 روپے
فی کاپی: 5-00 روپے

ناشر: بہار اردو اکادمی

اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ

رشید الدین خاں •

مولانا ابوالکلام آزاد کے دو بڑے سیاسی کارنامے ★

مولانا ابوالکلام آزاد کے دو سیاسی کارنامے ہندوستانی قومیت کی بڑی میراث ہیں۔ ایک نظریاتی اور ایک عملی، ایک اجتہادی اور ایک مجاہدانہ۔

ان کا نظریاتی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تعلیماتِ قرآنی، رسولِ کریمؐ کے اسوۂ حسنہ اور تاریخ اسلام کی روشنی میں متحدہ قومیت کے شرعی اور مذہبی جواز کا ایک عالمانہ استدلال پیش کیا، جو اپنے اجتہادِ فکر، جراتِ ایمانی اور خلوصِ سیاسی کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔

ان کا عملی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے متحدہ قومیت کی سیاست اور مشترکہ گنگا جمنی تہذیب (Composite Culture) کی روایات کو تحریکِ آزادی کے زمانے میں اجتماعی قومی زندگی کی اساس بنانے، اور آزادی کے بعد اس کو ہندوستان کے نئے سیکولر جمہوری نظام سے وابستہ اور منسلک کرنے میں اپنی کاوشوں اور تمناؤں کا بنیادی مرکز بنالیا تھا۔ ان کی زندگی کا بہترین حصہ اسی منصوبہ کو عملی ترتیب دینے میں صرف ہوا۔

ان دو کارناموں کو ہندوستان کی قدیم اور مسلسل تاریخ اور پیچیدہ سماجی پس منظر میں دیکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمیں ایک طرف مسائل کی پے در پے مشکلات کا اندازہ ہو اور دوسری طرف ہم خلوص سے مولانا کے عزم اور یقین کی داد دے سکیں اور میر کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ہندوستان اور چین دنیا کے دو ہی ممالک بلکہ ان کو برِ صغیر کہنا چاہیے ایسے ہیں جن کا تمدن بے رخنہ اور بغیر قطع ہوئے ہزاروں سال سے قائم و دائم ہے۔ (Uninterrupted Civilization) عہدِ عتیق میں کئی تمدن ابھرے اور مرورِ زمانہ سے تہ و بالا ہو گئے۔ بعض کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔ بہت سے تمدن یا تسلسل باقی نہیں رہے، گو ملکوں کے نام وہی باقی رہ گئے۔ جیسے مصر، یونان، روم یا بعض ختم ہی ہو گئے جیسے اسیریا، سومیریا، ازٹک، میکسیکو وغیرہ۔ اقبال نے اسی تاریخی حقیقت کی طرف بڑا حکیمانہ اشارہ کیا ہے، جس کو اپنی مختلف تقریروں میں جواہر لال نہرو دہرایا کرتے تھے کہ ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

مگر چین اور ہندوستان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ چین میں یک رنگی زیادہ ہے۔ کیوں کہ اس کی آبادی کی اکثریت ہان قبیلہ (Han Race) کی شاخوں پر منقسم ہے، گو کچھ اور قبیلوں اور نسلوں کے لوگ بھی ہیں جیسے : مان، چن، ہوئی، ادیگر، تبتی وغیرہ۔ ہوئی اور ادیگر مسلمان ہیں اور تبتی لاما وادی بدھ مذہبی ہیں۔ برعکس اس کے ہندوستان کی تاریخی خصوصیت ہی یہ رہی ہے کہ صدیوں سے دریا کی موجوں کی طرح جوق در جوق قبائلی قافلے نسلوں کے کارواں آتے رہے بستے رہے اور اس مردم خیز دھرتی کو مالامال کرتے رہے۔ یہ انسانی غول تاریخ کے ہر عہد میں آتے رہے، خصوصاً شمال مغرب سے گو کچھ شمال مشرق سے بھی آئے، اور دل کش و خوش گوار وادیوں میں دریاؤں کے کنارے اپنی آرزوؤں اور امنگوں کی کھیتیاں لہراتے رہے۔ گنگا جمنا، راوی، بیاس، جہلم، ستلج، نرمدا، گوداوری، مہاندی، کرشنا اور برہم پتر، ان سب کے کنارے ہماری تاریخ کی رنگا رنگی کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے اقبال کی زبان میں فخریہ ہم یہ گاتے رہے کہ ؎ اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

★ پروفیسر صاحب کا مضمون بہت تاخیر سے موصول ہوا، بحالتِ مجبوری ترتیب میں آخر میں شامل کرنا پڑا ——— ادارہ

• پروفیسر سیاسیات، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

گودی میں کھیلتی ہیں، جس کے ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

مگر اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے تاریخ کے ہر موڑ پر جو انسانی قافلے یہاں آئے وہ اپنے ساتھ نقش و رنگ بھی لائے۔ یہ ورثے زبان کے، بیان کے، عقیدے کے، فکر کے، رسوم و رواج کے، طریقۂ حیات کے، رہنے سہنے کے، گانے اور موسیقی کے، کھانے اور ضیافت کے، غرض زندگی کی سب ہی کاوشوں اور امنگوں کے ورثے بھی لائے۔ اسی کے ساتھ یہاں پہنچ کر، اور دیگر انسانی گروہوں سے میل جول اور ردو قدح کے بعد مختلف قسم کے اچھے اور برے روابط اور مراسم قائم ہونے کے نتیجے میں کچھ اور اور نئے ورثے تیار ہوئے جو گوناگوں تعلقات پر حاوی تھے — جیسے محبت اور عداوت، دوستی اور دشمنی، رشک و حسد، صلح و جنگ، بھروسہ و بدگمانی، منافقت اور ملنساری، رفاقت اور رقابت، وفاداری اور جفاکشی، غرض بزم کی دلگیریوں اور پشیمانیوں اور رزم کی دلآزاریوں اور دلبستگیوں، سب ہی قسم کے انسانی تجربوں اور حالتوں کا ایک پس منظر ابھرا اور کچھ نئے ورثے بنے

ہندوستان کی تاریخ میں دو مختلف عہدوں میں دو بڑے انسانی قافلے یہاں آئے، جن کے کارنامے حیات سماجی اور تہذیب میں گہری طرح پیوست ہوگئے۔ عہدِ عتیق میں انڈو۔آرین قافلہ اور عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے قافلے جو افغانستان، ایران، توران اور ماوراء النہر کے مختلف علاقوں سے اور مختلف قبیلوں پر منقسم آئے۔ جیسے پٹھان، ازبک، تاجک، ترکمان، بلوچ، بخیاری اور غیرہ۔ عہدِ عتیق میں سب سے بڑا اور بااثر قافلہ جو تاریخ کی پہلی کرنوں کے ساتھ یہاں پہنچا۔ وہ تھا آریہ نسل کا، جس کے پیدائشی مسکن کے بارے میں مختلف تاریخی شواہد اور قیاس آرائیاں اور مختلف سماجیاتی نظریے ہیں۔ یورپ کے یخ بستہ بالٹک علاقے سے لے کر، قفقاز کی حسین وادیوں تک ان کے گہوارہ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بعض محققین ان کی اصلی جائے پیدائش درمیانی یورپ خصوصاً ہنگری کے قرب و نواح میں متعین کرتے ہیں۔ آریہ نسل کی کئی شاخیں دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل گئیں۔ ایک ایران میں جا بسی، ایک نے جرمنی کا احاطہ کیا اور دوسری دریائے سندھ کو پار کر کے بھارت ورش میں پھیل گئی۔ یہی انڈو۔آرین Indo-Aryans ہیں۔ جنہوں نے ہم کو رگ وید اور دیگر تین وید دیے — اور ان میں اپنشد کا عالمگیر فلسفۂ حیات و ممات دیا، جس کی وجہ سے ہم مولانا آزاد کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ "دنیا میں وحدت الوجود (pantheism) کے عقیدہ کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے۔" (غبارِ خاطر (مرتبہ: مالک رام) نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۸۳ء ص ۱۲۰) یاد رہے کہ وید مقدس نے ہی ہندوستان کو ہندوستان بنایا۔ اس معنی میں کہ دنیائے علم و تقدس، فلسفہ اور رموزِ حیات میں قدیم انسانی حکمت کا سرچشمہ اسی خزانۂ فکر و ممات سے پھوٹتا اور ہماری تہذیب کے فکر و اخلاقیات کے ادبِ عالیہ Classics کا بھی وہی مخزن رہا۔ اس ملک کا بنیادی اور اکثریتی عقیدہ جس کو عرفِ عام میں آج ہندوازم کہا جاتا ہے، اس کا اہم اثاثہ ویدانت کا ہی نظریۂ عالم ممات اور انسان ہے۔

ہندو مذہب کے بنیادی صحیفوں میں "رامائن" اور "مہابھارت" اور اس میں گیتا" کی تعلیمات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور یہی وہ خزانہائے عرفان و وجدان ہیں جن پر ہماری مسلسل، چار ہزار سالہ پرانی تہذیب اور اس کی قدروں اور مفروضوں کا دارومدار ہے۔

مسلمانوں کے قافلے جنہوں نے عہدِ وسطیٰ میں مختلف اوقات اور مختلف حالات میں سرزمینِ ہند کا رخ کیا، ان کے محرکاتِ سفر و ہجرت محض مذہبی نہیں تھے۔ یہ سمجھنا تاریخ کے واقعات کے مغائر ہوگا کہ یہ قافلے مجاہدانِ دین کے یا غازیانِ اسلام کے تھے۔ کچھ ایسی مہمیں بھی ساحلِ ہند سے ٹکرائیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ حکمرانی اور سلطنت آرائی کے خواب لے کر بھی کچھ قبائل، یہاں فتوحات کی مہم میں سرگرداں رہے، اور اپنے جبر و استبداد اور تلوار کے زور سے پسماندہ طبقوں کو اپنے عقائد کے زمرے میں شامل کر لیا، مگر زیادہ اور مسلسل لہریں ان مسلمانوں کی تھیں جو زرخیز زمین کی تلاش میں یا اپنے فن اور ہنر کی قدردانی کی جستجو میں، کامیاب حکمرانوں کی فوج میں بھرتی کے لیے نئی نئی سلطنتوں میں گوناگوں نوکریوں میں قسمت آزمائی کرتے، مختلف ذرائع معاش اور زندگی کے نئے تجربوں کی آرزو میں یہاں آئے اور ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ غرض مختلف اور متنوع محرکات نے انہیں ہندوستان کی طرف کھینچا اور ایسا کھینچا کہ پھر پشت ہا پشت وہ اسی ملک و وطن میں پروان چڑھے اور مر کر اسی خاک میں دفن ہوگئے۔

ہندوستان میں اسلام پانچ مسلم اقتدار کے مراکز سے آیا — عرب، افغانستان، ایران، توران اور ماوراء النہر۔ سندھ، کچھ، مالابار اور کورومنڈل میں عرب سے مسلمان آئے۔ پنجاب اور گنگا جمنا کے دواب میں، وندھیاچل دکن اور بنگال میں، مختلف قافلے افغانستان، ایران، توران اور ماوراء النہر (یعنی سمرقند، بخارا، خیوا، فرغنہ، بلخ و بدخشاں وغیرہ) سے آئے۔ فقہ کے لحاظ سے ہندوستان میں زیادہ تر حنفی المذہب ہیں، جنوب میں شافعی مذہب کے گروہ ہیں اور فقہ امامیہ کے پابند اہلِ تشیع ملک کے مختلف علاقوں میں کہیں کم اور کہیں زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ مغربی ساحل پر خلیج عرب کے آس پاس تاجر پیشہ مسلم فرقے جیسے خوجہ، جو اسمٰعیلی اثنا عشری ہیں، بوہرے، میمن وغیرہ آباد ہیں۔

مذاہب کے لحاظ سے ہندوستان میں آٹھ مذاہب کے پیرو رہتے ہیں۔

ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، بُدھ مَتی، جین، زرتشتی پارسی اور یہودی۔ ان کے علاوہ مختلف قسم کے بُت پرست اور قبائلی عقیدوں کے گروہ بھی ہیں۔ شاید دنیا کے کسی ملک میں انسانی عقیدوں کی اتنی فراوانی نہیں ہے، جتنی ہندوستان میں۔ ظاہر ہے کہ مذاہب کی اس رنگا رنگی میں متحدہ قومیت کے استحکام اور تقویت کا مسئلہ قدرے پیچیدہ اور مشکل الحل ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد اس سے واقف تھے اور اسی وجہ سے ۱۹۲۰ء کے بعد انہوں نے اپنی پوری توجہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں اس بنیادی تعمیری کام میں لگا دی، اور خصوصاً مسلمانوں کی سیاسی تربیت میں انہوں نے تقریباً نصف صدی کا زمانہ صرف کیا۔

"متحدہ قومیت کی اہمیت اور اس میں مسلمانوں کی ضروری شرکت" وہ عنوانات تھے، جن پر مولانا آزاد نے بہت کچھ لکھا اور اپنی کئی تحریروں میں ان پر روشنی ڈالی۔ اسی طرح جمہوری وفاق نظام کے مضمرات کے بارے میں مولانا آزاد نے مختلف مواقع پر ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

"الہلال" کے ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں مسلمانوں کو عبرت دلاتے ہوئے پُرجلالی انداز سے لکھتے ہیں کہ:

"... یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی بیڑیاں جو اُس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکے گا، جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کرو کہ اُس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اُس میں سات کروڑ مسلمانوں کی نسبت کیا لکھا ہوگا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں ایک سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُمنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی۔"

اس قسم کے دلوں کو ہلا دینے اور دماغوں کو جھنجھوڑنے والے آتش فشاں مضامین انگریز حکومت کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے مولانا کو ۱۹۱۶ء میں کلکتہ اور بنگال سے نکال دیا گیا تھا اور وہ رانچی میں چار سال محصور زندگی گزارتے رہے۔ اسی زمانے میں گاندھی جی نے کئی مرتبہ ان سے ملنے کی کوشش کی مگر انگریز حکومت نے انہیں اجازت نہیں دی اور ان دو قائدین کی ملاقات ۱۹۲۰ء تک ملتوی رہی۔

مولانا آزاد نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے عالمگیر انقلابی تبدیلیوں، مثلاً ترک اور عرب قومی تحریکوں سے یہ بنیادی سبق سیکھا کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہوتی بلکہ قوم کے مختلف عناصر کے امتزاج سے یہ ابھرتی ہے اور ایک نیا سیاسی شعور پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ کر یہ مان لیا کہ قومیت کی اساس مذہب سے ماورا ر سماجی تشخص، علاقائی وحدت (Territorial Unity) اور سیکولر سیاسی تحرکات پر مبنی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ یہ اعتراف خود ان کے لیے بھی نیا تھا۔ کیوں کہ ۱۹۲۰ء تک وہ علیحدہ مسلم حب الوطنی اور عالمگیر اسلامی اخوت کے قائل تھے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں سیکولر علاقہ داری قومیت کا کوئی ذکر اس وقت تک نہیں تھا۔

مولانا نے کل ہند خلافت کانفرنس کو کانپور میں ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندوستان کے موجودہ منظر کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب مشرقی ممالک کے موجودہ تغیرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے جب کہ مشرق کی تبدیلیاں آزادی اور ترقی کی طرف جاری ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ملک قدم اٹھا کر صرف تھک ہی نہیں گیا ہے، بلکہ واپسی کے لیے پیچھے دیکھ رہا ہے۔ ہندوستان کی طرح شام میں بھی مختلف مذاہب اور نسل کی مشترک آبادی ہے، وہاں کے دروزی قبائل Druze عام مسلمان اور مسیحی جماعتیں، مدتوں سے باہم دگر قتل و غارت میں سرگرم رہی ہیں۔ مسلمانوں اور مسیحیوں کے مذہبی اختلافات کے لیے صرف صلیبی لڑائیوں (Crusades) ہی کا افسانہ کافی ہے۔ جس کے آٹھ خونی سیلاب اسی سرزمین میں بہہ بہہ کر خشک ہو چکے ہیں۔ تاہم آج اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان سب کا متحدہ نعرہ ہے: اَلدِّینُ لِلْوَاحِدِ وَالْوَطَنُ لِلْجَمِیْعِ، وطن سب کے لیے ہے اور ہر شخص کا دین اس کے لیے ہے۔ لیکن ہندوستان کا کیا حال ہے؟ یہ ہے کہ اس کی بہترین تعلیمی اور سیاسی پیداوار بھی آج اس حد تک جانے کے لیے تیار نہیں۔ مذہبی منافرت، جماعتی تعصب، فرقہ وارانہ تنگ دلی، اور محکومانہ ذہنیت کے تمام مفاسد ہماری راہ بدستور روکے کھڑے ہیں۔"

مولانا آزاد کی رام گڑھ کانگریس کے سالانہ جلسہ کی مارچ ۱۹۴۰ء کی صدارتی تقریر شاید ان کی آخری جامع تقریر ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے فوائد اور علیحدگی کی سیاست کے مضمرات سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بڑی صفائی سے انہوں نے یہ کہا تھا کہ مسلمان نہ تو معمولی اصطلاح میں اقلیت ہے اور نہ ان کو سیاسی اقلیت ہونے کا بے جا احساس ہونا چاہیے، کیونکہ برٹش انڈیا کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں تو ان کو اکثریت حاصل ہے۔

(اور اگر بلوچستان کو شمار کیا جائے تو پانچ ہیں) انہوں نے انگریز سامراج کی تفرقہ پرور حکمت عملی کا رول واضح کیا اور کہا کہ مستقبل میں جب ہندوستان وفاقی اور جمہوری دستور بنے گا اس میں مختلف اکائیوں (Units) کو خود مختاری (Autonomy) حاصل ہوگی تاکہ وہ اپنے اندرونی معاملوں کو اپنے انداز سے حل کر سکیں۔ بہرحال مولانا آزاد ملک شام کے کامیاب متحدہ قومیت کے تجربے کو پیش نظر رکھ کر یقین رکھتے تھے کہ ہم بھی ہندوستان میں یہی کر سکتے ہیں اگر بالغ النظری اور سیاسی فہم سے کام لیں۔

مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی تعمیر میں مشغول کرنے کے لیے مولانا آزاد نے تاریخ اسلام کے زریں عہد، یعنی عہد نبوی سے اسوۂ حسنہ پر مبنی ایک انوکھا جواز پیش کیا۔ ہجرت کے پہلے ہی سال میں (یعنی ۶۲۲ء) رسول اکرم صلعم نے مدینہ اور اس کے قرب و نواح کی حفاظت، دفاع اور بہبودی کے لیے مہاجرین و انصار مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذہبی گروہوں، جن میں یہودی، نصرانی، صابی (Sabiyans) مانگی (Magiyans) اور بت پرست قبائل بھی شامل تھے، سب کو ملا کر ایک سیاسی گروہ کی شکل دی، تاکہ مخالف قریش مکہ اور دیگر سرکش قبائلیوں کی یلغار سے باشندگان محفوظ رہ سکیں۔ اس انتظام کو باقاعدہ شکل دینے کے لیے، رسول کریم نے ایک قانونی دستاویز خود تیار فرمائی، جس کو تاریخ میں "میثاق مدینہ" یا "عہد نامہ مدینہ" یا "دستور مدینہ" کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس عہد نامہ کی بدولت سماجی اصلاح کے بعض اہم مسائل پر مختلف مذاہب اور عقیدوں کے پیروؤں نے اتفاق کیا، اور اس طرح اپنے اشتراک کو ایک قانونی اور سیاسی شکل دی، مثلاً سب نے اقرار کیا کہ بعض قدیم غیر انسانی رواجات کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ جیسے اس رواج کا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے۔

عرب کا ایک دوسرا عجیب رواج تھا، جس کی رو سے نہ صرف دولت بلکہ فوت ہونے والے مرد کی بیویاں بھی ورثہ میں آتی تھیں۔ اس رواج کو ختم کرکے یہ ترمیم منظور ہوئی کہ صرف دولت ہی ورثہ میں مل سکتی ہے۔ بیویاں نہیں۔ پھر یہ بھی مان لیا گیا کہ اصل پر زیادہ سود لینا ناجائز ہے۔ غلاموں کی رہائی نیک عمل ہے۔ ایک متفقہ عدالت کا قیام بھی عمل میں آیا تاکہ ان میں یگانگت اور مساوات قائم ہو سکے۔ اس عہد نامہ کے دیباچہ میں ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختلف مذاہب اور عقیدوں پر منقسم سیاسی گروہ Multi-religious Political Group کو "امۃ الواحدہ" کہا ہے۔ اس کا ترجمہ بعض مفسرین نے ایک لوگ (One People) بعض نے ایک فرقہ (One Community) اور بعض نے ایک قوم (One nation) کہا ہے۔ مولانا آزاد نے "امۃ الواحدہ" کو ایک قوم ہی قرار دیا ہے۔

یاد رہے کہ تاریخی اعتبار سے، یہ میثاق کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ مسلمانوں اور یہودیوں میں تعلقات خوشگوار قائم نہ رہ سکے، بلکہ اس میثاق کے باوجود اور خلاف ورزی میں مدینہ کے یہودیوں نے مخالف قریش مکہ کے ساتھ سازباز کی، جس کی وجہ سے رسول کریم صلعم کا رویہ ان کی طرف سے بالکل تبدیل ہو گیا اور بالآخر یہودی عرب سے نکال دیے گئے۔ مولانا آزاد ظاہر ہے کہ اس تاریخی واقعہ سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن ان کا مقصد صرف یہ بتلانا تھا کہ رسول اکرم صلعم نے مختلف مذاہب کے متحدہ سیاسی گروہ کو "اُمۃ الواحدہ" قرار دیا تھا، اور یہ کہ ایسا سیاسی اتحاد اسلامی تاریخ میں ممکن تھا، اور اسلامی اصول کے لحاظ سے جائز ہی نہیں بلکہ رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے عین مطابق ہے۔ ان کی سیاسی فہم یہ تھی کہ متحدہ قومیت کے استحکام کے لیے "اُمۃ الواحدہ" کے نظریہ کا اطلاق مناسب اور موزوں ہے۔ مولانا آزاد سے پہلے کسی نے اس نظریہ کی طرف نہ اشارہ کیا نہ اس کی توجیہہ کی۔ یہ انہی کے اجتہاد فکر کا نتیجہ تھا کہ متحدہ اور مشترکہ قومیت کے نظریہ کے لیے ہمیں تاریخ اسلام سے بھی ایک جواز مل سکا، اور یہی ان کا عظیم نظریاتی کارنامہ ہے۔

مولانا آزاد ملک کے معماروں کے ساتھ

(دائیں) مہاتما گاندھی سے صلاح مشورہ کرتے ہوئے
(درمیان) نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں یونیورسٹیز کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن اور وزارتِ تعلیم کے سکریٹری ڈاکٹر تارا چند کے ساتھ۔
۲۴ اگست ۱۹۴۹ء
(نیچے) وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو، نائب وزیرِ اعظم سردار ولبھ بھائی پٹیل، آچاریہ جے۔ بی۔ کرپلانی اور بہار کے گورنر ایم۔ ایس۔ انے کے ساتھ: موقع ــ آل انڈیا کانگریس کا ۵۵ واں اجلاس منعقدہ گاندھی نگر (جے پور) ۱۸ دسمبر ۱۹۴۸ء۔





Regd. No. D (DN) 103 — Licenced U (DN)—50 to post without pre-payment
R.N. 948/57 — NDPSO New Delhi.
Vol. 47 No 4 — Ajkal (Urdu) — NOVEMBER 1988

Published by Dr. S. S. Shashi, Director Publications Division, Patiala House, New Delhi
Printed by the Manager, Govt of India Photolitho Press, Faridabad